Kainat-i-Adab

(Revised & Enlarged)

For

HIGH SCHOOLS

Selected and Edited

By

M. A. HAMEED, "HAMEED"

Editor "NAZZARAH"

And

کائناتِ ادب

(Third Edition)

AUTHOR OF :—

"BEHRE LABAN," "JANGGI KARIMA", "PAIMANA-I-ISHQ"

etc , etc.

PUBLISHED BY :—

Educational Book House,

Civil Lines, ALIGARH.

کاشانۂ ادب

ترمیم شدہ

مؤلفہ

محمد عبدالحمید حمید میرٹھی سابق اڈیٹر "نظارہ" میرٹھ

مصنف

بحرِ تلبیس، جنگی کرشمہ، پیمانۂ عشق وغیرہ وغیرہ



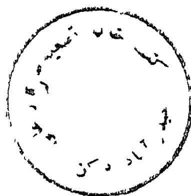
(تیسرا اڈیشن)

پبلشر

ایجوکیشنل بک ہاؤس

بکسیلرز، پبلشرز، اسٹیشنرز

سول لائن — علی گڑھ



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

مقدمہ

معزز ناظرین!

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، بنارس ہندو یونیورسٹی بنارس، میسور یونیورسٹی، پٹنہ یونیورسٹی، مدراس یونیورسٹی، بمبئی یونیورسٹی، ناگپور یونیورسٹی، اندھرا یونیورسٹی، الہ آباد یونیورسٹی وغیرہ وغیرہ نے **کائنات ادب** کی خصوصیات کو خاص توجہ اور قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور اپنے اپنے نصاب تعلیم میں داخل کر کے جس قدر میری حوصلہ افزائی فرمائی ہے اس کے شکریہ کے لئے الفاظ میسر نہیں آتے۔

کائنات ادب کے متعلق ہندوستان کے مستند اہل قلم اور سررشتہ تعلیم کے

مبتہم حضرات نے جس قدر کشادہ دلی اور حسن اخلاق سے اظہار خیالات فرمایا ہے وہ میرے لئے ہر حیثیت سے قابل قدر ہے۔

کائنات ادب کی خصوصیات پر معزز مدیران اخبارات و رسائل نے جس قدر ریویو فرمائے ہیں وہ میرے لئے ہر طرح باعث فخر ہیں۔

آج کل اُردو کا میدان بہت کچھ وسیع ہو گیا ہے، چند سال پہلے اردو کی تعلیم میٹرکولیشن یا ہائی اسکول تک محدود تھی، مگر اب ایم اے تک ضروری سمجھی جاتی ہے اور یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جس قدر زبان وسعت اختیار کر رہی ہے اسی قدر اس کے انتخابات کا معیار بھی بلند ہو رہا ہے، اس لئے یہ امر ضروری خیال کیا گیا کہ **کائنات ادب** میں موجودہ ضروریات کے مطابق ترمیم و تنسیخ کی جائے اور اُردو نصاب تعلیم میں طلبا کے لئے وہ مواد فراہم کیا جائے جو اُن کی ترقی کی رفتار کو بھی بڑھا سکے اور وہ اپنی زبان کی تعلیم میں کسی طرح پیچھے نہ رہیں۔

کائنات ادب کے متعدد مضامین کی عبارات مقفٰی و مسجع تھیں و بعض اشعار بھی ایسے تھے جن کے استعارات و تشبیہات کے سمجھنے میں طلبا کو دشواریاں پیش آتی تھیں اس قسم کے زوائد کو **کائنات ادب** کے **نقش ثانی** میں الگ کر دیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ ایسے مفید مکتوبات کا بھی اضافہ کیا گیا ہے جو ہندوستان کے بہترین اہل قلم کے اسالیب بیان کو ظاہر کرتے ہیں مثلاً مولانا محمد حسین آزاد دہلوی کا خط مولانا ذکاء اللہ دہلوی کے نام، مولانا حافظ نذیر احمد دہلوی کا خط مولانا بشیر الدین کے نام، مولانا ذکاء اللہ دہلوی کا خط مولانا سید حسن نظامی کے نام حضرت اکبر الہ آبادی کا خط مولانا شبلی نعمانی کے نام اور

مولانا شبلی نعمانی کا جواب حضرت اکبر الہ آبادی کے نام

ادبی لحاظ سے یہ مکتوبات بہت دلچسپ اور مفید ہیں۔

پچھلے انتخابات جو میٹرکولیشن یا ہائی اسکول میں بہ سلسلہ درس مروج رہے ہیں وہ اگرچہ وسیع النظر مؤلفین کی قابل قدر جاں کاہیوں کا ایک کامیاب نتیجہ ہیں اور ایک حد تک اُن سے طلبا نے فوائد بھی حاصل کئے ہیں تاہم موجودہ زمانے کی ضروریات کو پیش نظر اُن کو معیار انتخاب پر جانچا جاتا ہے تو وہ بہت ہلکے نظر آتے ہیں۔

اس لئے میں نے کائناتِ ادب کی تالیف و ترتیب میں اس امر کی حتی الامکان کوشش کی ہے کہ یہ جدید کورس ہر حیثیت سے طلبا کے لئے مفید و کار آمد ثابت ہو۔

کائناتِ ادب میں زیادہ تر مضامین انھیں مسلم الثبوت اہل قلم کے لئے گئے ہیں جن کا مرتبہ باعتبار فضل و کمال ممتاز حیثیت رکھتا ہے اور ہر مضمون کو نہ صرف معیار ادبیت پر جانچا گیا ہے بلکہ یہ خیال بھی رکھا گیا ہے کہ اس کا اثر طلبا کی طبائع و اخلاق پر کسی حیثیت سے بھی مضر نہ پڑے، ہر مضمون نگار کے مختصر سوانح حیات کے ساتھ اس کے طرز قلم کا دبی اور امتیازات علمی کے متعلق بھی ایک محققانہ تبصرہ کر دیا گیا ہے تا کہ طلبا اہل قلم کی حالات زندگی کی واقفیت کے ساتھ ان کی خصوصیات سے بھی بے خبر نہ رہیں

علمی مضامین کی طرح مشہور ادیبوں اور انشا پردازوں کے مکتوبات بھی ادب اُردو کا ایک بیش قیمت ذخیرہ ہیں، نصاب تعلیم کا اس گراں بہا اور مفید سرمایہ سے اب تک محروم رہنا تعجب انگیز ہے اور اس کی وجہ صرف یہی معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے مؤلفین یا تو ان کی فراہمی سے عاجز و درماندہ رہے ہیں یا اُن کی نگاہِ انتخاب کا دائرہ ہی تنگ رہا ہے کیوں کہ پچھلے

انتخابات میں حضرت غالب مرحوم کے چند مشہور و مطبوعہ خطوط کے سوا کسی اور اہلِ قلم کے مکتوبات مطلق نظر نہیں آتے،

کائناتِ ادب میں ایسے مکتوبات کافی تعداد میں ملیں گے جو ابھی تک طباعت و اشاعت کے مرہونِ منت نہیں ہوئے ہیں، ان مکتوبات سے ہر اہلِ قلم کے فطرتی مذاق اور صحیح اندازِ تحریر، وسعتِ معلومات، طریقۂ تعلیمات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور ان میں روزمرہ سادگی سلیس محاورے بے تکلف بول چال، غرض ہر قسم کی تحقیق و تدقیق کا عنصرِ لطیف موجود ہے

حضرت غالب مرحوم کے خطوط میں زبان کے چٹخارے مزا دیں گے تو حضرت امیر مرحوم کے پند و نصائح، رموزِ زبان دانی، تعلیم روحانی، تفریحِ طبع کا سامان نظر آئیں گے،

حضرت داغ مرحوم کی شوخیِ تحریر اور طرز ادا بندی دل کو تڑپائے گی تو سر سید مرحوم اور حضرتِ حالی کا قومی سوز و گداز روح کو بے چین کر دے گا۔

مولوی محمد حسین آزاد مرحوم کی سحر نگاری زبان دانی کا لطف پیدا کرے گی تو مولانا ذکاء اللہ مرحوم اور حافظ نذیر احمد مرحوم و مولانا شبلی نعمانی کی طرز ادا نرالی شان دکھائے گی

حضرت اکبر الہ آبادی کے اخلاقی مگر ظریفانہ خیالات سے دل کی آنکھیں روشن ہوں گی تو یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد، جناب سید سجاد حیدر، یلدرم، جناب شوق قدوائی، جناب ریاض خیر آبادی و جناب جلیل مانکپوری وغیرہ وغیرہ حضرات کی سحر نگاری اور قلم کی شوخی آپ سے زبردستی خراجِ تحسین حاصل کرے گی۔

مؤلف نے بڑی تجسس و تلاش کے بعد کائناتِ ادب کے لئے اس قسم کے منتخب مکتوبات فراہم کئے ہیں۔

کائناتِ ادب میں پہلا مضمون (زبانِ اردو کی تاریخ) شمس العلما

مولوی محمد حسین آزاد دہلوی کی وسیع النظری کا بیش بہا نمونہ ہے۔ اس مضمون میں زبان اُردو کی تاریخ
یورپ کا تسلط ملک اور زبان پر، اُردو کی وجہ تسمیہ، زبان ریختہ، نواب زادوں کی گفتگو، محمد شاہی
نثر کا نمونہ، سید انشاء و مرزا مظہر جانجاناں کی گفتگو، اردو تصانیف کی ابتدا، غرض ہر طور پر بحث کی گئی
ہے جس سے طلبا کو زبان اُردو کی ماہیت بخوبی معلوم ہو جائے۔ اگرچہ مولانا آزاد
کا قلم کسی خاص رنگ کا محتاج نہیں مگر آپ نے جس میدان میں قدم رکھا ہے ہمیشہ کامیابی حاصل کی ہے

"سولزیشن یا تہذیب" سرسید مرحوم کا ایک نہایت ہی قابل قدر اور بلند پایہ مضمون
ہے جس میں تہذیب کی طرف انسان کی طبیعت مائل ہونے کے دو بنیادی اصول قرار دیے گئے
ہیں اور ان کے نتائج و عواقب پر نہایت نصیحت آمیز اور موثر پیرایہ میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

مولانا حالی مرحوم نے "زبان گویا" میں زبان کی تشریح مختلف پہلوؤں سے
دکھائی ہے اور حکمت و موعظت کے ایسے لطیف مسائل بیان کئے ہیں جو طلبا کے لیے نصیحت
کا ایک مکمل دفتر ہیں اور ان کے اخلاق پر نہایت اچھا اثر ڈالتے ہیں۔

"کارخانہ قدرت" میں مولوی نذیر احمد صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ [illegible]
کا حصہ تھا، یہ مضمون دہلی کی زبان کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

مولانا شبلی نعمانی نے حضرت انیس کی شاعرانہ خصوصیات اور فصاحت و سلاست
کا جو فوٹو کھینچا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔

"فرہنگ انگریزی الفاظ" میں شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ نے ان الفاظ کی
جو عام طور پر ادب اُردو میں مستعمل ہیں تشریح کی ہے اور ان کا محل صرف اور صحیح مفہوم
نہایت عمدہ طریقہ پر سلیس زبان میں بتایا ہے۔

"اُردو سے ہندوؤں کا تعلق" یہ تاریخی مضمون حضرت شرر لکھنوی جیسے

فاضل کی وسیع النظری و معلومات کاملہ کا نتیجہ ہے جس میں زبان اُردو کی اصلیت اور اس کی وجہ تسمیہ اور اس کی ابتدائی حالت اور اس کا ترقی کرنا وغیرہ وغیرہ بہت عمدگی کے ساتھ دکھایا ہے جس سے طلبا زبان اُردو کے متعلق بہت کچھ واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔

"وسعت خیال" میں حضرت مولانا شوکت مرحوم نے ایک فلسفیانہ اور محققانہ بحث کی ہے۔ معنوی پہلوؤں کے اعتبار سے یہ مضمون دریا بہ کوزہ ہے۔

"سفر بغداد" میں جناب سید سجاد حیدر یلدرم نے حالات سفر (کراچی تا بغداد) کا سچا فوٹو اس دلکش انداز سے کھینچا ہے کہ سبحان اللہ! اور باشندگان بغداد و بصرہ وغیرہ کے طرز معاشرت اور تہذیب و تمدن کے متعلق معلومات کا ایک بیش قیمت ذخیرہ بہم پہونچایا ہے۔

"فروغ ادب" میں سر عبدالقادر نے ادبیت کی شان جس عمدہ اصول اور طریقہ سے دکھائی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

"موازنہ حضرت داغ و امیر" میں مولانا ندرت صاحب نے دکھایا ہے کہ ایک ہی زمین و قافیہ میں ان دونوں مسلم الثبوت استادوں نے کیا کیا کمال دکھائے ہیں اور کس کا پلہ بھاری رہا ہے۔

"حصہ نظم" میں سودا نے قصائد میں بلاغت اور نزاکت کا خاتمہ کر دیا ہے۔ غزلیات میں (وقت کی زبان سے قطع نظر کرکے) باعتبار جوہر کلام جو کچھ کہا ہے سراپا مرصع ہے۔

میر درد نے واردات قلبی سے متاثر ہوکر تصوف میں جو شعر کہا ہے وہ سوز و گداز کا سچا فوٹو ہے۔

میر تقی نے زبان کی سلاست و فصاحت کا جو پہلو دکھایا ہے اس کی نظیر محال کیا ناممکن ہے

سید انشا نے اپنی زور طبع سے وہ جوہر دکھائے ہیں جو اہل ادب سے مخفی نہیں اور یہ وہ کلام ہے جو زبان حال میں زبان قدیم کا جزوی پہلو لئے ہوئے ہے۔

مصحفی نے فن سخن کے قواعد و ضوابط کو لفظ بہ لفظ ادا کیا ہے اور سادگی کے ساتھ جو شعر کہا ہے وہ بے مثل ہے۔

ناسخ نے صائب کی نازک خیالی کو اپنی صنعت میں ترکیب دے کر ایسی بلند پروازی کے ساتھ برتا ہے جو اُن کے لئے باعث فخر ہے۔

ذوق نے سودا کے بعد قصائد میں جو مرتبہ حاصل کیا ہے وہ ارباب فن سے کافی خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔ غزلیات میں نازکی مضامین، صفائی کلام، چستی ترکیب خوبی محاورات کا ہر پہلو قابل داد ہے،

غالب علی کل غالبؔ کے مصداق تھے، فلسفیانہ مضامین و معانی کے بادشاہ تھے اور تمام کلام ان کی بلند پروازی و نازک خیالی کا مخزن ہے، فن سخن میں غالبؔ نے وہ رنگ اختیار کیا ہے کہ ہمارے نارسا ذہن کی رسائی بھی وہاں تک نہیں ہوتی بعض شعر فلسفیانہ رنگ میں اس قدر صاف کہے ہیں جو اپنا جواب نہیں رکھتے۔

مرزا دبیر نے بلاغت اور میر انیس نے فصاحت کے ساتھ مناظر قدرت تلوار کی تعریف، گھوڑے کی تعریف، فوجوں کی آمد، گرمی کی شدت وغیرہ وغیرہ اس رنگ میں دکھائی ہے جو حسن قبول و فیض تاثیر سے لبریز ہے،

مجروحؔ نے خیالات کی نیرنگی اور تخیل کی گوناگونی اس پیمانہ پر دکھائی ہے جو اہل قلم کے

دلوں پر نقش ہے،

امیر مینائی نے مضمون آفرینی، قلبی واردات اور زبان کے وہ نمونے پیش کئے ہیں جو ضرب المثل ہیں۔

داغ اپنے رنگ کے موجد تھے، کلام کی شوخی، طرز بیان کی جدت، خیالات کی برجستگی اُن کے کلام میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

آزاد و حالی کا کلام اخلاق و نصائح، دنیا کی بے ثباتی، نیرنگی زمانہ، انقلابات زندگی کا ایک عبرت آموز نمونہ ہے۔

مولانا شبلی نعمانی کا کلام سوز وگداز کا مرقع ہے۔

اکبر الہ آبادی کا کلام قوم وملک کے لئے ایک دستور العمل ہے، آپ کا طرز تغزل ہمہ تن حکمت و اخلاق پر مبنی ہے۔

چکبست نے مناظر قدرت کو بہت صفائی کے ساتھ دکھایا ہے آپ کے کلام میں حضرت آتش کی جھلک نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر اقبال کا کلام علم ادب، فلسفہ و معانی، اخلاق و تمدن اور تجربے و مشاہدات کا اعلیٰ نمونہ ہے،

جلیل مانکپوری کا کلام حضرت امیر مینائی کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔

مولانا حسرت موہانی کی نازک خیالی وسیع النظری، قلبی تاثرات کے ساتھ اسلیا رنگ جماتی ہے جو زبردستی خراج تحسین حاصل کرتی ہے۔

مولانا نظم طباطبائی کی شان تغزل و متانت ایک عجیب کیفیت رکھتی ہے۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب شاد نے تصوف اور سوز وگداز میں ڈوب کر

جو کچھ کہا ہے بہتر کہا ہے اور جو ادبی خدمت کی ہے وہ اہل قلم پر روشن ہے
کائناتِ ادب میں نیرنگیٔ زمانہ، انقلاباتِ زندگی، دنیا کی بے ثباتی، سچی اور
پاک دردانگیز نواسنجی اور اس کے ساتھ اخلاقی و تمدنی و معاشرتی تعلیم طلبار کے لئے
سونے پر سہاگے کا کام دے گی۔ بڑی تجسس و تلاش اور سعیٔ بلیغ کے ساتھ کائناتِ ادب
کے لئے بہتر سے بہتر مضامین فراہم کئے گئے ہیں جن سے عموماً طلبار کے اخلاق پر بہت
اچھا اثر پڑے گا اور علم ادب اُن کی طبیعت ثانیہ بن جائے گا خصوصاً وہ طلبار جو
پرائیوٹ طور پر امتحان میں شریک ہوتے ہیں کائناتِ ادب ان کے لئے معلم ہدایت ہے
کائناتِ ادب کے دامن پر اگر آپ کو کوئی دھبہ نظر آئے تو یہ محض میری کم نظری
ہے، میں انسان ہوں، سہو و نسیان میری مٹی کا خمیر ہے۔ اس لئے مودبانہ التماس ہے کہ
مجھے اپنے مفید مشوروں سے ممنون کیا جائے اور میری لغزش کی پردہ پوشی کی جائے

اثیم "حمید"

کائناتِ ادب کا تیسرا ایڈیشن

جو ضروری ترمیمات کے ساتھ شایع کیا گیا ہے

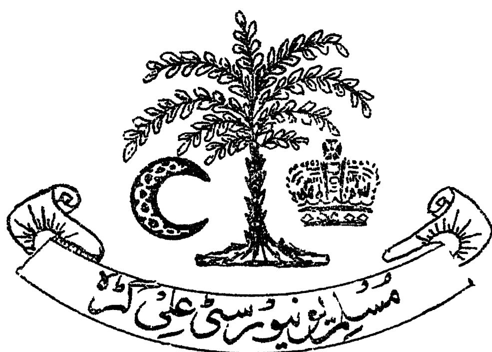
فہرست مضامین

حصۂ نثر

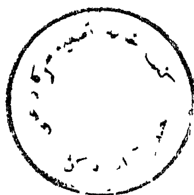
(۴) حصۂ نظم

(۵) سوانح حیات

اہل قلم کی سوانح عمریاں اور ان کی خصوصیات کمالات پر ایک نظر


مسلم یونیورسٹی علی گڑھ


حصہ نثر



ہندوستان کے مشہور انشاپردازوں اور محققین اساتذہ سخن کے دلچسپ اور پُر از معلومات مکتوبات

حضرت امیر احمد صاحب امیر مینائی کا خط

مولوی مظہر الاسلام صاحب کے نام

۲ فروری ۱۹۰۰ء

گرامی شان اقبال نشان محبی مولوی مظہر الاسلام صاحب سلمکم اللہ الواہب۔

سلام مسنون اخلاص و دعا مشحون، رشد و سعادت خمیر تحریریں آپ کی کئی آئیں اور میری طرف سے جواب میں تاخیر ہوئی وجہ تقصیر زیادہ تر یہ کہ رسالۂ عروض و قافیہ کی اصلاح بسبب کم فرصتی و ناطاقتی و رنجوری و معذوری کے نہ ہو سکی آپ کی محنت پر نظر کر کے یہ جی نہیں چاہتا کہ بے اصلاح بھیجدوں۔ اس لئے کہ ایسا جامع مسائل رسالہ بغیر تہذیب و اصلاح کے پیشکش دربار آصفیہ ہونا مناسب نہیں۔ اسی وجہ سے اب بھی یہی ارادہ ہے کہ یک نظر دیکھ جاؤں

تو بھیجوں اور وہ قصیدے جو آپ نے بھیجے تھے اُن پر سرسری نظر میں نے کی تھی وہ بہت
اصلاح کے محتاج ہیں۔ میرے بیتی کے منشی حافظ جلیل سکرٹری دفتر امیر اللغات
رخصت لے کر وطن گئے ہیں وہ قصیدے اُن کے پاس ہونگے، اُن کی غیبت میں مل نہیں
سکتے وہ آئیں تو نکلوا کر دیکھوں۔ مگر میری رائے یہ ہے کہ اگر اُس دربار میں پیش کرنا ہے تو بہت جی لگا کر
شگفتہ قافیوں میں کوئی قصیدہ کہیے اور بہت سے شعر کہکر چھانٹ لیجیے۔ یہ قصیدے جو آپ
نے بھیجے ہیں بہت ہی روکھے ہیں عذوبت ان میں بالکل نہیں۔ اعلیٰ حضرت نظام عالی
مقام خلد اللہ ملکہ خود سخن شناس و سخن فہم و سخن گو اور سخن آفریں ہیں۔ اُن کے دربار کے
لیے مختصر ہی کلام سہی مگر بہت اچھا ہونا چاہیے۔ فصیح الملک داغ سا شاعر شیریں زباں
وہاں موجود ہے ایسے ویسے کلام پر وہاں اُمید قبولیت نہیں یہ باتیں میں نے فرط محبت
سے دوستانہ لکھی ہے بُرا نہ مانیے گا۔ دیوان ناظم کی تاریخ بے شک میں نے جلال کی
فرمائش سے کہی اور کہتے وقت مجھے بالکل یاد نہ آیا کہ اسی دیوان کے واسطے آپ نے
فرمائش کی ورنہ آپ ہی کو بھیجتا۔ تقریظ جو آپ نے اُن کے دیوان کی لکھی ہے وہ
میری اصلاح سے مستغنی ہے۔ مجھے نثر میں مزاولت نہیں اور تاریخ جو آپ نے کہی ہے
اُس میں لفظ بلند مکان محض بضرورت تاریخ ہے۔ دیوان کی تاریخ میں شاعر کی صفت
بلند خیال چاہیے نہ بلند مکان۔ اور بایں ہمہ تکلف بھی بہ اعتبار اعداد تاریخ پوری نہیں
کہ سنہ انتسال سے ایک عدد کا تعمیہ کیا گیا۔ تقریظ ہو یا تاریخ غرض تو اس سے بھی یہی ہوتی
ہے کہ اہل سخن پسند کریں ورنہ اگر بھرتی ہوئی تو اس ہونے سے نہ ہونا اچھا۔ میرے تلامذہ سب
اپنے اپنے حال میں پریشان ہیں مجھے اُمید نہیں کہ تاریخیں کہہ کر بھیجیں حقیقت حال سے
میں نے آپ کو اطلاع دے دی میں آپ کا خالص دوست اور بہی خواہ ہوں ہمیشہ

مجھ کو اپنا داعی خیر تصور کیجئے۔ آپ کی زیر باری اور ناداری سے بہت دل دکھتا ہے مگر سوا
دعا کے چارہ کیا ہے۔ خداوند تعالیٰ آپ کے حال پر بھی رحم فرمائے۔ میں بھی کثرتِ آلامِ روحانی
اور اسقامِ جسمانی سے نہایت سراسیمہ ہو رہا ہوں۔ جن کی تفاصیل لکھ نہیں سکتا۔ دامن گلچیں
آپ کے نام بھی روانہ ہوا تھا۔ معلوم نہیں کہاں تلف ہو گیا۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ آپ کے پاس نہ بھیجا
جاتا۔ اختر تسلیم گزارہیں۔ اس زمانے میں ایسے قوی موقع پیش آئے کہ دامن گلچیں بند ہو گیا۔
اس کے مہتمم کمال منفعل و معذرت خواہ ہیں اور سب اطفال و احباب واجب گزارہیں۔ فقط

فقیر امیر احمد امیر مینائی

فصیح الملک نواب مرزا خاں صاحب داغ دہلوی کے نام

بندہ نواز سلام نیاز

ایک تحریر آپ کی تحریر کے جواب میں بھیج چکا ہوں امید ہے کہ اس کا جواب آتا ہو گا۔ آج
حمید آپ کا ملازم قدیم میرے پاس آیا۔ مجھے اس کے دیکھتے ہی وہ زمانہ یاد آ گیا جب آپ
یہاں تھے اور اس یاد کی لذت میں میں نے اسے گلے لگایا اور اس کی آنکھوں کو (جن سے وہ دس
بارہ دن پیشتر آپ کے جمال جہاں آرا کو دیکھا کرتا تھا) میں نے کمال حسرت کی نگاہ سے دیکھا اور بار بار
آپ کے حالات اور ضبط اوقات کی کیفیات پوچھا اور سنا کیا۔ اثنائے سخن میں معلوم ہوا کہ آپ کے
داماد جن کا نام مجھے اسوقت یاد نہیں ہے انھوں نے قضا کی۔ ان کی جواں مرگی اور اس نو عمر دختر
نیک اختر کی بیوگی کے صدمے نے میرے دل کو چور کر دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔
کے سوا اس داغ کا کوئی مرہم نہیں اس لئے آج وہ نہیں کل ہم نہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو
اور اس بیوہ اور سب اعقاب کو صبر و جزائے صبر عنایت فرمائے اور اس وقت کیا لکھوں۔

بارگاہ ارحم الراحمین میں رحم کی التجا کرتا ہوں اپنے اور آپ کے اور سب عزیزوں دوستوں کے واسطے دعائیں مانگا کرتا ہوں۔ اُس کی رحمت سے اُمید ہے کہ بگڑے کام دین و دنیا کے سب بن جائیں۔ پیارے داغ! افسوس کہ میں نے حمید سے کوئی ساعت آپ کی خدا کی طرف مشغولی کی نہ سنی۔ میں نے حدیث میں دیکھا ہے کہ قیامت کے دن ہر شخص کی عمر کی ساعت فی ساعت ایک خزانے کے طور [illegible] پیش کی جائیں گی [illegible] خزانے کو وہ دیکھنے والا گونا گوں انوار سے لبریز دیکھے گا اور ایسا خوش ہوگا کہ اگر اس خوشی کو دوزخیوں پر تقسیم کرے تو دوزخی عذاب نار سے بے خبر ہو جائیں۔ پھر دوسرے خزانے کا دروازہ کھلے گا اس میں ایسی ظلمات اور عفونت ہوگی کہ اس کو اس سے سخت نفرت ہوگی اور ایسا مغموم ہوگا کہ اگر اس غم کو اہل جنت پر تقسیم کرے تو جنتی لوگ دوزخیوں کی طرح ہاسپینے لگیں۔ پھر ایک تیسرا دروازہ تیسری ساعت عمر کا کھلے گا وہ بالکل خالی ہوگا نہ اس میں نور ہوگا نہ ظلمت نہ خوشبو ہوگی نہ عفونت اس کو دیکھکر اسے نہایت حسرت ہوگی۔ الغرض اس حدیث سے ثابت ہے کہ ہر انسان کی دولت عمر ہے اور عمر کی ہر ساعت ایک خزانہ ساعت طاعت وعبادت وہ خزانہ ہے جس میں انوار نظر آئے اور ساعت معصیت وہ خزانہ ہے جس میں ظلمت اور عفونت کا ذکر ہوا۔ اور جو ساعت عمر طاعت و معصیت دونوں سے خالی تھی اُس کا خزانہ خالی دیکھا گیا۔ جس کے رائگاں ہونے کی حسرت ہمیشہ رہے گی۔ اے میرے اللہ مجھ ناصح بے معنی کو جو خود نصیحت پذیر اور داغ کو نصیحت کر رہا ہے محض اپنے فضل و کرم سے اپنے مرضیات میں کوشش کی توفیق دے اور میرے سب عزیزوں دوستوں کی عمر کا خزانہ کنجینہ اپنے انوار رحمت سے بھر دے آمین۔ پیارے داغ میرے لکھنے کا برا نہ ماننا خوش سلیم کرنے والے تمھارے سیکڑوں ہیں ملامت کرنے والوں میں ایک مجھی کو رہنے دو۔ میرا

خطاب تمہاری طرف ہے مگر درحقیقت اپنے نفس کو ملامت کرتا ہوں بڑھاپے میں کچھ منعم حقیقی کی نعمتوں کا شکر ضرور کرنا چاہیے خلق کے حق میں بھلائی کرنا بڑا عمدہ شکر ہے۔ اس سے بھی قلم، زبان، دل کبھی نہ رکے۔ فرزندانِ فقیر اور جملہ عزیزان و احباب تسلیم گزارہیں۔ فقط

امیر فقیر، یکم اگست ۱۸۹۳ء

شمس العلماء مولانا مولوی محمد حسین صاحب آزاد دہلوی کا خط

شمس العلماء خان بہادر مولوی ذکاء اللہ صاحب کے نام

منشی میاں! کل صبح کو میں بموجب معمول کے ہوا کھانے نکلا۔ شہر کے باہر پہنچا تو دیکھتا ہوں کہ ایک مردِ مقدس متقی وضع۔ پرہیزگار صورت جبہ پہنے ہیں۔ حاجیان عرب کا عمامہ سر پر۔ ہزار دانہ کی تسبیح ہاتھ میں آہستہ آہستہ سڑک پر چلے جاتے ہیں۔ ان کے چہرے کو سفید داڑھی کے نور نے روشن کیا تھا۔ جبہ کے سبز رنگ سے معلوم ہوتا تھا کہ حضرت خضر ہیں مگر عصا کہتا تھا کہ حضرت موسیٰ نکلی ہیں۔ چونکہ بزرگوں کا ادب میری طبیعت میں خدا داد ہے میں نے انھیں سلام کیا۔ انھوں نے نہایت کشادہ پیشانی سے میرا سلام لیا۔ میں نے دیکھا کہ ان کی باوقار آنکھوں سے جو نگاہیں نکلتی ہیں ان سے محبت و شفقت ٹپکتی ہے۔ بے اختیار آگے بڑھا اور مصافحہ کرکے ہاتھوں کو بوسہ دیا چونکہ صبح کے وقت انوارِ الٰہی کا جلوہ پھیلا ہوا تھا۔ دوسرے ان کی صورت اور لباس نے دل پر اثر کیا اپنی بداعمالی اور دنیا کی سیہ کاری کا خیال کرکے ان سے عرض کی کہ مجھ روسیاہ کو

کچھ نصیحت فرماویں جو میرے کام آئے۔
مسکرائے اور اس طرح میری طرف دیکھا کہ میرے دل اور جان کو اپنا معتقد بنا لیا۔ پھر مجھ سے کہا کہ ہم تمہارے حسن عقیدت سے بہت خوش ہوئے وہ آہستہ آہستہ چلے جاتے تھے اور میں نصف قدم اُن سے پیچھے ساتھ ساتھ چلا جاتا تھا چند لمحہ میں نے تامل کیا۔ کیونکہ اُن کی متانت اور وقار مجھے زیادہ بولنے کی اجازت نہ دیتے تھے آخر پھر ہاتھ باندھ کر سوال کی آنکھوں سے اُن کی طرف دیکھا اُنھوں نے فرمایا کہ قلم دوات تمہارے پاس ہے؟ عرض کی کہ نہیں۔ مگر جو کچھ آپ فرمائیں گے بندہ صفحۂ دل پر نقش کرتا جائے گا۔ پھر مسکرائے اور فرمایا کہ اہل دنیا بے وقوف نا اہل ہیں ہم نہ کسی کو اپنا دیدار دیتے ہیں اور نہ کسی سے بات کرتے ہیں مگر اس وقت یہ حسن عقیدت تمہارا ہمیں پسند آیا اس لئے چند فقرے جن سے بہت سی کتابوں کا بلکہ ہزاروں کتب خانوں کا عطر کھنچا ہوا ہے تمہارے سپرد کرتے ہیں انھیں نا اہلوں سے بچانا اور اپنا دستور العمل بنانا کہ یہ ہمارے اسرار ہیں میں نے پھر جھک کر سلام کیا اور آنکھیں بند کر کے اشارہ کیا یعنی بسر و چشم منظور۔ انھوں نے کہا کہ :-

(۱) یاد رکھو کہ دنیا میں دوست تو کوئی ہے ہی نہیں جو زیادہ دوستی برتے اُسی کو دشمن سمجھنا۔

(۲) دشمن سے ایسی دل فریب محبت برتو کہ دوستوں کی دوستی نابود ہو جائے آدمی ہو تو اُلّو بن جائے۔ پھر اگر پورا سلیقہ ہو تو پنجرے میں بند کر کے پر نوچ لو۔ نہیں تو مطلب نکالو اور چھوڑ دو۔

(۳) محبت کو نیکوں کی نیکی پر منحصر نہ رکھو نہ آسے اُن کی نیکی کی مقدار پر

خرچ کرو تم اپنا مطلب دیکھتے رہو جس سے نکلتا ہو اس کو گدھا بناؤ اور جھٹ سوار ہو جاؤ۔

(۴) اس میں پہلے یہ اعتقاد رکھو کہ دنیا میں اچھا تو کوئی نہیں یہ ہم صورت جو آدمیوں کے جامہ میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں . . .

آزاد

شمس العلماء خان بہادر منشی ذکاء اللہ صاحب مرحوم کا خط

جناب سید حسن نظامی صاحب نے اپنے جد امجد سلطان نظام الدین علیہ الرحمۃ کے کشف و کرامات و خرق عادات و محاسن اخلاق میں کسی بات کو فرو گذاشت نہ کیا ہوگا کہ جس کی تحریر کا فخر میں حاصل کروں مگر ہاں میں حضرت کی سب سے بڑی کرامت یہ بیان کرتا ہوں کہ ان کو اپنے ساتھ انسانوں کے گرویدہ کر لینے کا ایسا ملکہ خداداد تھا کہ اپنی حیات میں بے حساب آدمیوں کو اپنا مرید و ملتفت بنایا اور بعد وفات جس پر چھ سو سال کا عرصہ گزر چکا ہے وہی کرامت اُن کے مزار میں موجود ہے کہ وہ مسلمانوں ہی کے دلوں کو گرویدہ نہیں بناتا بلکہ غیر مسلمانوں کے دلوں کو اپنا شیفتہ و والہ کرتا ہے۔

چنانچہ مسٹر سٹارک صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر دہلی جب مزار شریف پر تشریف لائے تو اُن کے دل پر مزار شریف کا یہ اثر ہوا کہ اس کی چھت کو شکستہ و فرسودہ و کہنہ دیکھ کر انھوں نے اپنی گرہ سے تین ہزار روپیہ خرچ کر کے ایسا ہی بنوا دیا جیسا کہ پہلے

بنا ہوا تھا اور خادموں کو منع کر دیا کہ وہ ہمارا نام نہ لیں کہ ہم نے اس کو بنوایا ہے۔

جب سے انگریزی عملداری ہندوستان میں آئی کوئی مثال ایسی نہیں کہ کسی حاکم انگریزی نے کسی ولی اللہ کے مزار کی مرمت اپنے پاس سے خرچ کر کے کرائی ہو۔ یہ حضرت سلطان جی کی کرامت یادگار روزگار رہے گی کہ انھوں نے عیسائی حاکم کی معرفت سے اپنے مزار مقدس کی مرمت کرائی۔

۲۴ مئی ۱۹۰۶ء ذکاء اللہ

شمس العلماء مولانا حافظ ڈاکٹر نذیر احمد خاں دہلوی کا خط

مولوی بشیر الدین احمد صاحب کے نام

میاں بشیر۱؎!

جس وقت سے میں آیا تھا تمھارا اسباب جمع کرنے کی فکر میں تھا چنانچہ اس وقت اسباب صندوق میں بند کرکے اوپر سے ٹاٹ مڑھ کر گیا۲؎ روانہ کرتا ہوں وہاں سے ریل پر روانہ ہو جائے گا۔ اس ایک صندوق میں اتنی کتابیں ہیں اگر آدمی نظر تحقیق سے اُن پر عبور حاصل کرلے تو عالم ہو جائے مگر رکھ چھوڑنے کو کتابیں اور پتھر برابر ہے

۱؎ بشیر الدین احمد مولوی صاحب کے بیٹے کا نام ہے۔ مولوی بشیر الدین احمد صاحب کی بھی کئی ایک تصانیف ہیں ۱۲

۲؎ ایک شہر اور ریلوے اسٹیشن صوبہ بہار و اڑیسہ میں ہے ۱۲

مقدم جماعت کی پڑھائی ہے اس کے یاد کرنے سے جو وقت بچے اس میں دوسرا کام کرنا چاہیئے اس قدر بوجھ اپنے اوپر مت بڑھاؤ کہ جماعت میں برے رہو کیوں کہ ہم سبقوں میں پیچھے رہنا بڑی بے عزتی کی بات ہے۔ بڑا انتظام اس کا ہو کہ انگریزی بول چال اور عبارت انگریزی کے لکھنے میں یعنی انگریزی کمپوزیشن میں ترقی ہو۔ سو امید ہے کہ اس کے لئے تم نے تدبیر مناسب کرلی ہو گی اگر وقت کو انتظام سے صرف کرو اور معمول باندھ کر ہر کام وقت پر کرتے رہو تو بافراغت جماعت کی پڑھائی بھی یاد کر لو گے اور پھر بھی اتنا وقت بچے گا کہ اس میں انگریزی کو بڑھاؤ۔ عربی پڑھو اور اونچی کلاس میں جانے کا حوصلہ کرو۔

نذیر احمد خاں

لسان العصر خان بہادر حضرت اکبر الہ آبادی کا

رقعۂ دعوت

شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کے نام

آتا نہیں مجھ کو قبلہ قبلی
بس صاف یہ ہے کہ بھائی شبلی
تکلیف اٹھاؤ آج کی رات
کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات

اکبر حسین

جواب رقعہ

من جانب شبلی نعمانی

آج دعوت میں آنے کا مجھے بھی ہے ملال — لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں
آپ کی لطف و کرم سے مجھے انکار نہیں — حلقہ در گوش ہوں، ممنون ہوں مشکور ہوں میں
لیکن اب میں وہ نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا — اب تو اللہ کے افضال سے تیمور[1] ہوں میں
دل کے بہلانے کی باتیں ہیں یہ شبلی ورنہ
جیتے جی مردہ ہوں، مرحوم ہوں مغفور ہوں میں

شبلی نعمانی

لسان العصر خان بہادر حضرت اکبر کا خط

جناب حمید میرٹھی ایڈیٹر نظارہ کے نام

الہ آباد ۱۷ نومبر سنہ ۱۹۱۱ء

عزیزی و مکرمی سلمہ اللہ تعالیٰ۔ آج آپ کا ایک خط آیا جس میں آپ نے یونیورسٹی کی نسبت میرا خیال دریافت فرمایا تھا۔ اُن خطوں میں نظم آیا جن کا جواب

[1] مولانا کا پیر زخمی ہوگیا تھا جس کے باعث قطعی چل پھر نہ سکتے تھے۔ اس لیے اپنے آپ کو تیمور کہا ہے (تیمور لنگڑا تھا)

لکھا ہے۔ یاد آتا ہے کہ اس کا جواب لکھ چکا ہوں۔ معلوم نہیں کیوں یہ خطرہ کھا رہ گیا۔ شاید اس وقت ذہن میں یہ تھا کہ اس کے متعلق کچھ اور لکھوں گا۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ اور کیا لکھوں۔ ہاں آپ سے ملاقات ہوتو ایک دلچسپ مکالمت اس کے متعلق ہو سکتی ہے۔ سید صاحب ہی کا ارادہ تھا کہ علی گڑھ کالج یونیورسٹی ہو جائے۔ وہ ارادہ اب پورا ہوگا۔ میرے ذہن میں یہ چار مصرعے آئے تھے ؎

ابتدا کی جناب سید نے — جن کے کالج کا اتنا نام ہوا

انتہا یونیورسٹی پہ ہوئی — قوم کا کام اب تمام ہوا

لیکن میری شاعری کا ضعف تھا کہ اس نظم سے کام پورا ہونے کے معنی نہ پیدا ہوئے بلکہ ایک اور پہلو نکل آیا۔ نئی روشنی کی پبلک سے داد ملنے کی اُمید نہ رہی

آپ کا خیال صحیح ہے کہ پُرانے بزرگ لکیر کے فقیر اور ضرورت زمانہ سے بے خبر ہیں بے شک نئی روشنی کا ساتھ نئی دنیا کو دینا چاہیئے ورنہ کس کے ہوکر رہیں گے اور کدھر جائیں گے۔ اسی بات پر صبر کرنا چاہیئے کہ نئی روشنی میں گو ہر شخص باخبر ہے لیکن اپنی ضرورت سے الفاظ کچھ ہوں مطلب اپنا ہے ؎

دلا دے ہم کو بھی صاحب سے لائلٹی[1] کا پروانہ — قیامت تک رہے سید تیرے آنرکا افسانہ

اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ ؎

بہت مشکل ہی نبھنا مشرق و مغرب کا یارانہ — ادھر حالت فقیرانہ اُدھر سامان شاہانہ

لیکن جن کو یارانہ کا شوق ہے وہ یہی کہتے ہیں ؎

مبارک شیخ کو نانِ جویں کے ساتھ قرآں — ہمیں تو دیر میں پرشاد کھاتا اور بھجن گانا

بعض لوگ یہ معذرت کرتے ہیں اور ان کی معذرت کسی قدر بجا ہے ؎

---

[1] لائلٹی۔ خیر خواہی ۱۲

سفر نہیں ہے ہمیں خانقاہ سیّد سے — قفس میں ہیں تو اس ڈربے کو چھوڑ جائیں کہاں

آپ نے اکثر خطوط میں میرے ناچیز اشعار کی تحسین مبالغے کے ساتھ فرمائی لیکن اس وقت ایک دوست کی تحریر سے معلوم ہوا کہ آپ نے ان سے بھی اس خرافات کی مدح کی۔ اس سبب سے مجھ کو مسرت ہوئی کہ آپ ایسے ذی علم، شائستہ خیال، نقاد سخن تصدیق فرماتے ہیں کہ میں نے وقت نہیں ضائع کیا۔ مجھ کو افسوس ناک واقعات نے قیدی بنا دیا۔ ورنہ باوجود نادرستی مزاج کے اکثر سیر و سفر میں بسر کرتا۔ اُمید کرتا ہوں کہ دسمبر کے دوسرے ہفتے میں دو چار دن لکھنؤ میں بسر کروں۔ خدا کرے اس ارادے کو پورا کر سکوں۔

نیاز مند :- اکبر حسین

حضرت ارشد تھانوی کا خط

حضرت محوی لکھنوی کے نام

بھوپال - ۳۱ مارچ ۱۹۱۳ء

خلیل کعبۂ محبت، عزیز مصر الفت (نہیں نہیں یہ سب متروک انشا پردازی کا ڈھنگ ہے اس لئے محض) ڈیر محوی (نمائشی نہیں بلکہ حقیقی معنی کے لحاظ سے) اگرچہ ع

ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

سلام شوق (یعنی سلام ارشد بصد شوق نہ کہ حضرت شوق کا سلام) مگر اس ترکیب سے تو خط لکھنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ لہذا میں معترضہ جملے حذف کرتا ہوں۔

سُنئے! آپ کا طومار محبت، ارفع النقاب، بھائی ظفر کا افسردگی نامہ یکے بعد دیگرے موصول ہوئے۔ بھائی ظفر کو جواب لکھ دیا۔ نقاب کی رسید یہ عریضہ ہے اور نامہ گرامی کے جواب

کے لئے وقت درکار ہے۔ آپ کی محبت کا سچا نقش میرے دل پر ہے۔ سچ ہے ؎

دل را بدل رہے ست دریں گنبدِ سپہر

بخدا آپ کے نہ ہونے سے مجھے بھی بھوپال میں لطف نہیں آتا۔ اس پر طرّہ یہ کہ میں نے بھوپالی اشخاص کو زمرۂ احباب سے بالکل کاٹ کر دیا۔ جس کا بڑا سبب جناب قیصرؔ کی ذات ستودہ صفات ہے وہ فی الحقیقت پکے بھوپالی ہیں یعنی موسمی دوست ہیں۔

میں نے مولوی ابو الحسن کو فی الحال آپ کا قائم مقام تجویز کیا ہے۔ وہ آپکے ساتھی تھے انھیں کے پاس اکثر چلا جاتا ہوں، گو وہ کبھی مکان پر نہیں ملتے۔ پندرہ چکروں میں فقط ایک مرتبہ ملاقات ہوئی۔ مگر آپ کی محبت اُن کی در تک لے جاتی ہے۔ لیکن وہ ایک مقدس آدمی ہیں۔ اللہ سگِ لیلیٰ کی پھبتی نہ کہدینا۔ اگر خط پڑھتے ہوئے اس فقرے پر ہنسے تو میں ضرور آپ کی طرف سے یہ پھبتی منسوب کر کے خود انھیں سے داد لوں گا۔ یہ خیال نہ فرمایئے گا کہ آپکے تبسم ناز کی مجھے خبر نہ ہو گی۔ شاید آپ کو یاد ہو گا کہ بھوپال سے چلتے وقت ایک چیز میں نے حضور کو پیش کی تھی۔ جسے عرفِ عام میں دل کہتے ہیں۔ جسے شعرا آئینہ سے استعارہ کرتے ہیں۔ اُسی کے ذریعے سے مجھے آپ کی تمام خبریں مل جاتی ہیں اور جو بات ہوتی ہے صاف اس میں نظر آجاتی ہے۔ کیوں، نہ کہو گے کہ پولیس والے عشق میں بھی اپنے فرائض منصبی سے غافل نہیں رہتے۔ ایک مخبر یہاں بھی لگا دیا۔

گلِ رنگیں سنتے ہو مگر آپ نہیں سمجھے۔ وہ تو میں سمجھتا ہوں۔ آپ نے ابتدائی کارڈ کی نسبت لکھا تھا کہ میں نے اس میں ایسا کچھ لکھا تھا۔ اسی مفہوم کے لحاظ سے میں نے عرض کیا تھا کہ پھر سنایئے کیونکہ ؎

ہیں گلِ رنگیں سے بہتر (تم) اگلوں کی گالیاں

ہاں بھائی! ہماری بھاوج کو ہمارا سلام ضرور پہنچا دیا کرو۔ چاہے خط میں ہوا کرے یا نہ ہوا کرے۔ حضور (بروزن طور) سے کبھی کبھی ملاقات ہوتی ہے۔ انجنیئر صاحب کی علالت نے انھیں کبھی بیمار بنا رکھا ہے۔ خانہ زادوں سے بڑھکر دوادوش میں مصروف ہونے کی وجہ شاید یہ ہو کہ سگ حضور ہیں۔ ابھی ابھی میرے ایک دوست کا تار آگیا۔ اُن کو اسٹیشن لینے جاتا ہوں لہذا آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔

مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی اڈیٹر الہلال کا خط ارشاد

مولوی عبدالرزاق صاحب مؤلف البرامکہ کے نام

حضرت مجمع الفضائل مولانا صاحب مدفیوضہٗ

السلام علیکم۔ مزاج شریف، والانامہ ورود ہوا۔ شرف افتخار ہمراہ لایا۔ خادم آپ کی اس عنایت بے غایت کا حد درجہ مشکور وممنوں ہوا کہ اس نالائق پر نظر مشفقانہ فرمائی اور جواب عریضہ سے افتخار اور عزت افزائی بخشی ؎

یہ فقط آپ کی عنایت ہے ورنہ میں کیا مری حقیقت کیا

فی الواقع آپ کی ذات بابرکات مغتنمات روزگار سے ہے۔ اللہ جل شانہٗ آپ کو صدہا سال سلامت رکھے مکروہات زمانہ سے محفوظ ؎ خاموشی از ثنائے تو حدِ ثنائے تست

آپ نے جس اہم کام کا بیڑا اٹھایا ہے فی الواقع نہایت ہی مشکل ہے۔ بلا رو رعایت عرض کرتا ہوں کہ یہ آپ ہی کی ہمت تھی کہ اس پُرخطر میدان میں بہادرانہ قدم رکھا۔ انشاءاللہ آپ کامیاب ہوں گے اور عنقریب آپ کی بے بہا تصنیف سے ملک مستفیض ہوگا۔

حجۃ الاسلام امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی لائف میں نے تھوڑے عرصے سے شروع کر دی ہے
لیکن جیسا کہ آپ نے ارشاد فرمایا ہے واقع میں ایک بڑے سرمایہ کی ضرورت ہے اور وقت کثیر
درکار ہے۔ لیکن السعی منی والاتمام من اللہ کا مقولہ ہر وقت پیش نظر ہے اور اگر اللہ کی مرضی
ہوئی تو اپنے کام میں کامیاب ہوں گا اور ضرور ہوں گا۔ علی گڑھ میں مولانا شبلی نعمانی کا عمدہ
کتب خانہ ہے۔ گزشتہ ایجوکیشنل کانفرنس میں (جو کلکتہ میں جلسہ ہوا تھا) مولانا شبلی صاحب سے نیاز حاصل ہوا تو میں
نے عرض کیا کہ آپ کے مفید کتب خانے سے خادم بھی مستفیض ہونا چاہتا ہے۔ مولانا موصوف نے
فرمایا کہ میں فہرست بھیجوں گا۔ شاید فرصت نہیں ہوئی۔ اس لئے ارسال نہیں کی کل بھی میں نے
شبلی صاحب کے یہاں عریضہ لکھا ہے۔ چونکہ آجکل "رائے ہیروز آف اسلام" سے صلاح الدین ایوبی
کی لائف لکھتے ہیں کم فرصت ہے۔ پٹنہ لائبریری کی بابت جو کچھ آں جناب نے تحریر کیا ہے بجا ہے۔ اس رجب آخر
کو میں پٹنہ جاؤں گا۔ کیونکہ ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ ہے اس لئے وہاں کے کتب خانہ کی بھی سیر
ہو جائے گی اگر تصنیفات غزالی مل گئیں تو دیکھ لی جائیں گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ ابھی صرف احیاء العلوم
وغیرہ پر ایک تفصیلی ریویو کیا گیا ہے اور جو کتابیں دستیاب ہوئیں اُن سے امام صاحب کے حالات
قلم بند کئے ہیں۔ مصر وغیرہ سے کتابوں کے لئے خطوط لکھے ہیں۔ طبقات الشافعیہ تو موجود ہے
آپ ارسال فرمایا کیجئے۔

تاریخ عرب، الفاروق، دربار اکبری، ترجمہ قرآن نظم وغیرہ میں قبل منگا چکا ہوں
سبحان اللہ یہی کتابیں تو ہمارے لئے سرمایہ ناز ہیں اللھم زد فزد
ذرا یہ تحریر فرمایئے کہ آج کل سائنس کی جو کتابیں انگریزی میں لکھی جاتی ہیں ان کے
ترجمے اردو میں بھی ہوتے ہیں اگر یہ سچ ہے تو کہاں ہوتے ہیں۔ تحریر کیجئے گا۔

خادم العلماء۔ غلام محی الدین آزاد۔ کان اللہ لہ

جلیل القدر حضرت جلیل جانشین امیر مینائی استادِ اعلیٰ حضرت سلطانِ دکن خلد اللہ ملکہ کا خط

صفدر علی صفدر کے نام

حیدرآباد دکن۔ ۵؍ رمضان المبارک ۱۳۲۴ھ

دعا پرور محبی صفدر سلمہ اللہ الاکبر سلام سنون، میں ہمراہی وزارت پناہ دو ہفتہ تک شہر سے باہر رہا۔ اس وقت دو محبت نامے آپ کے پیش نظر ہیں اور ایک کارڈ بھی، کارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ نصیبِ دشمناں آپ علیل ہیں۔ کیا مرض ہے؟ اب کیا کیفیت ہے؟ لکھیئے طبیعت کو تعلق ہے۔

اس مصرعہ پر ؎ فخرِ ہندوستان ہے گویا۔ اعتراض صحیح ہے۔ ہندوستان میں نون کا اعلان نہ چاہئیے اس لئے کہ اس کے ساتھ اضافت فارسی کی آگئی ہے یعنی فخرِ ہندوستان، اسی طرح واوِ عطف کے آجانے سے بھی اعلانِ نون ناجائز ہو جاتا ہے۔

اشاعتِ گلدستہ کے متعلق آپ کی دل سوزی اور رائے قابلِ شکر گزاری ہے۔ اس باب میں انشاء اللہ متعقب لکھوں گا۔

سرپرست جن معنوں میں استعمال ہوتا ہے انھیں کو سمجھنا چاہئیے۔ استعمال کا سکہ ایسا رواں ہے کہ اس کو کوئی لغت نہیں روک سکتا۔ سرپرست مربی ہی کے معنی میں استعمال کرنا چاہئیے۔ جناب اختر سلام کہتے ہیں۔

جلیل حسن جلیل عفی اللہ عنہ

حضرت اختر اجے گڈھی کے نام

جناب مکرم و معظم، سلام مسنون، نوازش نامہ آیا، منت پذیر فرمایا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے رسالہ "تذکیر و تانیث" کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اس پر ریویو لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ اس کا جداگانہ شکریہ ادا کرتا ہوں۔

لفظ تہمد کے متعلق جو آپ نے لکھا ہے کہ یہ لفظ تائے فوقانی کے ساتھ تہمت ہے اور مثنوی لذت عشق کے شعر تحریر فرمائے ہیں۔ میری رائے ہے کہ اصل اس کی تہبند ہے۔ کثرتِ استعمال سے زبانوں پر تہمد ہے۔ تہمت کی اصلیت کوئی خیال میں نہیں آتی۔ مثالیں کافی نہیں تاوقتیکہ قافیہ سے ثبوت نہ ہو۔ کاتب والے اپنی رائے سے کچھ کا کچھ لکھ دیا کرتے ہیں۔ تہمد کی مثال اس وقت میری نظر میں نہیں ہے۔ میں آج کل دورانِ سر میں مبتلا ہوں۔ انشاءاللہ مزید تحقیقات سے آپ کو مطلع کروں گا۔ آپ کی ناچاقیِ مزاج سے تشویش ہوئی۔ اللہ تعالےٰ اچھا رکھے۔ خیریتِ مزاج سے مطمئن فرمائیے۔ والسلام

جلیل حسن جلیل کان اللہ لہٗ

شمس العلما مولانا حالی کا خط

مولوی عبدالرزاق مؤلفؒ البرامکہ کے نام

پانی پت کرنال۔ ۱۵ فروری سنہ ۱۹۱۲ء

جناب منشی صاحب مخدوم و مکرم تسلیم، عنایت نامہ مورخہ ۳ فروری سنہ ۱۹۱۲ء پہنچا۔

شکریہ قبول فرمائیے۔ اس بات کے دریافت ہونے سے کمال مسرت ہوئی کہ نواب شاہجہاں بیگم بہادر، ریاست بھوپال نے آپ کی گراں بہا تصنیفات کی رئیسانہ قدر شناسی فرمائی اور تصنیف و تالیف کی خدمت پر آپ کو اپنی ریاست میں جگہ دی ہے۔ چشم بد دور، آج کل ریاست بھوپال اہل کمال کا مرجع اور اسلام اور قوم کی تکیہ گاہ اور پشت پناہ ہے۔ اللہ جل شانہٗ علیا حضرت بیگم صاحبہ بالقابہا اور جناب ولی عہد بہادر اور دیگر صاحبزادگان بلند اقبال کو دیر گاہ سلامت رکھے۔ نظام الملک جیسی عالی درجہ تصنیف پر ریویو لکھنے کے قابل اب میں نہیں رہا۔ قطع نظر اس کے کہ قوائے جسمانی روز بروز مضمحل ہوتے چلے جاتے ہیں دماغ بھی معطل بلکہ مختل ہو گیا ہے۔ خطوں کا جواب مستثنیٰ حالتوں کے سوا ہمیشہ دوسروں سے لکھواتا ہوں۔ جو کچھ لکھا پڑھا تھا سب فراموش ہو گیا۔ میری موجودہ حالت پر مرزا غالب مرحوم کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

دیگر از خویشتنم خبر نبود بر طرف
ایں قدر دانم کہ غالب نام یارے داشتم

بجائے غالب کے حالی پڑھنا چاہیے۔

اُمید ہے کہ آپ عنقریب کسی نامور آدمی کی لائف لکھنی شروع کریں گے۔ شروع کرنے سے پہلے مجھے ہیرو کے نام سے مطلع فرمائیے گا۔ زیادہ نیاز

خاکسار
الطاف حسین حالی

فصیح الملک حضرت داغ مرحوم کے خطوط

حضرت انجم نیشاپوری کے نام

میر صاحب مکرم سلامت۔

داغ کو جلا کر خاک میں ملا کر آپ لکھنؤ چلے گئے۔ خیر صبر و شکر۔ چونکہ یہ بے وفائی اور کج ادائی آپ نے اڑائی ہے۔ ہم بھی سمجھے۔ اے شخص اللہ رے تیرا داغ چلتے وقت ملنا اور اس تمکنت، اس استغنا کے ساتھ۔ رحم نہ آیا ترس نہ کھایا کہ ایک کشتۂ فراق تڑپ رہا ہے اس کی دلجوئی کیجئے یا اس کی تلافی یہ ہوئی کہ لو ہم جاتے ہیں اچھا جاؤ غارت ہو۔ ہر اصبر کر لیں گے۔

وہ قاتل لکھنؤ سے عظیم آباد پہونچا وہاں سے ایک قیامت نامہ میرے نام آیا جس کا مضمون قابل تحریر نہیں۔

جس ساتھ کی میری تصویر سید ناظر حسن کو دی ہے اس کے ساتھ کی چند تصویریں اور مجھ کو عنایت ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جو حال آپ نے دیکھا ہے وہ میری کیفیت کسی اور سے نہ کہنا۔ خدا کے واسطے خاک میں نہ ملا دینا۔ راقم نواب مرزا داغ عفی عنہ ۲۰ اپریل ۱۸۹۱ء

دیگر

بندہ پرور! یہ کس کم بخت کی تمنا ہے کہ ایک شفیق مسافر مہمان کو بلاؤں تو جاؤں اس خاکسار سے یہ گمان بھی غلط۔ اگر پیامی نے بیان کیا تو خدا اسے سمجھے جو اس وقت ہمنشیں ہیں اُن کی زبان پر یہ کلمے بلا شبہ آتے ہیں کہ وہیں رد کر دیا کہ ہم تمہاری چاپلوسی

اور اتحاد سے واقف ہیں۔ ہم خاک پائے احباب بے ریا ہیں۔ البتہ پہلی جو خبر ملی چلے گئے۔ یہ شاید حکمت کی لی ہوگی۔

کئی روز سے آنا چاہتا ہوں۔ وقت ملنے کا پوچھتا ہوں۔ صاف جواب نہیں ملتا۔ آپ ملاقات سے کیوں کنیاتے ہیں بس رقیب نہیں ہوں۔ آپ نے نہ مل کر میرا مزہ خاک میں ملا دیا بلکہ وہ بھی آپ کے شاکی ہو گئے۔ یہ بھی اُن سے معلوم ہوا کہ ایک تصویر اس رُوسیاہ کی اُس نے آپ سے چھین لی۔ آپ کا لکھنا بہت بجا تھا۔ مجھ کو کھو کہ میں آنکھوں سے حاضر ہوں۔ آپ ہرگز نہ تکلیف فرمائیں کہ میرے پاس ہجوم رہتا ہے۔ ایک تازہ شعر لکھتا ہوں ؎

شب ہجراں کے جاگنے والے ۔۔۔ ایسے سوئے کہ کچھ خبر نہ ہوئی

داغ دہلوی

حضرت دلگیر اکبر آبادی اڈیٹر نقاد کا خط

جناب عبد المجید صاحب حمید میرٹھی اڈیٹر نظارہ کے نام

محبی! ہدیہ شرعی آپ کا نوازشی کارڈ اور نظارے کے دو نمبر ملے۔ ممنون توجہات فرمایا۔ بیمار ہوں۔ اس لئے باوصف حسرتِ دید نظارہ کو اب تک نہ دیکھ سکا۔ نقاد کی اشاعت میری علالت کی وجہ سے ملتوی ہے۔ جس وقت شائع ہوگا برابر حاضر خدمت ہوگا۔ نظارہ دیکھنے کے بعد اپنی مختصر رائے دے سکوں گا۔ ابھی اس قابل نہیں۔ دعائے صحت کا طالب ہوں۔ میری حالت حسب ذیل نظم سے ظاہر ہوگی جو مرکے لکھی ہے ؎

ہو خاک شگفتگی کی تدبیر
غنچہ کی طرح سے ہوں میں دلگیر

صد حیف کہاں وہ رنگ تقریر
پریاں ہوتی تھیں جس سے تسخیر

بچ بچ کے مری دعا سے اکثر
چھپ چھپ کے نکل گئی ہے تاثیر

روتا ہوں جو بے کسی پر
خود ہنستی ہے مجھ پہ میری تقدیر

تکلیف مرض جو دمبدم ہے
ہر سانس ہوئی ہے مجھ کو شمشیر

صورت سے مری عیاں ہے حسرت
اک حسرت و یاس کی ہوں تصویر

بن جائے نہ طوق کیوں گریباں
ہے گردش بخت سے گلوگیر

دشوار ہے دو قدم بھی چلنا
وہ ضعف کہ پاؤں میں ہے زنجیر

مضموں اگر نہ لکھ سکوں میں
کم کردہ معاف میری تقصیر

ہے ضعف بہت۔ بقول سعدیؒ
واجب نہیں مجھ کو دینی تعزیر

"رسم است کہ مالکان تحریر
آزاد کنند بندۂ پیر"

دلگیر

لسان الملک حضرت ریاض کا خط

حضرت دلگیر اکبر آبادی ایڈیٹر نقاد کے نام

پیارے دلگیر۔ کل میں لکھنؤ آیا تو آپ کے دو کارڈ ملے۔ میں جب آگرے گیا تھا۔ خوش تھا کہ آپ سے ملوں گا۔ میں اس وقت بھی مردہ تھا جب آپ مجھ سے ملے تھے اب تو بوسیدہ ہڈیوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ البتہ اس اعتبار سے بہت اچھا ہوں۔

ع مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

ہم رہے باغ دبوستاں نہ رہا | اب کہاں جائیں آشیاں نہ رہا
اب جفائے فلک جفا نہ رہی | آسماں اب وہ آسماں نہ رہا
عمر تیری سپہ ہو حسرت مرگ | شکوۂ عمرِ جاوداں نہ رہا

آپ مجھ کو اپنی دلی محبت سے آفتاب سخن بنا کر نمایاں کرنا چاہتے ہیں۔ میں وہ داغ دل ہوں جو کبھی نمایاں ہو نہیں سکتا۔ دعا کیجئے تو قبر سے اپنا یہ مصرع پڑھتا نکلوں مصرع۔ ہم گنہگار بھی اللہ کے پیارے نکلے۔

بہ تعمیل ارشاد ایک غزل بھیجتا ہوں جو داغ کی مشہور زمین ہے۔ اب تک اُسے میں نے چھپائے رکھا تھا۔ اب وہ "نقاد" کے لئے ہے۔ خدا کرے آپ کو اور ناظرین "نقاد" کو پسند آئے۔

ریاض

آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خاں رح کے خطوط

مولوی سید ممتاز علی صاحب کے نام

مجتبی شفیقی۔ آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ میرا خط آپ تک نہیں پہنچا۔ میں نے ایک مفصل خط آپ کو لکھا ہے۔ جو خیالات آپ کے دل میں گزرے ہیں وہ سب غلط ہیں۔ میں اپنے دوستوں کا جاں نثار و خاک پا ہوں۔ قصور کیسا۔ معافی کیسی۔ آزردگی کیسی۔ ایسے خیالات کبھی میری طرف وہماً بھی نہ فرمائیے۔ مولوی سمیع اللہ خاں مع اپنے صاحبزادے کے اپریل میں ولایت جائیں گے۔ نہایت خوشی ہو۔ کہ آپ بھی ساتھ جاویں۔ مگر قبل از روانگی اپنے تئیں انڈین سول سروس میں منتخب کرانا یہ بات کچھ مشکل نہیں ہے۔ جس طرح پر ہو۔ تم مجھ سے ملو۔ میں شروع دسمبر میں کلکتہ

چلا جاؤں گا۔ اخیر دسمبر کی تعطیل میں تم بھی کلکتہ چلے آؤ۔ میرے پاس رہو۔ سب طرح آسائش اور میرے دل کو راحت ہوگی۔ طمانیت سے سب باتیں حاصل ہوں گی۔ مسودہ درخواست مرتب ہو جائیگا اور سب تدبیریں بتا دوں گا۔ کلکتہ آنا کچھ مشکل نہیں ہے سیر بھی کر دگے۔ ملاقات بھی ہوگی۔ دل خوش ہوگا۔ کیا امر تم کو کلکتہ آنے کو مانع ہے۔ میں تم کو اپنا عزیز سمجھتا ہوں۔ جو بات ہو۔ مجھ کو لکھو۔ اگر کلکتہ آنے میں کسی امر کی ضرورت ہو مجھے لکھو میں اس کا انجام کروں گا۔ تمھاری عمر اسوقت ایسی ہے۔ کہ انڈین سول سروس کی ابھی تدبیر ہو سکتی ہے۔ چند روز بعد تدبیر ہاتھ سے جاتی رہے گی۔ والسلام۔

خاکسار۔ سید احمد علی گڑھ ۱۶ نومبر ۱۸۷۸ء

عزیزی محبی۔ تمھارے تین خط پہنچے۔ پہلا خط جو شکریے کا تھا۔ اس کی کچھ ضرورت نہ تھی مجھ کو تم سے دلی محبت ہے۔ اور ہر طرح ترقی کا خواہاں ہوں۔

پچھلے دو خطوں کو پڑھ کر افسوس ہوا۔ ولایت جا کر تعلیم حاصل کر کے ہندوستان میں وجہ معاش حاصل کرنے کے (جو بغیر ولایت جائے حاصل نہیں ہو سکتی) صرف تین کام ہیں۔ بیرسٹری۔ انجنیری۔ ڈاکٹری۔ اول کام تم بھی ناپسند کرتے ہو۔ اور میں بھی پسند نہیں کر سکتا۔ صرف بیرسٹری کے بعد دو امر کی ضرور امید ہے۔ ایک یہ کہ بذریعہ بیرسٹری گو وہ کیسی ہی کم ہو۔ تین چار سو روپیہ مہینہ ضرور ملے گا۔ اور اس سے زیادہ ترقی ہو جانی تقدیری بات ہے۔ دوسری یہ کہ بعد واپسی ہندوستان کوئی ابتدائی عہدہ عدالت کا ضرور مل سکے گا۔ اور اسی سلسلہ میں جلد ترقی کرنے کا موقع ملے گا۔ اور ہندوستان کے امتحانوں سے نجات ملے گی۔ بارسٹری میں اس سے زیادہ توقع نہیں ہے۔

انجینری میں داخل ہونے کو ان وجوہات سے جو آپ نے لکھی ہیں۔ بلاشبہ نہایت مشکل اور نہایت دقت ہے۔ ڈاکٹری میں بھی وہ دقت پیش آوے گی۔ معہذا ڈاکٹری اس لئے زیادہ نامناسب ہے۔ کہ ہندوستانیوں کو سول سرجن کا عہدہ ملنا انگریز اور لیڈیاں پسند نہیں کرتیں۔ اور اس لئے ہندوستانی فوجی ڈاکٹری پر پھینک دئیے جاتے ہیں۔ پس درحقیقت تمہارے لئے کوئی ایسا موقع نہیں ہے کہ بعد واپسی ولایت سے ایسا عہدہ پاسکو۔ جو یہاں کی تعلیم سے حاصل نہ ہو سکتا ہو۔ پس آپ کا ولایت جانا دو امر کی توقع پر ہو سکتا ہے۔ اول بارسٹری کے لئے جس سے ان فوائد کے سوا جو اوپر مذکور ہوئے۔ اور کسی بات کی توقع نہیں۔ شاید یہ ہو۔ کہ عدالت ابتدائی عہدے ملنے میں ولایت کی تعلیم کے سبب کچھ آسانی ہو۔ دوسرے بغرض عمدہ تعلیم حاصل کرنے کے اس میں کچھ شک نہیں کہ انگریزی میں عمدہ تعلیم ہندوستان میں حاصل ہونی ناممکن ہے۔ اور ولایت میں جو عمدہ انگریزی تعلیم حاصل ہو جاوے گی۔ وہ لازوال دولت ہے۔ اور ولایت سے واپس آنے کے بعد اسی تعلیم کے ذریعہ سے چار پانچ سو روپیہ ماہواری ہر صورت سے کما سکتے ہو۔

تمام حالات پر غور کرنے کے بعد میری رائے یہ ہے۔ کہ اگر تم چار برس کے لئے بھی ولایت جا سکتے ہو۔ تو جاؤ فی الفور جاتے ہی کسی یونیورسٹی میں داخل ہو جاؤ اور لٹریچر کی شاخ اختیار کرو۔ برس روز تک کسی چیز کا بجز محنت کے ترقی تعلیم پر خیال مت کرو۔ برس روز کے بعد" لنکن ان" میں بارسٹری کے لئے داخل ہو جاؤ تعلیم بدستور یونیورسٹی میں جاری رکھو۔ اور صرف لکچر کے زمانے میں "لنکن ان" میں آکر لکچر سن جایا کرو۔ دو برس بعد امتحان دینا ہوگا۔ چند روز پہلے امتحان کے لئے

اپنے تئیں تیار کرلو۔ اور اگر لنکن ان ،، میں یہ قاعدہ اب بھی ہو کہ جو شخص تین برس تک لکچر سنے۔ اسکو امتحان کی ضرورت نہیں ہے۔ تو امتحان کا خیال بھی مت کرو۔ تین برس تک یا یہ لکچر سنے جاؤ۔ اور یونیورسٹی کی تعلیم میں اس قدر محنت کرو کہ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرلاؤ۔ یہ دولت ایسی ہوگی جس سے مسلمانوں کو تمہاری ذات پر فخر ہوگا۔ اور ہمیشہ کو تمہاری ذاتی اور دلی خوشی کا باعث ہوگا اور اگر یہ امور تمہاری دانست میں اور تمہارے والد ماجد کی دانست میں کافی معاوضہ ولایت جانے کا اور چار برس تک صعوبات سفر اختیار کرنے کا اور سب سے زائد روپیہ خرچ ہونے کا نہ ہوں۔ تو ارادہ موقوف کرو۔ تن بہ تقدیر یہاں تعلیم میں کوشش کرو۔ تم کو انگریزی لٹریچر میں ترقی کی بہت حاجت ہے۔ اور اس پر بہت زیادہ کوشش درکار ہوگی۔ والسلام

خاکسار تمہارا خیر طلب سید احمد ۲۳ فروری ۱۸۸۰ء

مولانا سید سجاد حیدر صاحب بی۔ اے یلدرم کا خط

حضرت دلگیر کے نام

..... میرے پاس نومبر کا "نقاد" نہیں پہنچا۔ نہ معلوم آپ نے اس میں کیا تحریر فرمایا ہے؟ صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ مرا ہوا تو ہوں ہی مگر اس موت کے تشہیر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ خواہ مخواہ عزیزوں اور احباب میں کھلبلی پڑگئی۔ میرے پاس اور خطوط بھی ایسے آرہے ہیں۔ از راہ کرم "نقاد" کا وہ نمبر جس میں مار ڈالا گیا ہوں۔ میرے دیکھنے کیلئے بھیج دیجئے۔ میں بھی تو دیکھوں کہ پس مردن میری گل کے ساغر بنائے گئے ہیں یا خاک گئی

سجاد حیدر

حضرت سلطان احمد صاحب لکھنوی کا خط

صفدر علی صاحب صفدر کے نام

بنارس۔ عدالتِ ججی۔ ۱۸۔ اکتوبر ۱۸۹۳ء

حضرت سخنور صفدر۔ آپ کا نوازشی کارڈ ملا۔ بے حد خوشی ہوئی۔ بارش کا حال آپ کیا پوچھتے ہیں۔ ایشیائی معشوقوں کی کمر ہو گئی۔

بھائی قحط نے تو وہ نادر شاہی مچا دی کہ توبہ ہی بھلی۔ پرانے میاں بی بی آسمان زمین تک لڑ گئے۔ زمین کی صورت تو دیکھی نہیں جاتی۔ اس کا حال تو معلوم ہے ننگی بھوکی پھرتی ہے نہ سر پر آب رواں کی چادر ہے۔ نہ جڑاؤ پتے۔ نہ سبزہ۔ نہ بالیاں۔ خدا ہی پردہ رکھے "آسمان"، خدا وہاں نہ لے جائے کچا چٹھا یہاں سے معلوم نہیں ہو سکتا۔

اب اتوار کا حال کیا پوچھتے ہو ؎

اب نہ وہ دن ہیں اور نہ وہ راتیں رہ گئیں یادگار وہ باتیں

ابھی بہت جی گھبراتا ہے۔ مکان اب تک نہیں ملا۔ بہت خراب مکان ملا ہے جس میں سخت تکلیف ہوتی ہے۔ جونپور کہاں جاؤ گے نہیں چلے آؤ۔ آدمی کچا پکا کھانا پکانیوالا مل گیا ہے۔ یہی شکر ہے۔ بڑی تعطیل قریب ہے۔ مگر یہ شک ہے کہ مجھے جانے کی اجازت ملے شکر کرتا ہوں اور یہ شعر پڑھتا ہوں ؎

دام سے چھوٹے تو مجلس میں رہے جب رہے صیاد کے بس میں رہے

شطرنجی یا بساطی یہاں بہت ہیں مگر وہ بات کہاں۔ بھائی خدا کے واسطے لکھو۔ ہمارے خواجے کہاں ہیں۔ کوئی خط نہیں آیا۔ میرے خط کا جواب نہیں آیا منی آرڈر کی رسید ہیر

آئی۔ اگر ملیں تو بہت ہی شکایت سے سلام۔ باقی کا ایک کارڈ لاجواب آیا تھا۔ جواب کیا ہو سکتا تھا۔ قلم کے پیر میں برساتی ہو گئی ہے۔ لکھا نہیں جاتا۔ کفایت حسین۔ محبت حسین اصغر صاحب کو سلام۔ باقی کو سلام باقی رہنے دیجئے۔ ممنونِ احسان ۔ سلطان

سحر البیان حضرت شوق قدوائی مصنف ترانہ شوق وغیرہ کا خط صفدر علی صاحب صفدر کے نام

رام پور اسٹیٹ ۔ ۱۹ ر جنوری سنہ ۱۹۱۳ء

کرم فرمائے بندہ حضرت صفدر صاحب۔ سلام شوق۔ آپ نے خط میں دہلی اور لکھنؤ کے اختلاف زبان کی نسبت ایک فقرہ لکھا ہے۔ میرا مسلک اس بارے میں صلح کل کا ہے۔ دونوں شہروں میں کچھ الفاظ ایسے ضرور ہیں جن کے تذکیر و تانیث میں اختلاف ہے اور کچھ محاورے ایسے بھی ہیں جو ایک جگہ بولے جاتے ہیں اور دوسری جگہ نہیں بولے جاتے۔ بعض ناواقفوں نے جانبین سے معاندانہ بحثوں کو چھیڑ کے باہمی کشمکش پیدا کر دی۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک مقام کے مقلد نے دوسرے مقام کی غلط زبان لکھ کے اس پر ترجیح کر دی یہ سب باتیں فضول جھگڑے کی ہیں۔ وہ خاص الفاظ جو مقامی ہیں۔ انھیں ہر شہر کے مقلد کو اسی طرح کہنا چاہیے جس طرح وہاں بولتے ہوں۔ اس کے خلاف کہنے سے بڑا خبط پڑ جائیگا مثلاً ایک شخص دہلی کی تقلید میں غور کو مونث اور فکر کو مذکر کہے اور پھر وہی شخص لکھنؤ کی تقلید میں غور کو مذکر اور فکر کو مونث کہہ جائے۔ تو ایک ہی شخص کے کلام میں دو بولیاں پیدا ہو نگی اور اس کا کلام اس کے شہر کی بول چال کے واسطے قابل سند نہ رہیگا۔ کہ ایسے

الفاظ کے سوا لطیف محاوروں و مثلوں میں ضد کرنا اردو کو بیجا کشمکش میں ڈالنا ہے نہ تو دہلی کوئی گنواروں کا شہر ہے نہ لکھنؤ، دونوں شہر اردو کے سرتاج ہیں۔

آپ دیکھئے کہ اردو ان دونوں شہروں کی زنجیروں سے اپنے پاؤں نکال رہی ہے۔ اگر تقلید سے نہ چھوٹے گی پیش بینی تو اس بات کی مقتضی تھی کہ دونوں شہروں کے فصحا باہم اتفاق قائم کر کے زبان کو سنبھالنے پر تیار ہوں تاکہ اہل ملک کشاکش میں پڑ کے کوئی اور راستہ ڈھونڈھیں لیکن ناعاقبت اندیشی سے جنگ کی تدبیریں کی جاتی ہیں۔

آپ دیکھئے کہ لکھنؤ میں عربی لفظ کے واحد مؤنث کی جمع کو تذکیر کے ساتھ اب بھی لوگ بولتے اور لکھتے ہیں۔ صرف پچھلے لوگوں میں ایک شیخ فضل احمد کیف لکھنوی نے جمع کو بھی ایک جگہ مؤنث کہا ہے۔ چونکہ زبان جمع کی تانیث سے صرف و نحو میں سیدھی ہوئی جاتی ہے اور سوا لکھنؤ کے اکثر حصوں نے تانیث ہی کو اختیار کر لیا ہے۔ لہذا میں نے بے تامل تانیث کو اختیار کر لیا یہاں تک کہ بعض نظموں کے قافیوں میں تانیث کھول بھی دی تاکہ شک نہ رہ جائے۔

احمد علی شوق۔ قدوائی

ہز ایکسیلنسی راجہ راجایان راجہ سر مہاراجہ کشن پرشاد یمین السلطنت بہادر جی۔سی۔آئی۔ای المتخلص شاد کا خط

حضرت شاکر ایڈیٹر "العصر" کے نام

حیدرآباد دکن ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۳۲ھ ۱۳ فروری ۱۹۲۳ف

بخدمت منشی پیارے لال صاحب شاکر۔ "اکسیر سخن" ملاحظہ سے گزری۔ آپ کی

جدت پسندی، نغمہ سنجی، خیال آرائی کی داد دیتا ہوں

شعرائے سنسکرت میں مہاکوی کالیداس کو میں اس لئے اور شعراء پر ترجیح دیتا ہوں کہ جہاں کہیں اسے موقع ملا ہے اس نے قدرتی مناظر کی دلفریبیوں کی ایسی جیتی جاگتی دلکش تصویریں کھینچ دی ہیں کہ بھلائے سے بھی نہیں بھول سکتیں۔ اس نے اپنے شاعرانہ جذبات کے ایک ایک شعر میں قوتِ متخیلہ کا ایسا وسیع میدان کھول دیا ہے جو نہایت پُرلطف نظاروں سے بھرا ہوا ہے۔ اگر اس امر پر غور کیا جائے کہ کالیداس نے ہر حسینہ کی تعریف کیسی خوبی سے کی گو اپنے طور پر ہر ایک بے نظیر ہے اگر ایک کا مقابلہ دوسری سے کیا جائے تو ایک قسم کا خوشگوار اختلاف محسوس ہوتا ہے اور درحقیقت یہی اس کا کمال ہے۔ کیونکہ یہ کس قدر مشکل امر ہے کہ باوجودے کہ ہر ایک کو بطورِ خود منتہائے حسن پر پہنچا دیا ہے۔ لیکن پھر بھی اس کے معیارِ حسن کو ترقی دے دی ہے۔ دوسرا کمال اس کا یہ ہے کہ خواہ اس نے اجمال سے کام لیا ہے خواہ تفصیل سے، خواہ تشریح سے، خواہ تشبیہ سے، لیکن ہر صورت میں جو کچھ بھی حوالۂ قلم کیا ہے، بعینہٖ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا حُسنِ مجسم کی تصویر عالمِ مثال سے لاکر شہود میں رکھ دی ہے۔

آپ نے ایسے قادر الکلام شاعر کی منظری تصویر میں اپنی زبان کی لطافت کا ایسا خوش نما رنگ بھرا ہے کہ لائقِ ستائش ہے۔ سنسکرت کے پیچیدہ اور عمیق جذبات کو نظم کرنے اور سلاستِ زبان کو ملحوظ رکھنے میں کامیاب ہونا آسان نہیں ہے۔

شاد

جناب ظفر الملک صاحب ایڈیٹر "الناظر" کا خط

حضرتِ عزیزؔ لکھنوی کے نام

دفتر "الناظر" فلاورلز لکھنؤ ۴؍ دسمبر ۱۹۲۲ء

مکرمی تسلیم۔ دسمبر نمبر میں شہیدِ مقدس کا حیرت انگیز نظارہ درج کر دیا گیا ہے۔ ملاحظہ عالی سے گزرے گا۔ میں نے آپ سے کئی ملاقاتوں میں یہ ظاہر کیا تھا کہ "الناظر" کے سے علمی رسالہ کی اشاعت آپ ہی لوگوں کا کام تھا جو خاص لکھنؤ کے باشندے اور زبان کے ماہر ہیں۔ ہم دیہاتی لوگ کھیتی باڑی کے کام کے اچھے ہوتے ہیں اور اپنے کام میں اہل شہر کی مداخلت گوارا نہیں کرتے۔ پھر آپ لوگوں کے جو کام ہیں اُن کی طرف آپ کی بے توجہی کیا معنی رکھتی ہے۔ جو لوگ اپنے فرائض زندگی اور ان کاموں کی اہمیت سے ناواقف ہیں جیسے ہمارے شہر کے بھولے بھالے نواب زادے اور شہزادے۔ اگر وہ اس قسم کی غفلت کریں تو کچھ شکایت نہ ہو۔ لیکن آپ حضرات جو ملک کے خیالات میں انقلاب پیدا کرنے کی قوت رکھتے ہیں اور ضروریات زمانہ سے پورے واقف ہیں۔ کسی طرح اس الزام سے بری نہیں کئے جا سکتے کہ آپ کی بے التفاتی اور پہلوتہی سے اُردو علم ادب کو جو منافع حاصل کرنے چاہئیں تھے وہ نہیں پہنچے میں نے الناظر کے اجرا کی ضرورت کو پہلے نمبر میں ظاہر کرتے ہوئے حسب ذیل سطور لکھی تھیں صوبہ اودھ کی تمام تحریکوں کے مرکز لکھنؤ کی زبان اُردو سے جو نسبت قدیم سے ہے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اور جس قدر کوششیں ساکنان شہر لکھنؤ نے اُردو زبان کو

وسیع کرنے ترقی دینے۔ پاکیزہ بنانے اور شستہ بولنے میں کی ہیں وہ ارباب سخن سے پوشیدہ نہیں۔ صاحب اختر شاہنشاہی کی تحقیق کے مطابق الحاق اودھ کے بعد سے ۱۸۸۸ء تک تقریباً تینتیس اخبار اور پچپن رسالے اور گلدستے خاص لکھنؤ سے اُردو زبان کی خدمت گزاری کے لئے جاری ہوئے اور اس بیس سال میں اگرچہ ہماری رفتار ترقی ویسی تیز نہیں رہی پھر بھی متعدد اخبار، رسالے اور گلدستے مختلف مقاصد کے لئے جاری ہوئے اور گو ان تمام اخبارات۔ رسائل اور گلدستوں کو۔ زمانہ کی نا قدری اور پبلک کی بے توجہی کی شکایت کم و بیش رہی اور بہتیرے بے قدری اور بے اعتنائی کی بادِ مخالف کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر قبل از وقت موت کا شکار ہو گئے لیکن انمیں سے بعضے جواب تک اپنے چشمۂ فیض سے ملکی لٹریچر کی کیاریوں کی آبیاری کر رہے ہیں، اُردو زبان کے حق میں نہایت مفید ثابت ہوئے ہیں۔"

اگرچہ تمام کوششوں میں جو اُردو کی بہی خواہی میں کی گئیں۔ ہم اور ہمارے صوبہ کے لوگ معقول حصہ لیتے رہے لیکن تعلیم کی کمی اور اس صوبہ کے باشندوں کی آرام طلبی کی بدولت ہمارے سروں پر ایک بڑا فرض باقی رہ گیا ہے یعنی اُردو لٹریچر کو علمی اور سائنٹفک خیالات کے اظہار کا آلہ بناتے۔ قدرت کی گوناگوں نیرنگیوں کی تصویروں اور نقشوں سے اُسے مالا مال کرتے تہذیب و اخلاق۔ تمدن و معاشرت کے اعلیٰ مسائل کو اس کے ذریعہ سے رواج دیتے۔ غیر ملکوں کے لٹریچر۔ آداب معاشرت۔ تاریخ و جغرافیہ اور وہاں کے باشندوں کے عادات و خصائل کے مرقعوں کی اس میں اشاعت کرتے اور اس کیلئے دُنیا کی قدیم و جدید زبانوں کے بیش بہا معدنیات سے علوم و فنون کے جواہر تحقیق و تلاش کے پُر صدف سمندروں سے دُور ہائے مضامین لانے میں ہماری کوشش

اتنی وسیع۔ نمایاں اور مفید نہیں ہوتیں جتنی اس مناسبت کے لحاظ سے ہونا چاہیئے تھیں جو ساکنانِ لکھنؤ اور صوبہ اودھ کے باشندوں کو اردو سے ہے۔

اس فرض کے ادا نہ کرسکنے کا الزام اگرچہ ایک حد تک صوبہ کے اہل قلم حضرات اور ایڈیٹرانِ اخبار و رسائل پر عائد ہوتا ہے۔ لیکن اس میں ذرا شک نہیں کہ اہل صوبہ کی بد مذاقی اور علوم و فنون کی سرپرستی نہ کرنے کی قابل ملامت و اصلاح عادت اس اہم فرض کے پورا نہ ہونے کی زیادہ تر ذمے دار ہے۔

غضب خدا کا خطۂ زریں اودھ کے دار الخلافہ میں جہاں آتشؔ و ناسخؔ و دبیرؔ و میرؔ و حسنؔ و نسیمؔ ایسے باکمال شعرائے اردو نے اپنے زمانہ میں دادِ سخن دی ہو۔ جسے فخر الشعرائے دہلی میرزا غالبؔ نے "مردمِ چشمِ جہاں" کے پرمعنی لقب سے یاد کیا ہو۔ اور اس گئی گذری حالت میں بھی رئیسوں۔ امیروں۔ نوابوں اور تعلقہ داروں کا مسکن و قیام گاہ ہو۔ وہاں اہل صوبہ کی بد مذاقی اور ناقدردانی کی بدولت ایک بھی رسالہ ایسا نہ ہو جو بنگال۔ پنجاب۔ مغربی شمالی ممالک متوسط اور دکن کے معمولی سے معمولی رسالوں کے مقابلہ میں بھی اردو علم ادب کے دسترخوان پر علوم و فنون تہذیب و اخلاق اور تمدن و معاشرت کے لذیذ اور مفید کھانے چن سکے۔

باوجودے کہ ملک بھر میں تنازعہ کی برقی قوت نے وہ ہل چل ڈال دی ہے کہ ہر صوبہ کے لوگ شاہراہ ترقی پر صبر و استقلال کے ہتھیار لئے ہوئے علم و عمل کے مضبوط اور تیز رو گھوڑوں پر سوار چلے جا رہے ہیں لیکن یہاں یہ عالم ہے کہ ؏

چلتے ہیں اس طرح کہ قدم کا نشاں نہیں

"الناظر" کی اشاعت سے میرا یہ مقصد تھا کہ لکھنؤ میں اس کی عزت و وقعت اور

گذشتہ عظمت کے مناسب ایک علمی رسالہ قائم ہو جائے جو ایک طرف تو اردو زبان کو وسعت اور ترقی دے سکے اور دوسری طرف لکھنؤ اور اس کے صوبہ کے سر سے جہالتِ عامہ مراسمِ قبیحہ اور اخلاقِ ذمیمہ کی مصیبتیں دور کر کے اہلِ لکھنؤ اور اودھ کو ترقی یافتہ اور سرسبز و شاداب شہروں اور صوبوں کے لوگوں میں ممتاز بنائے۔

یہ کام اکیلا "الناظر" یا میں نہیں کر سکتا لیکن اگر لکھنؤ کے روشن خیال حضرات پوری توجہ کریں تو بہت کچھ کامیابی ہو سکتی ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ ہمارے تمام مقاصد حاصل ہو جائیں۔

اس خامہ فرسائی سے میری اصلی غرض یہ ہے کہ آپ حضرات "الناظر" کی طرف اپنی خاص توجہ فرما کے اس صوبہ کا وقار قائم رکھیں۔

خادم اسحاق علی علوی ایڈیٹر "الناظر"

حضرت نجم الدولہ اسد اللہ خاں بہادر غالب کا خط

میر مہدی کے نام

سید صاحب کل پہر دن رہے تمہارا خط پہنچا یقین ہے کہ اسی وقت یا شام کو میر سرفراز حسین تمہارے پاس پہنچ گئے ہوں۔ حال سفر کا جو کچھ ہے اُن کی زبانی سن لو گے میں کیا لکھوں۔ میں نے بھی جو کچھ سنا ہے اُنھیں سے سنا ہے ان کا اس طرح ناکام پھر آنا میری تمنا اور میرے مقصود کے خلاف ہے لیکن میرے عقیدہ اور میرے تصور کے مطابق ہے میں جانتا تھا کہ وہاں کچھ نہ ہو گا سو روپے کی ناحق زیر باری ہوئی چونکہ یہ زیر باری میرے بھروسہ پر ہوئی تو مجھے شرمساری ہوئی میں نے اس

چھپا سٹھ برس میں اس طرح کی شرمساریاں اور روسیاہیاں بہت اٹھائی ہیں جہاں ہزار داغ ہیں ایک ہزار ایک یہی میر سرفراز حسین کی زیر باری سے دل کڑھتا ہے۔ وبا کو کیا پوچھتے ہو قدر انداز قضا کے ترکش میں یہی ایک تیر باقی تھا قتل ایسا عام۔ لوٹ ایسی سخت۔ کال ایسا پڑا۔ وبا کیوں نہ ہو لسان الغیب نے دس برس پہلے فرمایا۔ شعر

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

میاں سنہ ۱۲۷۷ ہجری کی بات غلط نہ تھی مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی بعد رفع فساد ہوا سمجھ لیا جائیگا۔ کلیات اُردو کا چھاپا تمام ہوا اغلب کہ اسی ہفتہ میں غایت اس مہینے میں ایک نسخہ بسبیل ڈاک تم کو پہنچ جائے۔

کلیات نظم فارسی کے چھاپنے کی بھی تدبیر ہو رہی ہے اگر ڈول بن گیا تو وہ بھی چھپ جائے گا۔ قاطع برہان کے خاتمہ میں کچھ فوائد بڑھائے گئے ہیں اگر مقدور مساعدت کریگا تو میں بے شرکتِ غیر اسکو چھپواؤں گا مگر یہ خیال محال ہے میرے مقدور کی تیاری کا حال مجتہد العصر کو معلوم ہے واللہ علیٰ کلِ شئی قدیر۔ خدا کا بندہ ہوں علی کا غلام میرا خدا کریم میرا خاوند سخی۔ علی دارم چہ غم دارم۔ وبا کی آنچ مدھم ہو گئی ہے۔ پانچ سات دن بڑا زور و شور رہا پرسوں خواجہ مرزا ولد خواجہ امان مع اپنی بی بی بچوں کے دلی میں میں آیا کل رات کو اُس کا نو برس کا بیٹا ہیضہ کر کے مر گیا۔ اِنا للہ و انا الیہ راجعون۔ الور میں بھی وبا ہے الکزنڈر ہیڈرلے مشہور بہ الکہ صاحب مر گیا۔ واقعی بے تکلف وہ میرا عزیز اور ترقی خواہ اور مزاج میں اور مجھ میں متوسط تھا اسی جرم میں ماخوذ ہو کر مرا خیر یہ عالم اسباب ہے اس کے حالات سے ہم کو کیا۔

غالب

مرزا حاتم علی مہر کے نام

مرزا صاحب! میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار ہا کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو کیا تم نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھائی ہے؟ اتنا تو کہو، کہ یہ کیا بات تمہارے جی میں آئی ہے؟ برسوں ہو گئے کہ تمہارا خط نہیں آیا۔ نہ اپنی خیر و عافیت لکھی۔ نہ کتابوں کا بیورا بھجوایا۔ ہاں مرزا تفتہ نے ہاتھرس سے یہ خبر دی ہے۔ کہ پانچ ورق پانچ کتابوں کے آغاز سے دے آیا ہوں۔ اور انھوں نے سیاہ قلم کی لوحوں کی تیاری کی ہے۔ یہ تو بہت دن ہوئے۔ تم نے خبر دی ہے کہ دو کتابوں کی طلائی لوح مرتب ہو گئی ہے۔ پھر اب ان دو کتابوں کی جلدیں بن جانے کی کیا خبر ہے؟ اور ان پانچ کتابوں کے تیار ہونے میں درنگ کس قدر ہے؟ مہتمم مطبع کا خط پرسوں آیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ "تمہاری چالیس کتابیں بعد منہائی لینے سات جلدوں کے اسی ہفتے میں تمہارے پاس پہونچ جائیں گی"! اب حضرت ارشاد کریں کہ یہ سات جلدیں کب آئیں گی۔ ہر چند کاریگروں کے دیر لگانے سے تم بھی مجبور ہو مگر ایسا لکھو کہ آنکھوں کی نگرانی اور دل کی پریشانی دور ہو۔ خدا کرے ان تینتیس جلدوں کے ساتھ یا دو تین روز کے آگے پیچھے یہ سات جلدیں آپ کی عنایتی بھی آئیں۔ تا خاص و عام میں جا بجا بھیجی جائیں۔

میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا ضیاءالدین خاں اور حسین مرزا جمع کر لیتے تھے۔ جو میں نے کہا انھوں نے لکھ لیا۔ ان دونوں کے گھر لٹ گئے

ہزاروں روپے کے کتاب خانے برباد ہوئے۔ اب میں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے۔ کہ ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے۔ اور زمزمہ پرداز بھی ہے۔ ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اس نے وہ کاغذ جو مجھکو دکھایا یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا۔ غزل تم کو بھیجتا ہوں اور صلے میں اس کے اس خط کا جواب چاہتا ہوں۔

غزل

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اِک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی۔ دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

زخم گر دب گیا لہو نہ تھما
کام گر رک گیا روا نہ ہوا

رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے
لے کے دل، دلستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھیئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

جواب کا طالب

غالب

انتخاب از آبِ حیات



زبان اُردو کی تاریخ

اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اُردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دنیا کے پردے پر ہندوستان کے ساتھ آئی ہو۔ اس کی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے اور برج کا سبزہ زار اس کا وطن ہے۔ تم خیال کرو گے کہ شاید اس میراث قدیمی کی سند سنسکرت کے پاس ہوگی اور وہ ایسا بیج ہوگا کہ یہیں پھوٹا ہوگا۔ اور یہیں پھلا پھولا ہوگا لیکن نہیں ابھی سراغ آگے چلتا ہے۔ سب جانتے ہیں۔ کہ ہندوستان اگرچہ بے ہمتی اور آرام طلبی کے سبب سے بدنام رہا مگر باوجود اس کے مہذب قوموں کی آنکھوں میں ہمیشہ سے کھُبا رہا ہے چنانچہ اس کی سرسبزی اور زرخیزی اور اعتدال ہوا نے بلائے جان ہو کر ہمیشہ اُسے غیر قوموں کی گھُڑ دوڑ کا میدان بنائے رکھا ہے۔ پس دانایان فرنگ کہ ہر بات کا پتا پتال تک نکالنے والے ہیں اُنھوں نے زبانوں اور قدیمی نشانوں سے ثابت کیا ہے۔ کہ یہاں کے اصلی باشندے اور لوگ تھے۔ ایک زبردست قوم نے یہاں آکر آہستہ آہستہ کل ملک پر قبضہ کر لیا یہ فتحیاب غالباً جیحوں سیحوں کے میدانوں سے اٹھ کر اور ہمارے شمالی پہاڑ

الٹ کر اس ملک میں آتے ہوں گے۔ اس زمانے کے گیت اور پرانی نشانیاں دیکھ کر یہ بھی معلوم کیا ہے کہ وہ لوگ دل کے بہادر۔ ہمت کے پورے۔ صورت کے وجیہ۔ رنگ کے گورے ہوں گے۔ اور اس زمانے کی حیثیت کے بموجب تعلیم یافتہ بھی ہوں گے موقع کا مقام اور سرسبز زمین دیکھ کر یہیں زمین گیر ہوئے۔ اس قوم کا نام ایرین تھا اور عجب نہیں کہ ان کی زبان وہ ہو جو اپنی اصل سے کچھ کچھ بدل کر سنسکرت کہلاتی ہے۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہندوستان میں آکر راجہ مہاراجہ کا خطاب لیا۔ ایران میں تاج کیانی پر درفش کاویانی لہرایا۔ اپنے مذہب کا نادر طریقہ لیکر چین کو نگارخانہ بنایا یونان کا طبقہ حکمت سے الگ جمایا روما کی عالمگیر سلطنت کی بنیاد ڈالی آندلس پہنچکر چاندی نکالی یورپ سے خبر آئی کہ کہیں دریا سے مچھلیاں نکالتے نکالتے گوہر سلطنت پائے۔ کہیں پہاڑوں سے دھات کھودتے کھودتے لعل بے بہا نکال لائے۔ تب اصلی رہنے والے کون تھے؟ اور ان کی زبان کیا تھی؟ قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پنجاب میں اب قطعہ قطعہ کی زبان کہیں کچھ کچھ اور کہیں بالکل اختلاف رکھتی ہے۔ اور یہی حال ور اضلاع ہند میں ہے۔ اسی طرح اُس عہد میں بھی اختلاف ہوگا۔ اور اس عہد کی نامی زبانیں وہ ہوں گی جن کی نشانی تامل اوڑیا اور تلنگو وغیرہ اضلاع دکن اور مشرق میں اب تک یادگار موجود ہیں۔ بلکہ اس حالت میں بھی اُن کی شاعری اور انشا پردازی کہتی ہے۔ کہ یہ گٹھلی کسی لذیذ میوے کی ہے اور سنسکرت سے انہیں لگاؤ تک نہیں۔

فتحیابوں نے ہندوکش کے پہاڑ اتر کر پہلے تو پنجاب ہی میں ڈیرے ڈالے ہوں گے پھر جوں جوں بڑھتے گئے ہوں گے۔ اصلی باشندے کچھ تو لڑتے مرتے دائیں بائیں جنگلوں کی گود اور پہاڑوں کے دامن میں گھستے گئے ہونگے کچھ بھاگے ہونگے وہ دکن اور مشرق کو ہٹتے گئے ہونگے

کچھ شُنیاں کی غلامی اور خدمتگاری میں کام آئے ہوں گے۔ اور وہی شودر کہلائے ہونگے
چنانچہ اب تک بھی ان کی صورتیں کہے دیتی ہیں۔ کہ یہ کسی اور بدن کی ہڈی ہیں۔

مدت دراز تک ایرین بھائیوں کے کاروبار ہندوستانی بھائیوں کے ساتھ ملے چلے رہے ہوں گے۔ یہی سبب ہو کہ ایران کی تاریخ قدیم میں مہ آباد اور اس کے زمانے کی تقسیم برہما کے زمانے سے اور اس کے رسوم و قواعد سے مطابقت دکھاتی ہو اور چاروں برنوں کا برابر پتہ لگتا ہی یہاں بدھ نے اُنہیں توڑا۔ وہاں زر دشت کے مذہب نے اُسے جلا کر خاک کیا مگر ہندؤوں نے بودھ کے بعد پھر اپنے حال کو سنبھال لیا۔ ایرانی اپنی بدحالی کو نہ سنبھال سکے چاروں برنوں کی تقسیم اور اُن کا الگ تھلگ رہنا دور کے دیکھنے والوں کو غرور کے لباس میں نظر آیا۔ مگر حق پوچھو۔ تو یہ کچھ بری بات نہ تھی۔ اسی کی برکت ہی کہ آج تک چاروں سلسلے صاف الگ الگ چلے آتے ہیں۔ جو ہندو ہوگا۔ ماں باپ دونوں کیطرف سے خالص ہو گا۔ اور برابر اپنی قوم کا پتا بتا سکیگا۔ جو دوغلا ہو گا اس کا سلسلہ الگ ہو جائیگا۔ اگر یہ قیدیں اس سختی کے ساتھ نہ ہوتیں۔ تو تمام نسلیں خلط ملط ہو جاتیں۔ نجیب الطرفین آدمی چاہتے تو ڈھونڈھے نہ ملتا۔ شُنیاں کی ان سخت قیدوں نے آپس کی بندشوں میں عجیب طرح کے پھندے ڈالے چنانچہ جب نسلوں کی حفاظت کا پورا بندوبست کر چکے تو خیال ہوا کہ شودروں کے ساتھ آٹھ پہر بات چیت رہنے سہنے اور لین دین کرنے میں بزرگوں کی زبان دوغلی ہو جائے گی۔ اسواسطے کہا کہ ہماری زبان زبان الٰہی ہے۔ اور الٰہی عہد سے اسی طرح چلی آتی ہو۔ چنانچہ اُسکے قواعد اور اُصول باندھے اور ایسے جانچ کر باندھے جن میں نقطے کا فرق نہیں آسکتا۔ اسکی پاکیزگی نے غیر لفظ کو اپنے دامن پر ناپاک دھبا سمجھا۔ اور سوا برہمن کے دوسرے کی زبان بلکہ کان تک گزرنا بھی ناجائز ہوا۔ اس سخت قانون نے بڑا فائدہ یہ دیا کہ زبان ہمیشہ اپنی اصلیت اور بزرگوں کی یادگار

کا خالص نمونہ نمایاں کرتی رہنگی برخلاف ایرانی بھائیوں کے ان کے پاس زبانی سند بھی نہ رہی۔

اسی بنیاد پر فتحیابوں کی بلند نظری نے اس کا نام سنسکرت رکھا جس کے معنی آراستہ پیراستہ، صنعتی، منزہ، مصفا، مقدس۔ جو چاہو سمجھ لو۔ ان کے قواعد زبان بھی ایسے مقدس ہوئے کہ بزرگان دین ہی اسے پڑھائیں تو پڑھائیں بلکہ اس طرح پکار کر پڑھنا بھی گناہ ہوا کہ شودر کے کان میں آواز پڑے۔ اس زبان کا نام دیوبانی ہوا یعنی زبان الٰہی۔ زبان شاہی۔ وید کے سنہ ترتیب جس سے اس عہد کی زبان کا پتہ لگے۔ ۱۴ سو برس قبل سنہ عیسوی خیال کرتے ہیں۔ اسوقت ان فتحیابوں کی باتیں اس ملک اور ملک والوں کے ساتھ ایسی سمجھ لو جیسے ہندوستان میں پہلے پہلے مسلمانوں کی حالتیں۔ ان کی سنسکرت زبان کے مخرج اور تلفظ یہاں کے لوگوں میں آکر کچھ اور ہو گئے ہوں گے اسلئے گھروں اور بازاروں میں باتیں کرنے کو قطعہ قطعہ میں پراکرت زبانیں خود بخود پیدا ہو گئی ہوں گی جیسے اسلام کے بعد اردو۔ چنانچہ ماگدھی (پالی) سورسینی، مہاراشٹری وغیرہ قدیمی پراکرتیں اب بھی اپنی قدامت کا پتا بتاتی ہیں۔ ان کی سیاہی میں سینکڑوں لفظ سنسکرت کے چمکتے نظر آتے ہیں۔ مگر بگڑے ہوئے ہیں۔ دیکھا! پراکرت کے معنی ہیں طبیعت اور جو طبیعت سے نکلے چنانچہ ہیم چند لغات سنسکرت کا جامع بھی یہی کہتا ہے۔ اسکے علاوہ سنسکرت مہذب اور مقدس اور پراکرت غیر مہذب لوگوں کو کہتے ہیں پس ایسی ایسی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فہمیدہ لوگ تھے۔ ہر بات کو خوب سمجھتے تھے اور جو کچھ انہوں نے کیا سمجھ کر کیا ہے۔

راجہ بھوج کے عہد کی ناٹک پستکیں کہتی ہیں۔ کہاں عہدوں میں علمی۔ کتابی اور درباری زبان تو سنسکرت تھی۔ مگر چونکہ معاملہ خاص و عام سے پڑتا تھا۔ اس لئے گفتگو میں پنڈتوں کو بھی پراکرت ہی بولنی پڑتی تھی۔ پراکرت صاف سنسکرت کی بیٹی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اسمیں ہزاروں لفظ سنسکرت کے ہیں اور ویسے ہی قاعدے صرف و نحو کے بھی ہیں۔

سنسکرت کی اتنی حفاظت ہوئی۔ پھر بھی منوسمرتی ویدوں کی ترتیب سے کئی سو برس بعد لکھی گئی تھی۔ اس میں اور وید کی زبان میں صاف فرق ہے۔ اور اب اور بھی زیادہ ہو گیا لیکن چونکہ سلطنت اور معتبر تصانیف پر مذہب کا چوکیدار بیٹھا تھا۔ اس لئے نقصان کا بہت خطرہ نہ تھا کہ دفعۃً ۴۴۵ برس قبل عیسوی میں بدھ مذہب کے بانی شاکی منی پیدا ہوئے۔ وہ مگدھ دیس سے اٹھے تھے۔ اسلئے دیس کے پراکرت میں وعظ شروع کیا۔ کیونکہ زیادہ تر کام عوام سے تھا۔ عورت مرد سے لیکر بچے اور بوڑھے تک یہی اس دیس کی زبان تھی۔ ان کی آتش زبانی سے مذہب مذکور ایسا پھیلنا شروع ہوا۔ جیسے بن میں آگ لگے۔ دیکھتے دیکھتے دھرم حکومت۔ رسم و رواج۔ دین آئین سب کو جلا کر خاک کر دیا۔ اور مگدھ دیس کی پراکرت کل دربار اور کل دفتروں کی زبان ہو گئی۔ اقبال کی یاوری نے علوم و فنون میں بھی ایسی ترقی دی کہ تھوڑے ہی دنوں میں عجیب و غریب کتابیں تصنیف ہو کر اسی زبان میں علوم کے کتب خانے سج گئے اور فنون کے کارخانے جاری ہو گئے۔ کہیں کہیں کونے گوشے میں جہاں کے راجہ وید کو مانتے رہے۔ وہاں ویدوں کا اثر رہا۔ باقی راج کے دربار اور علمی سرکار سب کی زبان ماگدھی ہی ماگدھی ہو گئی۔ ان کے حوصلے وسیع ہو کر دعوے بڑھے اور بآواز بلند کہدیا کہ ابتدائے عالم سے تمام زبانوں کی اصل ماگدھی ہے۔ برہمن اور کل انسان بات کرنے کے لائق بھی نہ تھے۔ اصل میں انکی بھی اور قادر مطلق بودھ کی زبان بھی یہی ہے اسکی صرف و نحو کی کتابیں بھی تصنیف ہوئیں خدا کی قدرت دیکھو۔ جو لونڈی تھی وہ رانی بن بیٹھی اور رانی منہ چھپا کر کونے میں بیٹھ گئی۔

زمانے نے اپنی عادت کے بموجب (تخمیناً ۱۰ سو برس بعد) بودھ مذہب کو بھی رخصت کیا اور اس کے ساتھ اس کی زبان بھی رخصت ہوئی۔ شنکر اچارج کی برکت سے برہمنوں کا ستارا ڈوبا ہوا پھر ابھر کر چمکا اور سنسکرت کی آب و تاب بھی شروع ہوئی۔ راجہ بکرماجیت کے

عہد میں جو روشنی اُس کی فصاحت نے پائی۔ آج تک لوگوں کی آنکھوں کا اُجالا ہے۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ کہ دربارِ سلطنت اور اعلیٰ درجے کے لوگوں کو سنسکرت بولنا اعتبار و افتخار کی سند تھا۔ اور پراکرت عوام کی زبان تھی۔ کیونکہ اُس عہد میں جو کالیداس مَلِک الشعرا نے شکنتلا کا ناٹک لکھا ہے۔ سبھا میں دیکھ لو۔ بادشاہ اُمرا اور پنڈت سنسکرت بول رہے ہیں۔ اور کوئی عام آدمی کچھ کہتا ہے تو پراکرت میں کہتا ہے۔

گیارہویں صدی عیسوی سے پہلے راجہ بھرت کے عہد میں برج کے قطعے کی وہ زبان تھی جسے ہم آج برج بھاشا کی زبان کہہ سکتے ہیں۔ اُس وقت بھی ہر قطعے میں اپنی اپنی بولی عام لوگوں کی حاجت روائی کرتی تھی اور سنسکرت تصنیفات اور خواص کی زبانوں کے لئے باعثِ برکت تھی۔ کہ دفعتاً زمانے کے شعبدہ باز نے ایک اور رنگ بدلا یعنی اسلام کا قدم ہندوستان میں آیا۔ اُس نے پھر ملک و مذہب کو نیا انقلاب دیا۔ اور اسی وقت سے زبان کا اثر زبان پر دوڑنا شروع ہوا۔

سنسکرت اور اصل فارسی یعنی ژندواستا کی زبان ایرین کے رشتے سے ایک دادا کی اولاد ہیں۔ مگر زمانے کا اتفاق دیکھو کہ خدا جانے کے سو برس یا کے ہزار برس کی بچھڑی ہوئی بہنیں اس حالت سے آکر ملی ہیں کہ ایک دوسرے کی شکل نہیں پہچان سکتی۔

ہندوستانی بہن کی کہانی تو سُن چکے اب ایرانی بہن کی داستان بھی سُن لو کہ اس پر وہاں کیا گزری۔ اول تو یہی قیاس کرو کہ اس ملک نے جو ایران نام پایا۔ شاید وہ لفظ ایرین ہی کی برکت ہو۔ پھر یہ بھی کچھ تھوڑے تعجب کا مقام نہیں کہ جس طرح ہندوستانی بہن پر وقت بوقت بودھ وغیرہ کے حادثے گزرے۔ اسی طرح اُس پر بھی وہاں انقلاب پڑتے رہے اور باوجود اسکے اب تک ہزاروں لفظ فارسی اور سنسکرت کے صاف ملتے جلتے نظر آتے ہیں۔

ایرانی بہن جب اس ملک میں جا کر بسی ہوگی۔ اول تو مدت تک اُن کے مذہب۔ رسم و رواج اور زبان جیسے تھے۔ ویسے ہی رہے ہوں گے۔ مگر اُس زمانے کی کوئی تصنیف ہاتھ نہیں آئی۔ کچھ ٹوٹا پھوٹا پتا ملتا ہے۔ تو زردشت کے وقت سے ملتا ہے۔ جسے آج تخمیناً ۲۴سو برس ہوئے اس نورانی مُوحّد نے شعلۂ آتش کے پردے میں توحید کے مسئلے کو رواج دیا۔ مذہب مذکور نے سلطنت کے بازوؤں سے زور پکڑا اور ایران سے نکلکر دو سو برس کے قریب اطراف و جوانب کو دباتا رہا۔ یہاں تک کہ یونان سے سکندر طوفان کی طرح اُٹھا اور ایشیا کے امن و امان کو تہ و بالا کر دیا۔ جو مصیبت بودھ کے ہاتھ سے وید شاستر پر پڑی تھی۔ وہاں وہی مصیبت ژندواستا پر آئی۔ چنانچہ جس آگ نے زردشت اور جاماسپ کے متبرک ہاتھوں سے آتش خانوں کو روشن کیا تھا جس کے آگے گشتاسپ نے تاج اُتار کر رکھا جس کی درگاہ میں اسفندیار نے گرز اور تلوار چڑھائی وہ یونان کے آبِ شمشیر سے بجھائی گئی۔ اور آتش خانے راکھ ہو کر اُڑ گئے۔ افسوس یہ ہے کہ ژندو پارہ کے ورق ورق برباد کئے گئے۔ اور ہزاروں کتابیں فلسفۂ الٰہی اور علوم و فنون کی تھیں کہ نابود ہو گئیں۔ جب کہ یونانیوں نے ملک پر غلبہ پایا تو زبان نے زبانوں پر بھی زور دکھا دیا ہوگا۔ تھوڑے ہی دنوں میں پارتھیا والوں کا عمل دخل ہو گیا۔ وہ ایران جسے ہزاروں برس سے ملک گیری کے نشان اسلامی اُتارتے تھے اور تہذیب و شائستگی اس کے دربار میں سر جھکاتے تھے ۵۰۰ برس تک طغریابوں کے قبضے میں دبا رہا اور ژند کی کتب مقدسہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر فنا کی گئیں۔

۲۲۶ء میں پھر تنِ بیجان میں سانس آئی اور ساسانیوں کی تلواروں میں قدیمی اقبال نے چمک دکھائی۔ ان بادشاہوں نے ملک و مملکت کی قدامت کے ساتھ بجھے ہوئے مذہب کو بھی روشن کیا۔ گرے ہوئے آتش خانوں کو پھر اٹھایا اور جہاں جہاں سے پھٹے پرانے اوراق

پریشاں ہاتھ آئے بہم پہنچائے۔ انہی کی کوششوں کی کمائی تھی جو پھر ساڑھے چار سو برس بعد علم اسلام کے آگے قربانی ہوئی۔ اس معاملے میں ہمیں نیک نیت پارسیوں کا شکریہ نہ بھولنا چاہیئے۔ کیونکہ باوجود تباہی اور خانہ بربادی کے جو پرانا کاغذ کسی با اعتقاد کے ہاتھ آیا۔ وہ جان کے ساتھ ایمان کو بھی لیتا آیا۔ کہ بندر۔ سورت۔ گجرات وغیرہ ملکوں میں آج تک اسی نور سے آتش خانے روشن ہیں۔ جو کچھ ان کے پاس ہے۔ وہ ان تصنیفات کا بقیہ ہے۔ جو ساسانیوں کے عہد میں ہوئیں۔ کتب مذکورہ دونوں زبانوں کا لفظی اتفاق ہی نہیں ثابت کرتیں۔ بلکہ ان کے اتحاد اعتقاد پر بھی شہادت دیتی ہیں۔ جو چار برن ہندوؤں میں ہیں۔ وہی ایران میں تھے۔ اجرام آسمانی کی عظمت واجب تھی۔ حیوانات بے آزار کا مارنا گناہ عظیم تھا۔ تناسخ کا مسئلہ دونوں میں یکساں تھا۔ آتش۔ آب۔ خاک۔ باد۔ ابر۔ بجلی۔ گرج۔ ہوا وغیرہ اشیا کے لیے ایک ایک دیوتا مانا ہوا تھا جس کے اظہار عظمت کے لیئے خاص خاص طریقے تھے۔ یادِ الٰہی کے زمزمے تھے جسکو وہ اپنی اصطلاح میں گاتھا کہتے تھے۔ یہ وہی لفظ ہے۔ جس کے نام پر یہاں گیتا کتاب ہے۔ کیونکہ اس میں بھی یادِ الٰہی کے گیت ہیں۔ فارسی مروجہ کے چند الفاظ تمثیلاً لکھتا ہوں کہ سنسکرت سے ملتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت
پدر	پتر	بوم	بھوم	پا	پاؤ
پور	پُتر	اسپ	اشو	بہم	بھے
مادر	ماتر	برادر	بھراتر	خاشاک	کشیا
زانو	جانو	دختر	دُوہتر	خر	کھر
بار	بھار	انگشت	انگشٹ	+	+

ایرانی بہن پر ایران میں پہلے اسلام کے ہاتھ سے وہ صدمہ گزرا تھا جو کہ یہاں دو سو برس بعد گزرا اور اس سے اس کی حیثیت بالکل بدل گئی تھی۔ بہرحال یہاں وہ ایسی حالت کے ساتھ پہنچی کہ عربی اور ترکی الفاظ اور بہت سی لفظی اور ترکیبی تبدیلیوں کے سبب سے اُس کی صورت نہ پہچانی جاتی تھی۔ یہاں جو مسلمان آئے۔ وہ آپس میں وہی رائج الوقت فارسی بولتے تھے۔ اور ہندوؤں سے ہندی کے الفاظ ملا جلا کر گزارہ کر لیتے تھے۔

۱۔ ادھر سنسکرت تو دیوبانی یعنی زبان آسمانی تھی اس میں ملکشوں کو دخل کہاں؟ البتہ برج بھاشا نے اس بن بلائے مہمان کو جگہ دی۔ دھرم والے ہندو سالہا سال تک ملیکش بھاشا سمجھ کر غیر زبان سے متنفر رہے۔ مگر زبان کا قانون دھرم اور حکومت کے قانون سے بھی سخت ہے۔ کیونکہ اسے گھڑی گھڑی اور پل پل کی ضرورتیں مدد دیتی ہیں جو کسی طرح بند نہیں ہوتیں۔ غرض جب ایک جگہ کا رہنا سہنا۔ لین دین کرتا تھا لفظوں کے بولے بغیر گزارا نہ کر سکے۔ دو قوموں کے ارتباط میں ایسا اختلاط ضرور ہوتا ہے۔ اور اسکے کئی سبب ہیں۔ اکثر نئی چیزیں ایسی آتی ہیں جو اپنے نام اپنے ساتھ لاتی ہیں۔

۲۔ اکثر معانی ایسے ہوتے ہیں۔ کہ انہیں اُن ہی زبان میں کہیں تو ایک لفظ میں ادا ہو جاتے ہیں۔ ترجمہ کریں تو ایک فقرہ بنتا ہے۔ پھر بھی نہ وہ مزا آتا ہے۔ نہ مطلب کا حق ادا ہوتا ہے۔ اس صورت میں گویا قانون زبان اور زمین بیان مجبور کرتا ہے۔ کہ یہاں وہی لفظ بولنا چاہیے۔ دوسرا لفظ بولنا جائز نہیں۔

۳۔ جو لوگ اکثر غیر ملکوں میں سفر کرتے ہیں۔ وہ اس لطف کو جانتے ہیں کہ جب دو غیر زبان والے ایک جگہ رہتے سہتے ہیں۔ تو کبھی کام کاج کی شدت مصروفیت میں کبھی اسی عالم میں ضروری بات جلدی کہہ دینے کی غرض سے کبھی آسانی سے مطلب سمجھانے کو ایک دوسرے

کے لفظ خواہ مخواہ اس طرح بول جانے پڑتے ہیں کہ بے اس کے گزارہ نہیں ہوتا۔

۴۔ پھر جب ایک جگہ رہ کر شیر و شکر ہوتے ہیں۔ تو اکثر پیار اور محبت سے کبھی آپس کی دل لگی کے لیئے ایک دوسرے کے لفظ بول کر جی خوش ہوتا ہے جس طرح دوست کو دوست پیارا ہوتا ہے اسی طرح اس کے لفظ بھی پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ یا یوں سمجھو کہ جس طرح وطن دار اپنے مہمانوں کے رہنے کو جگہ دیتے ہیں۔ اسی طرح انکی زبان مہمان کو بلکہ لفظوں کو جگہ دیتی ہے۔

۵۔ بڑی بات یہ ہے کہ فتحیابوں کے اقبال کی چمک اُن کی بات بات کو لباس دستار رفتار، گفتار کو بھی ایسی آب و تاب سے جلوہ دیتی ہے کہ وہی سب کی آنکھوں میں بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ اور لوگ اُسے فقط اختیار ہی نہیں کرتے۔ بلکہ اس پر فخر بھی کرتے ہیں۔ پھر اس میں بہت سے فوائد بھی عقلی دلائل سے پیدا کرتے ہیں۔

اِس زمانے کی عہد بعہد کی ہندی تصنیفیں آج نہیں ملتیں جن سے وقت بوقت اس کی تبدیلیوں کا حال معلوم ہو۔ البتہ جب ۱۱۹۳ء میں شہاب الدین غوری نے رائے پتھورا پر فتح پائی۔ تو چند کوی (ایک نامی شاعر) نے پرتھی راج راسا لکھا اُسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ کہ زبان مذکور نے کتنا جلد عربی و فارسی کے اثر کو قبول کر لیا ہر صفحے میں کئی کئی لفظ نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت میں یہاں کی بھاشا بھی کچھ اور بھاشا تھی۔ میں نمونہ تصنیف مذکور کا دکھاتا ہوں۔

۷۶ पत्र प्रथी महल प्रिथी राज मंगियारी हनिवाजीव

ہتی واجی منگیاری پرتھی راج محل اٹھی پتر

۶ पत्र परवर दिगार पैगाम दयलाह करीम कवार सुलतान

سرطان کریم کوار پیغام دیلادہ پروردگار پتر

जलालदीन छाया सुरतान सहाबदीन अलहउपाया मुसलमान
مسلمان الہ اپایا سہاب دین سرطان چھایا جلال دین

मदीनिदान भीम दत्त इतना क़हर कहन लागो बादशाह सुरतान
سرطان بادشاہ کہن لاگو قہر اتنا بھیم دت مدیدان

परबरे देवरो दीवान छंडया बादबीन पर मंडया खलक आलम
عالم خلق منڈیا ویر بادوبی چھنڈیا دیوان دیورو پربرے

अलोई जीवत पडुवान पाई हजरति खुदाय खेल आन मरदां मेल
میل مردان اس کھیل خدا سے حجرت پائی پھودان جیوت علوی

सिधवासी हाववाई देय चादर उचाई
اوچائی چادر دے ہاب وائی سدھواسی

इतने मुलक का फ़रमानपेस कचल विलास केलाश रेह
روہ کیلاس ولاس کچل پیش فرمان کا ملک اتنے

खंदरा गकर
گکر کھندرا

९२ पत्त पाय घालि प्रिथीराज वाह हेनि सुलतान कीर सलाम
سلام کری سلطان دینی بار پرتھی راج گھالی پائے پتر ۵۲

लिहवार गरी अगुली सुलताने
سلطانے انگلی پری تتر دار

یہ اگرچہ مختلف جگہ کے ٹکڑے ہیں مطلب ان کا اصل کتاب کے دیکھنے سے

مگر حرف شناس آدمی بھی جان سکتا ہے کہ یہ لفظ عربی فارسی کے اس میں موجود ہیں۔ محل
پرزرنگار۔ پیکام (پیغام) کریم۔ سرطان (یعنی سلطان) بات شاہ (پادشاہ) دیوان۔ فلک (خلق عالم)
حجرت (حضرت) ملک۔ پھرمان (فرمان) سلام + ترجمے اور تصنیف کے تجربہ کار جانتے ہیں کہ ان
کی عبارت میں کسی زبان کا اصل لفظ جو اپنا مطلب بتاتا ہے۔ سطر سطر بھر عبارت میں ترجمہ
کریں۔ تو بھی وہ بات حاصل نہیں ہوتی جو مجموعہ خیالات کا اور اُس کے صفات و لوازمات
کا اُس ایک لفظ سے سننے والے کے سامنے آئینہ ہو جاتا ہے۔ وہ ہماری سطر بھر سے پورا
نہیں ہوتا۔ مثلاً چند کوی اپنی نظم میں سلطان کی جگہ اگر راجہ بلکہ مہاراجہ لکھ دیتا تو بھی جو
صفات اور اُس کے لوازمات نیک یا بد رحم یا عدل۔ زور یا ظلم یہ لفظ اُس کی نظم میں دکھا رہا ہے
وہ بات راجہ مہاراجہ سے ممکن نہیں۔ اسی طرح لفظ سلام کہ اس کے مطلب کا حق خواہ
ڈنڈوت خواہ پرنام کوئی لفظ ادا نہیں کرسکتا۔ نظیر اس کی آج انگریزی کے سینکڑوں
لفظ ہیں۔ اگر ترجمہ کریں تو سطروں میں بھی مطلب پورا نہیں ہوسکتا۔ مثلاً ایک ہندوستانی
شخص اپنے دوست سے کہتا ہے "لاٹ صاحب چھ بجے اسٹیشن پر پہنچیں گے۔ پروگرام کے بموجب
شہر کی سیر کریں گے۔ پانچ بجے آنا۔ وہیں چل کر تماشا دیکھیں گے" اب خواہ صحیح خواہ بگڑے
مگر یہ اصلی لفظ آپ اپنے معنی سننے والے کو سمجھا رہے ہیں۔ کئی کئی سطروں میں ترجمہ کئے
جائیں تو بھی حق مطلب بجا نہ لاسکیں گے + آخر پندرھویں صدی عیسوی میں کہ سکندر لودی
کا زمانہ تھا۔ اتنا ہوا کہ اول کایستھ فارسی پڑھ کر شاہی دفتر میں داخل ہوئے۔ اور اب اُن
لفظوں کو اُن کی زبانوں پر آنے کا زیادہ موقع ملا۔ رفتہ رفتہ اکبر کے عہد سے کہ مسلمان
شیر و شکر ہو گئے۔ یہ نوبت ہوئی۔ کہ ادھر بادشاہ اور اس کے اعلیٰ درجے کے اہل دربار نے
جُبہ و دستار کے ساتھ ڈاڑھیوں کو خدا حافظ کہا اور جامے پہن کر کھڑکی دار پگڑیاں باندھ بیٹھے اُدھر ہندو شرفا

بلکہ رجہ ہماراجہ ایرانی لباس پہننے اور فارسی بول کر فخر کرنے لگے بلکہ مرزا کے خطاب کو بڑے شوق سے لینے لگے۔

اب جس قدر ممکن ہے۔ عہد بعہد کے زبانوں کے نمونے دکھاتا ہوں۔ امیر خسرو جو کہ ۷۲۵ھ میں فوت ہوئے۔ اُن کی ایک غزل نظم اُردو کی تاریخ میں دیکھو۔ جس کا پہلا مصرع ہے زحالِ مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں الخ اس سے تمھیں کچھ کچھ حال اُسوقت کی زبان کا بھی معلوم ہوگا خالق باری بھی انہیں کے مخلوقات فکر سے ہے۔ باریک بیں اشخاص اُس سے بھی بہت سے الفاظ اور فقرے دیکھکر یہ نکتے سمجھ سکتے ہیں ؎

بیا برادر آؤ رے بھائی   بنشیں مادر بیٹھ ری مائی

ایک مجرب نسخہ آنکھوں کا دوہروں کی بحر میں کہتے ہیں ؎

لودھ پھٹکری مردہ سنگ   ہلدی زیرہ ایک ایک ٹنک
افیون چنا بھر مرچیں چار   اُرد برابر تھوتھا ڈار
پوست کے پانی میں پوٹلی کرے   تُرت پیڑ نینوں کی ہرے

نظم اُردو کی تاریخ میں اُن کی عمدہ پہیلیاں۔ کہہ مکرنیاں۔ دو سخنے۔ انمل بے جوڑ لکھ دیئے ہیں۔ انہیں دیکھو اور خیال کرو کہ بحریں دوہروں کی ہیں۔ مگر فارسیت کسقدر اپنا زور دکھا رہی ہے۔ ہندو شاعروں کے دوہرے برج بھاشا میں ہیں۔ مگر عہد بعہد کی زبان کا پتا بتاتے ہیں چنانچہ سکندر لودی کے زمانے میں کبیر شاعر بنارس کے رہنے والے علم میں آن پڑھ تھے گرو رامانند کے چیلے ہو کر ایسے ہوئے کہ خود کبیر پنتھیوں کا مت نکالا تصنیفات اگر جمع ہوں تو کئی جلدیں ہوں۔ اُن کے دوہروں میں فارسی۔ عربی کے لفظوں کو دیکھو ؎

دین گنوایو دُنی سے دُنی نہ آیو ہاتھ   پیر کلہاڑی ماریو گا پھل اپنے ہاتھ

کبیر سبر سیر اُئے ہیں کیوں سووئی سکھ چین ۔۔ کوتج نگارا سانس کا باجت ہی دن رین

گرو نانک صاحب کی تصنیفات میں بہت کچھ عربی فارسی ہی اگرچہ خاص قطعہ پنجاب کی زبان ہی مگر جس بہتات سے انکے کلام میں عربی - فارسی کے لفظ ہیں اتنے کسی کے کلام میں نہیں اور چونکہ ۹۰۰ھ ۱۵۰۰ء کے بعد فوت ہوئے اس سے چار سو برس پہلے کی پنجابی کا نمونہ بھی معلوم ہو سکتا ہی - دوہرا

ساس ماس سب جیو تمہارا - تو ہی کھرا پیارا ۔۔ نانک شاعر ایو کہت ہی - سچے پروردگارا

بلکہ اکثر چیزیں وظیفۂ عبادت کے طور پر ہیں - انہیں بھی الفاظ مذکورہ اسی کثرت سے نظر آتے ہیں - جپ جی کے دو فقرے دیکھو: ؎ یاں جاؤں آن ایک بار ۔۔ تو سدا سلامت جی نرنکار

مسلمان بھی اس زمانے میں یہاں کی زبان سے محبت رکھتے تھے چنانچہ سولھویں صدی عیسوی شیر شاہی عہد میں ملک محمد جائسی ایک شاعر ہوا - اس نے **پدماوت** کی داستان نظم کی اس سے عہد مذکور کی زبان ہی نہیں معلوم ہوتی - بلکہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان اس ملک میں آکر یہاں کی زبان کو کس پیار سے بولنے لگے تھے اسکی بحر بھی ہندی رکھی ہی - اور ورق کے ورق الٹتے جاؤ - فارسی و عربی کا لفظ نہیں ملتا مطلب اس کا آج مسلمان بلکہ ہر ایک ہندو بھی نہیں سمجھتا - کتاب مذکور چھپ گئی ہی - اور ہر جگہ مل سکتی ہی - اسلئے نمونہ نہیں لکھتا

ہمایوں نے جب گجرات دکن پر فوج کشی کی - تو سلطان بہادر وہاں کا بادشاہ تھا اور **چاپانیر** کا قلعہ بڑا مستحکم تھا کہ سلطان خود بھی اکثر وہاں رہتا تھا اور تمام خزائن و دفائن وہیں رکھتا تھا محاصرے کے وقت رومی خاں **میر آتش** (باوجودیکہ کمال معتبر اور مصاحب منظور نظر سلطان کا تھا) ہمایوں سے مل گیا - اور قلعہ (تمام نفائس اموال اور خزائن بیحساب سمیت) ہمایوں کے قبضے میں آیا - سلطان بہادر کے پاس ایک طوطا تھا کہ آدمی کی طرح باتیں کرتا تھا - اور سمجھکر بات کا جواب دیتا تھا سلطان اسے ایسا چاہتا تھا کہ سونے کے پنجرے میں رکھتا تھا - اور ایکدم جدا نہ

کرتا تھا۔ وہ بھی لوٹ میں آیا جب دربار میں لائے۔ تو رومی خاں بھی موجود تھا۔ طوطے نے دیکھ کر پہچانا اور کہا "پھٹ پاپی رومی خاں نمک حرام" سب کو تعجب ہوا اور ہمایوں نے کہا "رومی خاں چہ کنم کہ جانور است۔ ورنہ زبانش مے بریدم" اُس نے شرما کر آنکھیں نیچی کرلیں غرض اس نقل سے یہ ہو کہ اُس وقت بھی لوگوں کی زبان پر عربی فارسی کے لفظ ضرور چڑھے ہوئے تھے جب ہی طوطے کی زبان سے نمک حرام کا لفظ نکلا۔ جانور جو سنتا ہوگا۔ وہی بولتا ہوگا۔

سترھویں صدی عیسوی میں **بابا تلسی داس** برہمن ضلع باندہ کے رہنے والے پنڈت بھی تھے شاعر بھی تھے فقیر بھی تھے۔ انھوں نے **رامائن کو بھاشا** میں اس طرح ترجمہ کیا کہ وہ لاثانی کتاب مقبول خاص و عام ہوئی۔ اُن کے دوہروں میں بہت اور کتاب مذکور میں کہیں کہیں لفظ فارسی۔ عربی کے موجود ہیں **دُہرا رامائن ۵**

گھر تردت برن باگ وبردبرادیو لگائے	سنکا رے سیوک سکل چلے سوامی رکھ پائے
کتنی مغنگ کلہ بھی کھولے	گھر لبواس بچن ہٹ بولے
لوگ بیند بربد دبراجے	رام انیک گریب نواجے
پنڈت موٹے میں ادھاگر	گنی گریب گرام نرناگر
تلسی داس گریب کو کوئی نہ پوچھے بات	بابا کو بابا لے کر کر سلیے ہاتھ

انھی دنوں میں **سور داس جی** نے سری کرشن جی کے ذکر سے اپنے کلام کو مقبول خاص و عام کیا۔ ان کی تصنیف میں شاید کوئی شعر ہوگا کہ فارسی عربی لفظ سے خالی ہوگا۔

یعنی ساز	بابا دھام دھن دتما باندھیوں ہوں اس ساج
یعنی باز نہ آیا	سنت سبھی جانت ہول تو نہ آیو باج
یعنی آواز	کھبیت بہت کا ہے تم تالے سبن سُنی آواج

دیو نہ جات پار اُتر آئے چاہت چڑھیں جہاج — یعنی جہاز
تیجئے پار اُتار سور کو ن مہاراج برج راج
تیئں کرت کہت پر بھو تم سوں سدا گریب نواج — یعنی غریب نواز

خیال کرو۔ کہ جب یہ بزرگان مذہب اپنے دُہروں میں فارسی لفظ بول جاتے تھے۔ تو گفتگو میں عام ہندو لوگ کیا اس سے کچھ زیادہ نہ بولتے ہوں گے۔

آخر میں حسن و خوبی برج بھاشا کی راجہ جے سنگھ سوائی کی قدر دانی سے ظاہر ہوئی اُنھوں نے ایک ایک اشرفی دُہرہ کو دی اور گنوان پنڈتوں کو انعام دیکر دہلی و نواح دہلی میں شوق پھیلایا

اس عہد میں مسلمانوں کی زبان کا کیا حال ہوگا؟ ظاہر ہے کہ کئی سو برس سے اسلام آیا ہوا تھا جن کے باپ دادا کئی کئی پشت یہیں کی خاک سے اُٹھے اور یہیں پیوند زمین ہوئے اُنہیں آپس کے رشتوں اور معاملات کے سررشتوں سے ضرور یہاں کی زبان یعنی برج بھاشا بولنی ہوتی ہوگی یا تازہ ولایت آدھی اپنی آدھی اُنکی ملا کر ٹوٹی پھوٹی بولتے ہونگے۔ ان باتوں کی کوئی نثر تصنیف نہیں رہی **امیر خسرو** کی ایک **غزل** اور **پہیلیاں** اور **کہہ مکرنیاں** اور گیت پتا بتاتے ہیں کہ سنہ ۷۰۰ھ میں یہاں کے مسلمان خاصی بھاشا بولتے ہونگے۔ بلکہ یہی کلام یہ بھی خبر دیتے ہیں کہ مسلمان بھی اب یہیں کی زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے تھے اور اسی زبان کو کس شوق اور محبت سے بولتے تھے شاید بہ نسبت ہندوؤں کے فارسی۔ عربی لفظ اُنکی زبان پر زیادہ آجاتے ہونگے۔ اور جتنا یہاں رہنا سہنا اور استقلال زیادہ ہوتا گیا۔ اتنا ہی روز بروز فارسی۔ ترکی نے ضعف اور یہاں کی زبان نے زور پکڑا ہوگا۔ رفتہ رفتہ شاہجہاں کے زمانے میں کہ اقبال تیموریہ کا آفتاب عین اوج پر تھا۔ شہر اور شہر پناہ تعمیر ہو کر نئی دلی دار الخلافہ ہوئی بادشاہ اور ارکان دولت زیادہ تر وہاں رہنے لگے۔ اہل سیف۔ اہل قلم۔ اہل حرفہ اور تجارت وغیرہ ملک ملک اور شہر شہر

کے آدمی ایک جگہ جمع ہوئے۔ ترکی میں اردو بازار لشکر کو کہتے ہیں۔ اردوئے شاہی اور دربار میں ملے جلے الفاظ زیادہ بولتے تھے۔ وہاں کی بولی کا نام اردو ہو گیا اس کو فقط شاہجہان کا اقبال کہنا چاہیئے۔ کہ یہ زبان خاص و عام میں اس کے اردو کی طرف منسوب و مشہور ہو گئی ورنہ جو نظم و نثر کی مثالیں بیان ہوئیں۔ ان سے خیال کر وسعت دیکر کہہ سکتے ہو کہ جس وقت سے مسلمانوں کا قدم ہندوستان میں آیا ہوگا۔ اسی وقت سے اُن کی زبان نے یہاں کی زبان پر اثر شروع کر دیا ہوگا۔ چند کوی کا کلام مل گیا۔ اُس میں الفاظ موجود ہیں۔ محمود کے وقت کی نظم یا نثر مل جائے۔ تو اس میں بھی ضرور ہوں گے۔

بیانہائے مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جو کچھ ابتک ہوا کسی تحریک یا ارادے سے نہیں ہوا۔ بلکہ زبان مذکور کی طبیعت ایسی ملنسار واقع ہوئی ہے۔ کہ ہر زبان سے مل جل جاتی ہے سنسکرت آئی۔ اس سے مل گئی۔ عربی۔ فارسی آئی اُسے بسم اللہ کہا خیر مقدم کیا۔ اب انگریزی الفاظ کو اس طرح جگہ دے رہی ہے۔ گویا اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔

اسی زبان کو ریختہ بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ مختلف زبانوں نے اسے ریختہ کیا ہے۔ جیسے دیوار کو اینٹ، مٹی، چونا، سفیدی وغیرہ ریختہ کرتے ہیں۔ یا یہ کہ ریختہ کے معنی ہیں گری پڑی۔ پریشان چیز چونکہ اس میں الفاظ پریشان جمع ہیں اسلئے اسے ریختہ کہتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ اس میں عربی فارسی۔ ترکی وغیرہ کئی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔ اور اب انگریزی بھی داخل ہوتی جاتی ہے اور ایک وقت ہوگا۔ کہ عربی فارسی کی طرح انگریزی زبان پر قابض ہو جائیگی۔

چنانچہ میں ایک خاندانی نواب زادے کی گفتگو لکھتا ہوں جسکی پرورش اور تعلیم گھر میں ہوئی ہے۔ یعنی نہ عربی فارسی کی لفاظی نے اس پر رنگ چڑھایا ہے۔ نہ انگریزی نے روغن پھیرا ہے۔ فقط دوستانہ بے تکلفانہ باتیں ہیں۔ بڑے آغا کی پنشن لینے کل کچہری گیا تھا۔ ڈپٹی صاحب کے کمرے کے آگے کچھ

قرقی کا مال نیلام ہو رہا تھا کرُیاں کوٹ اور واسکٹیں نئی تھیں ۔ کنٹر اور گلاس بھی ولائتی تھے کرُ میاں ۔ مہین سی چقّیں باریک خوش رنگ تھیں ۔ میں نے کہا ۔ چلو کوئی ڈھب کی چیز ہو تو لے لیں منجھلے آغا بولے جانے بھی دو ۔ جس مال نے مالک سے وفا نہ کی ۔ ہم سے کیا وفا کریگا ۔ آتے ہوئے ریل اسٹیشن کے پاس دیکھتا ہوں کھبّے مرزا جان چلے آتے ہیں ۔ شکرم ٹھیر اکر بڑے تپاک سے ملے ۔ بڑھاپے نے بچارے کا رنگ روپ سب کھو دیا وہ شکل ہی نہیں ۔ وہ صورت ہی نہیں کیسے گورے ۔ چٹے سجیلے جوان تھے ۔ لوگ تصویریں اُتر واتے تھے ۔ میں نے کہا میاں ہم نے تو جانا تھا تم دکھن سے خوب چاق ۔ چوبند ۔ سُرخ سفید ہو کر آؤ گے ۔ تم تو سوکھ کر قاق ہو گئے غضب کیا اگلا جو بن بھی گنوا آئے ۔ ٹھنڈا سانس بھر کے بولے ۔ ہائے جوانی !“

فارسی ۔ عربی کے الفاظ تو ظاہر ہیں ۔ مگر خیال کیجئے کہ قرق ۔ چق ۔ چاق ۔ قاق ۔ آغا ترکی ہیں مہین نامعلوم ۔ نیلام ترنگالی ہے ۔ کمرا طالی ہے ۔ ڈپٹی ۔ ریل ۔ اسٹیشن ۔ کوٹ ۔ واسکٹ کنٹر ۔ گلاس انگریزی ہیں چٹا ۔ کھبّا پنجابی ہے ۔ مگر آنا ہے کہ ہم چٹا بغیر گورے کے اور اسی طرح چنگا بغیر بھلے کے نہیں بولتے ۔ وہ اکیلا ہی بولتے ہیں ۔ کھبّا پنجابی میں عام ہے خاص صفت ساتھ بولتے ہیں بھانڈا پھوڑنا اُردو میں کسی بات یا راز کھول دینے کو کہتے ہیں ۔ پنجابی میں باسن کو بھانڈا ہی کہتے ہیں گلا گھونٹنا اُردو میں بولتے ہیں ۔ پنجابی میں کھینچکر باندھنے کو یا مضبوط پکڑنے کو کہتے ہیں ۔ مثلاً گھٹ کر باندھو یا گھٹ کر پکڑو ۔ بھنا ۔ بھنانا ۔ توڑنا اور تڑوانا ہے اور اسی سبب سے پنجابی میں روپے کے لئے بھی بھنانا کہتے ہیں ۔ اُردو میں پہلے معنی متروک ہو گئے دوسرے معنی ہیں وہ بھی زیر کو پیش کر کے کہ جاؤ روپے کے ٹکے بھُنا لاؤ ۔ اور اس اصلیت کا سراغ یوں لگا کہ فارسی میں روپے کے لئے خوردہ کردن بولتے ہیں ۔ اُردو میں بھی کہتے ہیں صبح کو روپیہ خوردہ کیا تھا ۔ دوپہر کو دیکھو تو برکت ! یعنی سب پیسے اُٹھ گئے ۔

کسوٹی گھسنا - مرادف فرسودن - اُردو میں بالکسر ہی - پنجابی میں اس طرح بولتے ہیں
کہ کاف مفتوح معلوم ہوتا ہے - اور یہ کا لفظ عجیب ہے - کہ انہی کے لہجے کے لئے خاص ہے
بہرحال اس سے کسوٹی (گھسنے کی بٹیا) معیار کا نام ہوا - اُردو میں بھی لفظ کسوٹی ہو گیا
روپ - بیچیلا - جوبن - گنوایا - بُرج بھاشا ہے - ان کے علاوہ روزمرّہ کی باتوں پر خیال
کرو - یوسفؑ - ہارونؑ - موسیٰؑ - عیسیٰؑ وغیرہ عبرانی ہیں - کیمیا - فیلسوف - اصطرلاب
یونانی ہیں - اُردو یعنی ماش تامل ہے - نتھا یعنی خرد گجراتی ہے - تما کو امریکہ کا لفظ ہے - یورپ کے
رستے ہو کر اکبر کے عہد میں یہاں پہنچا -

اُردو میں اُس وقت نثر کی کوئی کتاب نہ لکھی گئی - جس سے سلسلہ ان تبدیلیوں کا معلوم
ہو - میر جعفر زٹلی کے کلام کو ہیں محمد شاہی بلکہ اُس سے پہلے زمانے کا نمونہ کہتا - مگر زٹل کا
اعتبار کیا؟ البتہ محمد شاہ کے عہد میں سنہ ۱۱۴۵ ہجری میں فضلی تخلص ایک بزرگ نے دہ مجلس
لکھی - اس کے دیباچے میں سبب تالیف لکھتے ہیں اور غالباً یہی نثر اُردو کی پہلی تصنیف ہے
پھر دل میں گزرا کہ ایسے کام کو عقل چاہیئے کامل اور مدد کسو طرف کی ہوئے شامل - کیونکہ بے تائید
صمدی اور بے مددِ جناب احمدی یہ مشکل صورت پذیر نہ ہووے اور گوہر مراد رشتۂ امید میں آوے
لہذا کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع - اور اب تک ترجمہ فارسی بعبارت ہندی نثر نہیں ہوا
مستمع - پس اس اندیشۂ عمیق میں غوطہ کھایا اور بیان تامل و تدبیر میں سرگشتہ ہوا - لیکن رُو
مقصود کی نہ پائی - ناگاہ نسیم عنایت الٰہی دل افگار اہتزاز میں آئی - یہ بات آئینۂ خاطر میں منہ دکھلائی

میر کی مثنوی شعلۂ عشق کے مضمون کو بھی مرزا رفیع نے نثر میں لکھا ہے افسوس کہ اس
وقت موجود نہیں - اس کا اندازہ بالکل یہی ہے - لیکن چند فقرے سودا کے ایک دیباچے
سے نقل کرتا ہوں جو کلیات میں موجود ہیں -

نثر مرزا رفیع "ضمیر منیر آئینہ دارانِ معنی کے مبرہن ہو کہ محض عنایت حق تعالیٰ کی ہے جو طوطئے ناطقہ شیریں سخن ہو۔ پس یہ چند مصرع کہ از قبیل ریختہ دُر ریختۂ خامۂ دو زبان اپنی سے صفحۂ کاغذ پر تحریر پائے۔ لازم ہے کہ تحویلِ سخن سامعہ سنجان روزگار کروں تا زبانی ان اشخاص کی ہمیشہ موردِ تحسین و آفریں رہوں ؎

قیمتِ قدر شناسائی سے پہنچے ہے بہم ۔۔۔ ورنہ دنیا میں خزف بھی کچھ نہیں گوہر سے کم

مضمون جیتے ہیں بیش از مرغ اسیر نہیں۔ کہ ہر نہج قفس کے جس وقت زبان پر آیا۔ فریادِ بلبل ہے واسطے گوشِ دادرس کے۔ غرض جس اہل سخن کا دُرِ منصفی زینت لب ہے۔ سررشتۂ حسنِ معانی کا اس کلام کے اُس سے انصاف طلب ہے۔ اگر حق تعالیٰ نے صبح کاغذ سفید کی شام سیہ کرنے کو یہ خاکسار خلق کیا ہے۔ تو ہر انسان کے فانوسِ دماغ میں چراغ ہوش دیا ہے چاہیے کہ دیکھ کر نکتہ چینی کرے۔ ورنہ گر تند زہر آلود سے لیے اجل کا ہے کو مرے"

اس **تصنیف** سے تخمیناً ۳۰ برس کے بعد جبکہ میر انشاء اللہ خاں اور **مرزا جانجاناں مظہر** کی دلّی میں ملاقات ہوئی ہے۔ اُس گفتگو کے چند فقرے بھی قابل غور ہیں۔ جو وہاں سید انشا مرزا جانجاناں سے فرماتے ہیں۔

سید انشا فرماتے ہیں

"ابتدائے سنِ صبا سے تا اوائل ریعان۔ اور اوائل ریعان سے الے الآن اشتیاقِ مالایطاق تقبیلِ عتبۂ عالیہ نہ بحدے تھا۔ کہ سلکِ تحریر و تقریر میں منتظم ہو سکے۔ لہذا بے واسطہ و وسیلہ حاضر ہوا ہوں"

مرزا صاحب جواب میں فرماتے ہیں

"اپنے تئیں کو تو بھی بعد طفلی سے تمھیں ایسے اشخاص کے ساتھ موانست و درجا

لست

رہا کی ہے"!

لیکن میر غفر غینی کے نام سے ایک گفتگو سید انشاء نے دریائے لطافت میں لکھی ہے اُسے پڑھ کر تعجب آتا ہو کہ اس صاحبِ کمال نے یہ زبان کس فصاحت کے قالب میں ڈھالی تھی۔ کہ ان عبارتوں میں اور اس میں زمین آسمان کا فرق ہو۔ شاید مرزا جانجاناں اور سودا وغیرہ بزرگوں کی تحریر کچھ اور ہوگی تقریر کا اندازہ اور ہوگا۔

بہرحال اس وقت تک انشاپردازی اور ترقی اور وسعت زبان اُردو کی فقط شعرا کی زبان پر تھی۔ جن کی تصنیفات غزلیں عاشقانہ اور قصیدے مدحیہ ہوتے تھے اور غرض اُنسے فقط اتنی تھی کہ امرا و اہل دول سے انعام لے کر گزارہ کریں یا تفریح طبع۔ یا یہ کہ ہمچشموں میں تحسین و آفریں کا فخر حاصل کریں۔ وہ بھی فقط نظم میں۔ نثر کے حال پر کسی کو اصلا توجہ نہ تھی کیونکہ کارروائی مطالب ضروری کی سب فارسی میں ہوتی تھی۔ مگر خدا کی قدرت دیکھو تھوڑے عرصے میں کئی قدرتی سامان جمع ہو گئے۔ اور سب سے مقدم سبب اسکی عام فہمی تھی۔ کہ ہر شخص سمجھتا تھا۔ اس لئے لکھنے والوں کو اسی میں واہ واہ لینے کا شوق ہوا۔ میر محمد عطا حسین خاں تحسین نے چار درویش کا قصہ اُردو میں لکھ کر نوطرز مرصع نام رکھا۔ شجاع الدولہ کے عہد میں تصنیف شروع ہوئی۔ ۱۲۰۹ھ ۱۷۹۵ء نواب آصف الدولہ کے عہد میں ختم ہوئی۔

ادھر تو یہ چہ بچاں لڑکا شعرائے جلسوں میں اور اُمرائے درباروں میں اپنی چلبلے کی شوخیوں سے سب کے دل بہلا رہا تھا۔ اُدھر دانائے فرنگ جو کلکتہ میں فورٹ ولیم کے قلعے پر دُوربین لگائے بیٹھا تھا۔ اُس نے دیکھا۔ نظر باز تاڑ گیا کہ لڑکا ہونہار ہے۔ مگر تربیت چاہتا ہے۔ تجویز ہوئی کہ جس ملک پر حکمرانی کرتے ہیں۔ اس کی زبان سیکھنی واجب ہے۔ چنانچہ

۱۷۹۹ء ۱۲۱۴ھ میں میر شیر علی افسوس نے **باغ اردو** اور ۱۸۰۵ء ۱۲۲۰ھ میں **آرائش محفل** لکھی۔ **میر امن دہلوی** نے ۱۸۰۲ء ۱۲۱۷ھ میں باغ و بہار آراستہ کیا اور انہی دنوں میں **اخلاق محسنی** کا ترجمہ لکھا۔ ساتھ ہی **جان گلگرسٹ** صاحب نے انگریزی میں **قواعد اردو** لکھی ۱۸۰۳ء ۱۲۱۸ھ میں **شری للو جی لال کوی** نے پریم ساگر لکھی اور **بیتال پچیسی** جو محمد شاہ کے زمانے میں سنسکرت سے برج بھاشا میں آئی تھی۔ اب عام فہم اردو ہو کر ناگری میں لکھی گئی۔ لیکن اس نقارۂ فخر کی آواز کو کوئی دبا نہیں سکتا۔ کہ **میر انشاء اللہ خاں** پہلے شخص ہیں جنہوں نے ۱۸۰۷ء ۱۲۲۲ھ میں **قواعد اردو** لکھ کر ایجاد کی ٹہنی پر ظرافت کے پھول کھلائے۔

عجب لطف یہ ہے کہ زبان اردو کی عام فہمی دیکھ کر مذہب نے بھی اپنی برکت کا ہاتھ اس کے سر پر رکھا۔ یعنی ۱۸۰۷ء ۱۲۲۲ھ میں مولوی **شاہ عبد القادر** صاحبؒ نے قرآن شریف کا ترجمہ اردو میں کیا۔ بعد اس کے مولوی **اسمٰعیل** صاحبؒ نے بعض رسالے عام اہل اسلام کی فہمائش کے لئے اردو میں لکھے۔

۱۸۳۵ء سے دفاتر سرکاری بھی اردو ہونے شروع ہوئے۔ چند سال کے بعد کل دفتروں میں اردو زبان ہو گئی۔ اسی سنہ میں اخباروں کو آزادی حاصل ہوئی ۱۸۳۶ء میں اردو کا اخبار دلّی میں جاری ہوا اور یہ اس زبان کا پہلا اخبار تھا۔ کہ میرے والد مرحوم کے قلم سے نکلا۔

غرض اپنی آسانی کے وصف سے اور اس لحاظ سے کہ ملکی زبان یہی ہے دفتری زبان بھی یہی ٹھیری اردو نے آہستہ آہستہ فارسی کو پیچھے ہٹانا اور اپنا قدم آگے بڑھانا شروع کیا تب سرکار نے مناسب سمجھا کہ اس ملک کے لوگوں کو انہی کی زبان میں انگریزی علوم و فنون سکھائے جائیں۔ چنانچہ ۱۸۴۲ء سے دہلی میں سوسائٹی قائم ہو کر ترجمے ہونے

لگے اور ضرورت علمی الفاظ بہم پہونچانے لگی۔ خیال کرو کہ جس زبان کی فقط آتنی بنیاد ہو وہ زبان کیا اور اُس کی وسعت میدان کیا۔ البتہ اب اُمید کر سکتے ہیں۔ کہ شاید یہ بھی ایک دن علمی زبانوں کے سلسلے میں کوئی درجہ پائے۔

اُردو اسقدر جلد جلد رنگ بدل رہی ہے کہ ایک مُصنّف اگر خود اپنی ایک سنہ کی تصنیف کو دوسرے سنہ کی تصنیف سے مقابلہ کرے۔ تو زبان میں فرق پائیگا۔ باوجود اس کے اب تک بھی اس قابل نہیں کہ ہر قسم کے مضمون خاطر خواہ ادا کر سکے۔ یا ہر علم کی کتاب کو بے تکلف ترجمہ کر دے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اکثر علوم اور ہزاروں مسائل علمی ممالکِ فرنگ میں ایسے نکلے ہیں۔ کہ زمانۂ سلف میں بالکل نہ تھے۔ اس واسطے عربی، فارسی، سنسکرت، بھاشا وغیرہ جو کہ اُردو کے بزرگ ہیں، ان کے خزانے میں اس کے ادائے مطلب کے لئے لفظ نہیں، اور اس میں ہم اُردو بچاری کے افلاس پر چنداں تعجب نہیں کر سکتے۔ خصوصاً جبکہ ہندو مسلمان اپنے اپنے بزرگوں کی میراث کو بھی ہاتھ سے کھوئے بیٹھے ہوں۔

(محمد حسین آزاد)



سولزیشن یا تہذیب

ہم دریافت کیا چاہتے ہیں۔ کہ سولزیشن کیا چیز ہے۔ اور کن کن چیزوں سے علاقہ رکھتی ہے؟ کیا یہ کوئی بنائی ہوئی چیز ہے یا قدرت نے انسان کی فطرت میں اسکو پیدا کیا ہے؟ اس کے معنی کیا ہیں؟ کیا یہ کوئی اصطلاح ہے؟ جس کو لوگوں نے یا فیلسوفوں نے مقرر کیا ہے۔ یا ایسی چیز ہے۔ کہ اس کا مفہوم اور جن جن چیزوں سے اس کا تعلق ہے وہ قانون قدرت میں پایا جاتا ہے۔ اس امر کے تصفیہ کے لئے ہم کو انسانی حالات پر نظر کرنی چاہیئے۔ اگر تہذیب انسان میں ایک فطری چیز ہے۔ تو وحشیوں میں۔ شہریوں میں۔ سب میں اُس کا نشان ملے گا۔ گو اُس کی صورتیں مختلف دکھائی دیتی ہوں۔ الا سب کی جڑ ایک ہی ہو گی۔

انسان میں یہ ایک فطری بات ہے۔ کہ وہ اپنے خیال کے موافق کسی چیز کو پسند کرتا ہے اور کسی کو ناپسند یا یوں کہو۔ کہ کسی چیز کو اچھا ٹھیراتا ہے اور کسی کو بُرا۔ اور اُسکی طبیعت اس طرف مائل ہے۔ کہ اُس بُری چیز کی حالت کو۔ ایسی حالت سے تبدیل کرلے جس کو وہ اچھا سمجھتا ہے۔ یہ ہی چیز سولزیشن کی جڑ ہے۔ جو انسان کے ہر گروہ میں اور ہر ایک میں پائی جاتی ہے۔ اسی تبادلہ کا نام سولزیشن یا تہذیب ہے۔ اور کچھ شبہ نہیں۔ کہ یہ میلان یا یہ خواہش مبادلہ انسان میں قدرتی ہے۔

سولزیشن یا تہذیب کی طرف انسان کی طبیعت کے مائل ہونے کے دو اصول ٹھیرے اچھا اور بُرا اور بُرے کو اچھا کرنا سولزیشن یا تہذیب ٹھیری۔ مگر اچھا

اور بُرا قرار دینے کے مختلف اسباب خلقی اور غیر خلقی ۔ ملکی اور تمدنی ایسے ہوتے ہیں جن کے سبب اچھا اور بُرا ٹھیراتے ہیں ۔ یا یوں کہو کہ قوموں کی سولزیشن میں اختلاف پڑ جاتا ہے ۔ ایک قوم جس بات کو اچھا سمجھتی ہے اور داخل تہذیب جانتی ہے ۔ دوسری قوم جس بات کو اچھا سمجھتی ہے اور داخل تہذیب جانتی ہے ۔ دوسری قوم اُسی بات کو بہت بُرا اور وحشیانہ حرکت قرار دیتی ہے یہ اختلاف سولزیشن کا قوموں کے باہم ہوتا ہے ۔ اشخاص میں نہیں ہوتا یا بہت ہی کم ہوتا ہے ۔

جب کہ ایک گروہ انسانوں کا کسی جگہ اکھٹا ہو کر بستا ہے ۔ تو اکثر اُن کی ضرورتیں اور اُن کی حاجتیں ۔ اُن کی غذائیں اور اُن کی پوشاکیں اُن کی معلومات اور اُن کے خیالات ۔ اُنکی مسرت کی باتیں ۔ اور اُن کی نفرت کی چیزیں سب یکساں ہوتی ہیں اور اسی لئے بُرائی اور اچھائی کے خیالات بھی یکساں پیدا ہوتے ہیں ۔ اور بُرائی کو اچھائی سے تبدیل کرنے کی خواہش سب میں ایک سی ہوتی ہے ۔ اور یہی مجموعی خواہش تبادلہ یا مجموعی خواہش سے وہ تبادلہ اُس قوم یا گروہ کی سولزیشن ہے مگر جبکہ مختلف گروہ مختلف مقامات میں بستے ہیں تو اُن کی حاجتیں اور خواہشیں بھی مختلف ہوتی ہیں ۔ اور اس سبب سے تہذیب کے خیالات بھی مختلف ہوتے ہیں مگر ضرور کوئی ایسی چیز بھی ہوگی کہ جو سولزیشن کی اُن مختلف حالتوں کا تصفیہ کر سکے ملکی حالتیں جہاں تک کہ وہ بود و باش سے تعلق رکھتی ہیں ۔ نہ فکر و خیال و دماغ سے ۔ اُن کو تہذیب سے چنداں تعلق نہیں بلکہ صرف انسان کے خیال کو اس سے تعلق ہے جس کے سبب وہ اچھا اور بُرا ٹھیراتا ہے ۔ اور جس کے باعث خواہش تبادلہ تحریک میں آتی ہے ۔ اور وہ تبادلہ واقع ہوتا ہے جو سولزیشن کہلاتا ہے ۔ پس

سولزیشن کی مختلف حالتوں کا فیصلہ اسباب کر سکتے ہیں۔ جن کے سبب سے اچھے اور برے کا خیال دل میں بیٹھتا ہے۔

خیال کی درستی اور پسند کی صحت کثرت معلومات اور علم طبیعات سے بخوبی ماہر ہونے پر منحصر ہے۔ انسان کی معلومات کو روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے اور اُس کے ساتھ ساتھ سولزیشن بھی بڑھتی ہے۔ کیا عجیب ہے؟ کہ آئندہ کوئی ایسا زمانہ آئے کہ انسان کی تہذیب میں ایسی ترقی ہو کہ اس زمانہ کی تہذیب کو بھی۔ لوگ ایسے ہی ٹھنڈے دل سے دیکھیں۔ جیسے کہ ہم اپنوں سے اگلوں کی تہذیب کو ایک ٹھنڈے مگر مودّب دل سے دیکھتے ہیں۔

تہذیب یا یوں کہو۔ کہ بُری حالت سے اچھی حالت میں لانا دنیا کی تمام چیزوں سے اخلاقی ہوں یا مادّی۔ یکساں تعلق رکھتا ہے۔ اور تمام انسانوں میں پایا جاتا ہے تکلیف سے بچنے اور آسائش حاصل کرنے کا سب کو یکساں خیال ہے ہنر اور اُس کو ترقی دینا تمام دنیا کی قوموں میں موجود ہے۔ ایک تربیت یافتہ قوم لعل جواہر۔ یاقوت والماس سے نہایت نفیس نفیس خوبصورت زیور بناتی ہے۔ ناتربیت یافتہ قوم بھی کوڑیوں اور پوتھوں سے اپنی آرائش کا سامان بہم پہونچاتی ہے۔ تربیت یافتہ قومیں اپنی آرائش میں سونے چاندی مونگے اور موتیوں کو کام میں لاتی ہیں ناتربیت یافتہ قومیں جانوروں کے خوبصورت اور رنگین پروں کو تیلیوں پر سے چھیلے ہوئے سنہری پوست اور زمرّد کے سے رنگ کی باریک اور خوشنما گھاس میں گوندھ کر اپنے تئیں آراستہ کرتی ہیں۔ تربیت یافتہ قوموں کو بھی اپنے لباس کی درستی کا خیال ہے ناتربیت یافتہ بھی اُس کی درستی پر مصروف ہیں۔ شاہی مکانات نہایت عمدہ اور

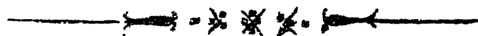
خالی شان بنتے ہیں۔ نفیس چیزوں سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ناتربیت یافتہ قوموں کے جھونپڑے اور ان کے رستے گھر بنے۔ درختوں پر باندھے ہوئے اور زمین میں کھودی ہوئی کھوئیں بھی تہذیب سے خالی نہیں۔ معاشرت کی چیزیں تمدن کے قاعدے عیش و عشرت کی مجلسیں خاطر و مدارات کے کام اخلاق و محبت کی علامتیں، دونوں میں پائی جاتی ہیں۔

علمی خیالات بھی، تربیت یافتہ قومیں خالی نہیں۔ بلکہ بعض چیزیں اُن میں زیادہ اصلی اور قدرتی طور سے دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً شاعری جو ایک نہایت عمدہ فن تربیت یافتہ قوموں میں ہے۔ ناتربیت یافتہ قوموں میں عجیب عمدگی خوبی سے پایا جاتا ہے۔ یہاں خیالی باتوں کو ادا کیا جاتا ہے۔ وہاں دلی جوشوں اور اندرونی جذبوں کا اظہار ہوتا ہے۔ موسیقی نے تربیت یافتہ قوموں میں نہایت ترقی پائی ہے مگر ناتربیت یافتہ قوموں میں بھی عجیب کیفیت دکھائی ہے۔ اُن کی ادا اور آواز کی پھرت، اُس کا گھٹاؤ اور اُس کا بڑھاؤ۔ اُس کا ٹھیراؤ اور اُس کی اُپج۔ ہاتھ کا بھاؤ اور پاؤں کی دھمک زیادہ تر مصنوعی قواعد کی پابند ہے۔ مگر ناتربیت یافتہ قوموں میں یہ سب چیزیں دلی جوش کی مدعیں ہیں۔ وہ لے اور تال اور راگ راگنی کو نہیں جانتے۔ مگر دل کی لہر اُن کی لے۔ اور دل کی پھڑک اُن کا تال ہے اُن کا غول باندھ کر کھڑا ہونا طبعی حرکت کے ساتھ اُچھلنا۔ دل کی بے تابی سے جھکنا اور پھر جوش میں آکر سیدھا ہو جانا۔ گو نزاکت اور فن خنیاگری سے خالی ہو۔ مگر قدرتی جذبوں کی ضرور تصویر ہے۔ دلی جذبوں کا روکنا اور ان کو عمدہ حالت میں رکھنا تمام قوموں کے خیالات میں شامل ہو۔ پس جس طرح ہم تہذیب کا قدرتی

لگاؤ تمام انسانوں میں پاتے ہیں۔ اسی طرح اس کا تعلق عقلی اور مادی سب چیزوں میں دیکھتے ہیں۔ جس چیز میں ترقی یعنی برائی سے اچھائی کی طرف رجوع یا ادنیٰ سے اعلیٰ درجہ کی طرف تحریک ہو سکتی ہے اسی سے تہذیب کا تعلق ہے

پس سولزیشن یا تہذیب کیا ہے؟ انسان کے افعال ارادی اور جذبات نفسانی کو اعتدال پر رکھنا۔ وقت کو عزیز سمجھنا۔ واقعات کے اسباب کو ڈھونڈنا اور ان کو ایک سلسلہ میں لانا اخلاق، معاملات، معاشرت، تمدن اور علوم و فنون کو بقدر امکان قدرتی خوبی اور فطری عمدگی پر پہونچانا۔ اور ان سب کو خوش اسلوبی سے برتنا۔ اس کا نتیجہ کیا ہے؟ روحانی خوشی جسمانی خوبی۔ اصلی تمکین حقیقی وقار اور خود اپنی عزت کی عزت اور در حقیقت یہی پچھلی ایک بات ہے جس سے وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز ہوتی ہے۔

(سید احمد خاں)



زبانِ گویا

اے میری بلبلِ ہزار داستان! اے میری طوطیٔ شیوا بیان! اے میری قاصد! اے میری ترجمان! اے میری وکیل! اے میری زبان۔ سچ بتا۔ تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے۔ کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جُدا اور تیرے ہر پھل میں ایک نیا مزا ہے۔ کبھی تو ایک ساحر فسوں ساز ہے جس کے سحر کا رد۔ نہ جادو کا اُتار۔ کبھی تو ایک ہی جان گداز ہے۔ جس کے زہر کی دارو نہ کاٹے کا منتر۔ تو وہی زبان ہے۔ کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی۔ اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دُکھاتی تھی۔ تو وہی زبان ہے۔ کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کا شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی۔

اے میری زبان دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن کر دکھانا تیرا ایک کھیل ہے۔ جس کے تماشے سینکڑوں دیکھے اور ہزاروں دیکھنے باقی ہیں۔

اے میری بنی بات کی بگاڑنے والی! اور میرے بگڑے کاموں کی سنوارنے والی۔ روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رُلانا۔ روٹھے کو منانا اور بگڑے کو بنانا نہیں معلوم تو نے کہاں سیکھا؟ اور کس سے سیکھا؟ کہیں تیری باتیں بس کی گانٹھیں ہیں۔ اور کہیں تیرے بول شربت کے گھونٹ ہیں۔ کہیں تو شہد ہے اور کہیں حنظل۔ کہیں تو زہر ہلاہل کہیں تریاق۔

اے زبان ہمارے بہت سے آرام اور بہت سی تکلیفیں۔ ہمارے ہزاروں

نقصان اور ہزاروں فائدے۔ ہماری عزت، ہماری ذلت، ہماری نیک نامی، ہماری بدنامی۔ ہمارا جھوٹ۔ ہمارا سچ۔ تیری ایک ہاں اور ایک نہیں پر موقوف ہے۔ تیری اس "ہاں" اور "نہیں" نے کروڑوں کی جانیں بچائیں۔ اور لاکھوں کا سر کٹوایا۔

اے زبان! تو دیکھنے میں تو ایک پارۂ گوشت کے سوا نہیں۔ مگر طاقت تیری نمونۂ قدرت الٰہی ہے۔ دیکھ۔ اس طاقت کو رائیگاں نہ کھو۔ اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا۔ راستی تیرا جوہر ہے۔ اور آزادی تیرا زیور۔ دیکھ اس جوہر کو برباد نہ کر۔ اور اس زیور کو زنگ نہ لگا۔ تو دل کی امین ہے۔ اور روح کی ایلچی۔ دیکھ دل کی امانت میں خیانت نہ کر۔ اور روح کے پیغام پر حاشیے نہ چڑھا۔

اے زبان! تیرا منصب بہت عالی ہے۔ اور تیری خدمت نہایت ممتاز کہیں تیرا خطاب کاشفِ اسرار ہے۔ اور کہیں تیرا لقب محرمِ راز۔ علم ایک خزانۂ غیبی ہے۔ اور دل اس کا خزانچی۔ حوصلہ اس کا قفل ہے۔ اور تو اس کی کنجی۔ دیکھ اس قفل کو بے اجازت نہ کھول اور اس خزانے کو بے موقع نہ اٹھا۔ وعظ و نصیحت تیرا فرض ہے اور تلقین و ارشاد تیرا کام۔ ناصح مشفق تیری صفت ہے۔ اور مرشد برحق تیرا نام خبردار! اس نام کو عیب نہ لگانا۔ اور اس فرض سے جی نہ چرانا۔ ورنہ یہ منصب عالی تجھ سے چھن جائیگا۔ اور تیری بساط میں وہی ایک گوشت کا چھچھڑا رہ جائیگا۔ کیا تجھ کو یہ اُمید ہے۔ کہ تو جھوٹ بھی بولے اور طوفان بھی اُٹھائے۔ تو غیبت بھی کرے۔ اور تہمت لگائے۔ تو فریب بھی دے۔ اور چغلیاں کھائے اور پھر وہی زبان کی زبان کہلائے نہیں! ہرگز نہیں!! اگر تو سچی زبان ہے۔ تو زبان ہے۔ ورنہ زبون ہے۔ بلکہ سراسر زیان ہے اگر تیرا قول صادق ہے۔ تو شہد فائق ہے۔ ورنہ تھوک دینے کے لائق ہے۔ اگر

تو راست گفتار رہے۔ تو ہمارے منہ میں اور دوسروں کے دلوں میں جگہ پائے گی ورنہ گدی سے کھینچ کر نکالی جائے گی۔

اے زبان جنھوں نے تیرا کہنا مانا۔ اور جو تیرا حکم بجا لائے۔ انھوں نے سخت الزام اٹھائے اور بہت پچھتائے۔ کسی نے انھیں فریبی اور مکار کہا کسی نے گستاخ اور منہ پھٹ ان کا نام رکھا۔ کسی نے ریاکار ٹھیرایا۔ اور کسی نے سخن ساز کسی نے بدعہد بنایا اور کسی نے غماز۔ غیبت اور بہتان مکر اور افترا۔ طعن اور تشنیع۔ گالی اور دشنام جھگڑا اور ضلع جگت اور پھبتی۔ غرض دنیا بھر کے عیب ان میں نکلے۔ اور وہ سب کے سزاوار ٹھیرے۔

اے زبان یاد رکھ۔ ہم تیرا کہنا نہ مانیں گے۔ اور تیرے قابو میں ہرگز نہ آئینگے۔ ہم تیری ڈور ڈھیلی نہ چھوڑینگے اور تجھے مطلق العنان نہ بنائیں گے۔ ہم جان پر کھیلیں گے پر تجھ سے جھوٹ نہ بلوائیں گے۔ ہم سر کے بدلے ناک نہ کٹوائیں گے۔

اے زبان ہم دیکھتے ہیں۔ کہ گھوڑا جب اپنے آقا کو دیکھکر محبت کے جوش میں آتا ہے تو بے اختیار ہنہناتا ہے۔ اور کتا جب پیار کے مارے بیتاب ہو جاتا ہے تو اپنے مالک کے سامنے دُم ہلاتا ہے۔ سبحان اللہ! وہ نام کے جانور۔ اور ان کا ظاہر باطن یکساں ہم نام کے آدمی اور ہمارے دل میں "نہیں" اور زبان پر "ہاں"۔

الٰہی! اگر ہم کو رخصتِ گفتار ہے۔ تو زبانِ راست گفتار دے۔ اور اگر دل تجھ کو اختیار ہے۔ تو زبان پر ہم کو اختیار دے۔ جب تک دنیا میں رہیں سچے کہلائیں اور جب تیرے دربار میں آئیں تو سچے بن کر آئیں۔

(حالی)

کارخانۂ قدرت

کسی کتاب میں نظر سے گزرا کہ زمانۂ حال کا کوئی فلسفی خوردبین میں پانی کی ایک بوند کو دیکھ رہا تھا۔ سو سے زیادہ طرح کے جاندار تو وہ اس ایک بوند میں مشکل شمار کر سکا آخر تھک کر بیٹھ رہا۔ ایک بوند میں اتنی مخلوقات ہو تو تمام کرۂ آب میں جو زمین چوتھائی زمین کو ڈھانکے ہوئے ہے۔ کتنی مخلوقات ہوگی؟ خدا ہی کو خبر ہے۔ پھر زمین کے گرداگرد ۴۵ میل کے دَل کا ہوائی کُرہ ہے۔ اور اس میں بھی جان داروں کی ایسی ہی یا اس سے زیادہ) کثرت ہے۔

ہر چند کارخانۂ قدرت الٰہی کی عظمت و شان فہم بشر سے خارج ہے مگر جس طریق پر میں نے اجمالاً بیان کیا۔ اگر کوئی آدمی متواتر اور متصل مدتوں تک غور کرتا رہے تو ضرور اس کے دل میں اپنی بے حقیقتی اور درماندگی اور بے وقعتی کا یقین پیدا ہوگا جس کو میں دینداری کی بنیاد یا تمہید سمجھتا ہوں۔ اس کے بعد ذہن کو اس طرف متوجہ کرنا چاہیئے۔ کہ اتنا بڑا کارخانہ با ایں عظمت کیسی عمدگی اور کیسے انضباط کے ساتھ چل رہا ہے۔ کہ عقل دنگ ہوتی ہے۔ اجرام فلکی کے اتنے اتنے بڑے بیشمار گولے۔ کہ خدا کی پناہ اور خود زمین سب چکر میں ہیں۔ خدا جانے کب سے؟ اور کیوں اور کب تک؟ اور نہ آپس میں ٹکراتے ہیں۔ اور نہ بال برابر اپنی رفتار بدلتے ہیں اب جو آدمیوں کو قاعدہ معلوم ہو گیا ہے۔ تو سینکڑوں ہزاروں برس پہلے سے پیشین گوئی ہو سکتی ہے۔ کہ فلاں ستارہ فلاں وقت فلاں مقام پر ہوگا۔ اور دنیا

سے حساب میں اگر غلطی نہ ہو۔ تو منٹ اور سکنڈ کیا! سکنڈ کے ہزارویں حصّے کی قدر بھی آنکا بچھا نہیں ہو سکتا۔

یہاں دو بڑ زمین پر ایک بھنگے ایک دانے ایک پھل ایک پنکھڑی گھاس کے ایک ڈنٹھل چھوٹی سے چھوٹی اور ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کو بھی نظر غور سے دیکھو۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز کی کچھ نہ کچھ غرض و غایت ہے۔ جس کی تکمیل کا پورا پورا سامان اُس چیز میں موجود ہے۔ مثلاً ریگستانی علاقوں میں اونٹ پیدا کیا گیا ہے تو اُس کے پاؤں کے تلوے چوڑے اور اسفنج کی طرح پولے ہیں کہ ریت میں نہ دھنسیں اس کی گردن بہت لمبی ہے تاکہ اونچے درختوں کے پتے چر سکے۔ اُس کو ایک خاص طرح کا خانہ دار معدہ دیا گیا ہے۔ جس میں کئی کئی ہفتوں کے لئے کھانا پانی بھر لیتا ہے۔ کیونکہ جیسے ملک میں وہ پیدا کیا گیا ہے، وہاں کئی کئی دن تک متواتر پانی چارے کا نہ ملنا کچھ تعجب نہیں۔ اس کے علاوہ اُس کے پاس کوہان کا گودام ہے۔ کہ اگر اُس کو ایک عرصۂ خاص تک کھانا پینا کچھ بھی نہ ملے۔ تو کوہان کی چربی بدل ما یتحلل کا کام دے۔ ہرن وغیرہ جنگلی جانوروں کی ٹانگیں پتلی پتلی ہیں تاکہ شکاری جانوروں سے بچنے کے لئے پھرتی سے بھاگ سکیں۔ ہاتھی کے ایک سونڈ لٹک رہی ہے۔ جس سے وہ ہاتھ کا کام لیتا ہے۔ پرندوں کے چھتے سبک ہیں تاکہ ہوا میں اُڑ سکیں دریائی جانوروں کے بچنے کھال سے جڑے ہوئے ہیں۔ گویا کہ ہر ایک کے پاس قدرتی چپو ہیں۔ گوشت خوار جانوروں کے پنجے اور دانت اُنکی غذا کے مناسب ہیں۔ نباتات میں پھل پھول کی حفاظت کیواسطے کانٹے ہیں۔ پوست ہیں، خول ہیں۔ سرد ملک کے جانوروں کی اُون بڑی بڑی اور گھنی ہے۔ کہ جاڑا نہ کھائیں۔ جتنے جاندار معرضِ تلف میں ہیں

اُن میں توالد و تناسل کی کثرت ہے تاکہ نسل معدوم نہ ہو۔ مثلاً ایک ایک مچھلی لاکھوں سے زیادہ انڈے دیتی ہے۔ آدمی چونکہ ابقائے حیات کا سامان عقل کی مدد سے بہم پہونچا سکتا ہے۔ سینگ اور پنجے اور ناخن۔ اس قسم کے سامان قدرتی اسکو نہیں دئے گئے۔ جس ملک میں نباتات کی کثرت ہے وہیں برسات بھی زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ملک پانی کا محتاج ہے۔ انسان اگر اپنی ہی بناوٹ پہ غور کرے۔ تو اُس کا ایک ایک رونگٹا صانع قدرت کی کمال دانشمندی اور عنایت پر گواہی دے رہا ہے۔ اس کے جسم میں ایک چھوٹا اور آسمان سا پرزہ ہاتھ ہے۔ کہ دنیا میں جس قدر انسان کے تصرفات ہیں اور انسان کی بساط پر خیال کرو۔ تو ان تصرفات کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے سب اُسی پرزے کے ہیں۔ اہل یورپ نے عقل کے زور سے بڑی بڑی عمدہ کلیں بنائی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کلوں سے عقل انسانی کی قوت بڑی شد و مد کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ مگر مجھ کو بھی دو چار کلوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ایک بکھیڑا ہے۔ کہ بیگھوں زمین پر پھیلا ہے۔ سینکڑوں پرزے ہزاروں پیچ، بیلن پہیے، چرخیاں، کمانیاں، خدا جانے دنیا بھر کے کیا کیا سامان جمع کئے ہیں۔ تب کہیں جا کر وہ ایک مطلب حاصل ہوتا ہے۔ جس کے لئے کل بنائی گئی ہے۔ یہ تو آدمی کی بنائی ہوئی کلوں کا حال ہے۔ اور ایک ادنیٰ سی کل خدا کی ہوئی ہے۔ یہی آدمی کا ہاتھ۔ کہ ہزاروں قسم کے کام اس سے نکلتے ہیں۔ اور ترکیب دیکھو تو ایسی سلیس اور مختصر کہ ایک کف دست ہے۔ اور تین تین جوڑ کی پانچ انگلیاں۔ اللہ اللہ خیر صلاح!

انسان کے بدن میں ایک اور ذرے بھر کی چیز آنکھ ہے۔ اس کی ساخت میں جو اندرونی حکمتیں ہیں۔ اُن سے بالاستیعاب ایک کتاب بن سکتی ہے۔ مگر خارج کی

احتیاطوں کو تو دیکھو۔ کہ پہلے گویا ہڈیوں کا کاواک ہے۔ جس میں نگینے کی طرح آنکھ
تعبیہ کی ہوئی ہے۔ اوپر بھوؤں کا چھجے دار سائبان، سامنے پپوٹوں کا پردہ، پردے
میں پلکوں کی جھالر۔ پھر پپوٹے کے اندر منافذ ہیں۔ جن میں سے آئینۂ چشم کے
صاف رکھنے کو ہمیشہ ایک خاص طرح کی رطوبت رِستی رہتی ہے۔ یہ وہی رطوبت ہے
جو زیادہ ہو کر آنسو بن جاتی ہے۔ جتنی دفعہ انسان پلک جھپکاتا ہے گویا اُتنی ہی دفعہ
اُس نے پوچا پھیرا ہے۔ گرد اور دھوئیں اور کنک کی صورت میں بے اختیار آنسو بہنے لگتے
ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ بچارا کافی نہیں بلکہ آئینہ کو دھونے کی ضرورت ہے۔
میرا تو کیا منہ ہے کہ موجوداتِ عالم میں جو اسرارِ حکمت مضمر ہیں اُن کا ایک کرشمہ
بھی بیان کر سکوں۔ مگر میری غرض اسی قدر ہے کہ دنیا کے کارخانے کو اس نظر
سے دیکھنا چاہیے کل میں نے آیت اللہ کا سبق سنا۔ وہ عجائب قدرت پڑھنا ہے
کسی شخص نے نیچرل فلاسفی میں سے بعض بعض مضامین چھانٹ کر اردو میں ترجمہ
کر دیئے ہیں۔ اسی میں لکھا تھا کہ مچھر کے منہ کے آگے جو ایک پتلی سونڈ سی ہوتی ہے وہ
حقیقت میں ایک نلوا ہے۔ اُس نلوے میں تین اوزار۔ ایک تو سوئی جس کو مچھر مسام میں
داخل کرتا ہے۔ ایک آری کہ مسام کو چوڑا کرنے کی ضرورت ہو تو اُس سے کام لے
اور ایک سینگی جس کی راہ خون چوستا ہے۔ اُس میں اتنی بات اور بھی تھی کہ اس
شکل خاص میں مچھر کی مدت حیات صرف تین دن کی ہے۔ ایک مقام پر تھا۔ کہ تیتری
کے ایک پر میں کھپروں کی طرح تیس ہزار ڈولیاں ہوتی ہیں۔ اس طرح کی باتوں کو اگر
انسان سرسری طور پر نہ سنے جیسی کہ اُس کی عادت ہے تو ہر ہر ذرہ اس بات کی گواہی
دیگا۔ کہ اُس کو کسی بڑے قدرت والے دانشمند، ہمہ دان، حاضر، ناظر، سمیع و بصیر نے

کسی مصلحت سے جان بوجھ کر بنایا ہے۔ ممکن نہیں کہ انسان صمیم قلب سے موجوداتِ عالم میں غور اور خوض کرے اور اس کا دل اندر سے نہ بولنے لگے کہ یہ اتنا بڑا کارخانہ بایں عمدگی و انضباط خود بخود یا اتفاقیہ طور پر تو نہیں ہو گیا۔ کیونکہ واقعاتِ اتفاقی کی شان ہی دوسری ہوتی ہے۔ اُن میں قاعدہ کا کہاں پتا۔ اور انضباط کا کیا مذکور۔ اور قاعدہ انضباط بھی کیسا؟ کہ دنیا کی ابتدا سے لے کر آج کی گھڑی تک تو اس میں رتی برابر فرق نہیں پڑا۔

(نذیر احمد)



میر انیس کی شاعری کی خصوصیات

"فصاحت"

علمائے ادب نے فصاحت کی یہ تعریف کی ہے کہ لفظ میں جو حروف آئیں اُن میں تنافر نہ ہو۔ الفاظ نامانوس نہ ہوں۔ قواعدِ صرفی کے خلاف نہ ہو۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ لفظ درحقیقت ایک قسم کی آواز ہے۔ اور چونکہ آوازیں بعض شیریں دل آویز اور لطیف ہوتی ہیں مثلاً طوطی اور بلبل کی آواز۔ اور بعض کروہ اور ناگوار مثلاً کوے اور گدھے کی آواز اس بنا پر الفاظ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں بعض شستہ سبک شیریں اور بعض ثقیل اور بھدے ناگوار پہلی قسم کے الفاظ کو فصیح کہتے ہیں اور دوسری کو غیر فصیح۔ بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں فی نفسہٖ ثقیل و مکروہ نہیں ہوتے لیکن تحریر و تقریر میں اُن کا استعمال نہیں ہوا ہے۔ یا بہت کم ہوا ہے۔ اس قسم کے الفاظ بھی جب یکا یک ابتداءً استعمال کئے جاتے ہیں تو کانوں کو ناگوار معلوم ہوتے ہیں۔ ان کو فنِ بلاغت کی اصطلاح میں غریب کہتے ہیں۔ اور اس قسم کے الفاظ بھی فصاحت میں خلل انداز خیال کئے جاتے ہیں۔

میر انیس کی کمالِ شاعری کا بڑا جوہر یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ اُنھوں نے اُردو شعراء میں سب سے زیادہ الفاظ استعمال کئے اور سینکڑوں مختلف واقعات بیان کرنے کی وجہ سے ہر قسم اور ہر درجہ کے الفاظ ان کو استعمال کرنے پڑے تاہم

اُن کے تمام کلام میں غیر فصیح الفاظ نہایت کم پائے جاتے ہیں۔ اکثر جگہ عربی فارسی کے الفاظ جو اُردو زبان میں کم مستعمل ہیں ضرورت سے لانے پڑتے ہیں۔ لیکن اس قسم کے الفاظ جہاں آئے ہیں۔ فارسی ترکیبوں کے ساتھ آئے ہیں۔ جس سے ان کی غرابت کم ہو گئی ہے۔ ورنہ اگر اُردو کی خاص ترکیب میں اُن الفاظ کا استعمال کیا جاتا تو بالکل خلافِ فصاحت ہوتا۔ مثلاً انگشتری، خاتم، رخ، بادہ، تمنا، حُسن، اور اس قسم کے سینکڑوں ہزاروں الفاظ ہیں۔ جو بجائے خود فصیح ہیں، لیکن ٹھیٹ اُردو میں ان کا استعمال نہیں ہوتا میر ضمیر ایک موقع پر کہتے ہیں۔ ع "ذرّیتِ رسولؐ کی خاطر جلا لی نار" نار کا لفظ اس موقع پر نہایت نامانوس اور بیگانہ ہے لیکن یہی لفظ جب فارسی ترکیبوں کے ساتھ اُردو میں مستعمل ہوتا ہے مثلاً نارِ دوزخ، نارِ جہنّم تو وہ غرابت نہیں رہتی، فصاحت کے مدارج مختلف ہے بعض الفاظ فصیح ہیں بعض فصیح تر بعض اُس سے بھی فصیح تر میر انیس صاحب کے کلام کا بڑا خاصہ یہ ہے کہ وہ ہر موقع پر فصیح سے فصیح الفاظ ڈھونڈھ کر لاتے ہیں مرزا دبیر اور میر انیس کے ہم مضمون اشعار لو۔ اگر مرزا صاحب کے یہاں غریب اور ثقیل الفاظ ہوں گے تو اُن کے مقابلہ میں میر صاحب کے یہاں فصیح الفاظ ہوں گے اگر مرزا صاحب کے یہاں فصیح الفاظ ہونگے تو میر صاحب کے یہاں فصیح تر ہونگے۔

مرزا دبیر کی تخصیص نہیں، تمام مرثیہ گویوں کے مقابلہ میں میر انیس صاحب کے کلام کا یہی حال ہے

ہم مثال کے طور پر دو چار شعر نقل کرتے ہیں۔ جن سے فصاحت اور فصاحت کے اختلافِ مراتب کا اندازہ ہو سکے گا۔

مرزا دبیر "کس نے نہ دی انگوٹھی رکوع و سجود میں"

میر انیس:- "سائل کو کس نے دی ہے انگوٹھی نماز میں"

مرزا دبیر:- "آنکھوں میں پھرے اور نہ مردم کو خبر ہو"

میر انیس:- "آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو"

مرزا دبیر:- "رویا میں جو حسینؑ کو رویا ہی کرتے ہیں"

میر انیس:- "حسرت یہ ہے کہ خواب میں بھی رو دیا کیجیے"

مرزا دبیر:- "جیسے مکاں سے زلزلہ میں صاحب مکان"

میر انیس:- "جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے"

"ابتذال"

فصاحت کے متعلق ایک بڑا دھوکا یہ ہوتا ہے کہ چونکہ فصاحت کے یہ معنی ہیں کہ لفظ سادہ آسان کثیر الاستعمال ہو۔ اس لئے لوگ مبتذل اور سوقی الفاظ کو بھی فصیح سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ ان دونوں میں سفید و سیاہ کا فرق ہے **مرزا دبیر** صاحب جہاں واقعہ نگاری اور معاملہ بندی میں **میر انیس** کی تقلید کرتے ہیں۔ اکثر اُن کے کلام میں مبتذل الفاظ آجاتے ہیں۔ مثلاً جہاں **حضرت شہر بانو** نے **حضرت عباسؓ** کی لاش پر نوحہ کیا ہے۔ **حضرت شہر بانوؓ** کی زبان سے فرماتے ہیں۔ ع

"ہے ہے مرے دیور مرے دیور مرے دیور"

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ع

"ناڑہ نواُن کی سال گرہ کا نکال لا"

ابتذال کی صاف اور بیّن مثال **نظیر اکبر آبادی** کا کلام ہے۔ اگرچہ مبتذل نہ ہوتا

تو سادگی اور صفائی میں نظیرؔ کا کلام میر انیسؔ یا میر تقیؔ سے ٹکر کھاتا۔
ابتذال کے معنی عام طور پر یہ سمجھے جاتے ہیں کہ جو الفاظ عام لوگ استعمال کرتے ہیں۔ وہ مبتذل ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں سیکڑوں الفاظ عوام کے مخصوص الفاظ ہیں لیکن سب میں ابتذال نہیں پایا جاتا۔ ابتذال کا معیار مذاقِ صحیح کے سوا کوئی چیز نہیں۔ مذاقِ صحیح خود بتا دیتا ہے۔ کہ یہ لفظ مبتذل اور پست اور سوقیانہ ہے۔

"کلام کی فصاحت"

یہ بحث مفرد الفاظ سے متعلق تھی لیکن کلام کی فصاحت میں صرف لفظ کا فصیح ہونا کافی نہیں۔ بلکہ یہ بھی ضرور ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئے اُنکی ساخت ہیئت نشست سُبکی اور گرانی کے ساتھ اُسکو خاص تناسب اور توازن ہو ورنہ فصاحت قائم نہ رہے گی۔ میر انیسؔ کا مصرع ہے۔ ع

"فرمایا آدمی ہے کہ صحرا کا جانور"

صحرا اور جنگل ہم معنی ہیں اور دونوں فصیح ہیں۔ میر انیسؔ نے جابجا ان دونوں لفظوں کو استعمال کیا ہے۔ اور ہم معنی ہونیکی حیثیت سے کیا ہے۔ لیکن اگر اس مصرع میں صحرا کے بجائے جنگل کا لفظ استعمال کیا جائے تو یہی لفظ غیر فصیح ہو جائیگا میر صاحب کا ایک شعر ہے ؎۔

طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

یہاں جنگل کے بجائے صحرا لاؤ تو مصرعہ پھس پھسا ہو جاتا ہے۔
شبنم اور اوس ہم معنی ہیں اور برابر درجہ کے فصیح ہیں۔ لیکن میر صاحب کے اس شعر میں ؎

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا ۔۔۔ تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

اگر اوس کے بجائے شبنم کا لفظ لایا جائے تو فصاحت خاک میں مل جائیگی۔ لیکن یہی اوس کا لفظ جو اس موقع پر اس قدر فصیح ہے اس مصرعہ میں ع

"شبنم نے بھر دئے تھے کٹورے گلاب کے"

شبنم کے بجائے اوس لاؤ تو فصاحت بالکل ہوا ہو جائے گی۔

اس میں نکتہ یہ ہے کہ ہر لفظ چونکہ ایک قسم کا سُر ہے اس لئے یہ ضرور ہے کہ جن الفاظ کے سلسلہ میں وہ ترکیب دیا جائے ان آوازوں سے اُس کو خاص تناسب بھی ہو ورنہ گویا دو مخالف سُروں کو ترکیب دینا ہوگا۔ نغمہ اور راگ مفرد آوازوں یا سُروں کا نام ہے ہر سُر بجائے خود دلکش اور دل آویز ہے لیکن اگر وہ مخالف سُروں کو باہم ترتیب دیا جائے تو دونوں مکروہ ہو جائیں گے۔

راگ کے دلکش اور موثر ہونے کا گُر یہی ہے کہ جن سُروں سے اُس کی ترکیب ہو اُن میں نہایت تناسب و توازن ہو الفاظ بھی چونکہ ایک قسم کی صورت و سُر ہیں۔ اس لئے اُنکی لطافت شیرینی اور روانی اُسی وقت تک قائم رہتی ہے جب تک گرد و پیش کے الفاظ بھی لَے میں ان کے مناسب ہوں۔

مرزا دبیر صاحب کا مشہور مصرعہ ہے ع

"زیرِ قدمِ والدہ فردوسِ بریں ہے"

اس میں جتنے الفاظ ہیں یعنی زیر، قدم، والدہ، فردوس، بریں سب بجائے خود فصیح ہیں لیکن اُن کے باہم ترکیب دینے سے جو مصرعہ پیدا ہوتا ہے وہ اس قدر بھدا اور گراں ہے کہ زبان اس کا تحمل نہیں کر سکتی شاید تم کو خیال ہو کہ مصرعہ کی ترکیب

چونکہ فارسی ہوگئی ہے اسلئے ثقل پیدا ہوگیا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں سیکڑوں شعروں میں اس قسم کی فارسی ترکیبیں ہیں لیکن یہ ثقل نہیں پایا جاتا مثلاً میر انیس صاحب کہتے ہیں کہ ؎

میں ہوں سردارِ شبابِ چمنِ خلدِ بریں ‌ ‌ ‌ ‌ میں ہوں خالق کی قسم دینِ محمدؐ کا نگیں

پہلے مصرعہ میں فارسی ترکیب کے علاوہ تین اضافتیں بھی موجود ہیں لیکن یہ بھدا پن اور ثقل پیدا نہیں جب کسی مصرعہ یا شعر کے تمام الفاظ میں ایک خاص قسم کا تناسب، توازن، توافق پایا جاتا ہے اُس کے ساتھ وہ تمام الفاظ بجائے خود بھی فصیح ہوتے ہیں تو وہ پورا مصرعہ یا شعر فصیح کہا جاتا ہے اور یہی چیز ہے جسکو بندش کی صفائی، نشست کی خوبی، ترکیب کی دلآویزی، برجستگی، سلاست اور روانی سے تعبیر کرتے ہیں الفاظ کے توازن اور تناسب سے کلام میں جو فرق پیدا ہو جاتا ہے وہ ایک خاص مثال میں آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے میر انیس حضرت علی اکبرؓ کے اذان دینے کی تعریف میں ایک موقع پر اس طرح ادا کرتے ہیں۔ ع "تھا بلبلِ حق گو کہ چہکتا تھا چمن میں"

اسی مضمون کو میر صاحب دوسرے موقع پر اس طرح ادا کرتے ہیں۔ ع

"بلبل چہک رہا تھا ریاضِ رسولؐ میں"

وہی مضمون ہے وہی الفاظ ہیں لیکن ترکیب کی ساخت نے دونوں شعروں میں کسقدر فرق پیدا کر دیا ہے میر انیس کا تمام کلام اس خوبی سے معمور ہے اور اُن کا ہر شعر اس وصف کا مصداق ہے نمونہ کے طور پر ہم چند اشعار اس موقع پر نقل کرتے ہیں ؎

تعریف میں چشمہ کو سمندر سے ملا دوں ‌ ‌ ‌ ‌ قطرہ کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں
ذرّہ کی چمک مہرِ منوّر سے ملا دوں ‌ ‌ ‌ ‌ کانٹوں کی نزاکت میں گلِ تر سے ملا دوں
گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں ‌ ‌ ‌ ‌ اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

تھا فوج قاہرہ میں تلاطم کہ الحذر — تھیں موج کی طرح سے ادھر کی صفیں ادھر
چکر میں تھی سپاہ کہ گردش میں تھا بھنور — بدلی میں تھے نہنگ اُبھرتے نہ تھے مگر
فوجیں فقط نہ بھاگی تھیں منہ توڑ توڑ کے — دریا بھی ہٹ گیا تھا کنارے کو چھوڑ کے

چھایا تھا سب پہ رعب علمدار نوجوان — تسلیم کو جھکے ہوئے تھے فوج کے نشاں
گوشہ اماں کا ڈھونڈھ رہی تھی ہر اک کماں — ترکش بھی تھے بغل میں سمٹ کے لیے ہوئے بان
تیروں کا لبِ کماں تھا ارادہ گریز کا — منہ کند ہو گیا تھا ہر اک تیغ تیز کا

"کلام کی اصلی ترتیب کا قائم رہنا"

ترکیب الفاظ کے لحاظ سے شعر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ کلام کے اجزا کی جو اصلی ترتیب ہو وہ بحالِ خود قائم رہے۔ مثلاً فاعل، مفعول، مبتدا، خبر، متعلقات فعل جس ترتیب کے ساتھ ہر وقت بول چال میں آتے ہیں وہی شعر میں بھی قائم رہے۔ اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ شعر میں اس ترتیب کا بعینہٖ قائم رہنا قریب قریب ناممکن ہے صرف ایک آدھ شعر یا بہت سے بہت دو شعر میں اتفاقیہ یہ بات پیدا ہو جاتی ہے لیکن چونکہ نظم کا درحقیقت سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ اگر اس کو نثر کرنا چاہیں تو نہ ہو سکے۔ اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب شعر میں الفاظ کی وہی ترتیب باقی رہے جو نثر میں معمولاً ہوا کرتی ہے اس بنا پر شاعر کو کوشش کرنی چاہیے کہ اگر اصلی ترتیب پوری پوری قائم نہیں رہ سکتی تو بہرحال اس کے قریب قریب پہنچ جائے جس قدر اس کا لحاظ رکھا جائیگا۔ اسی قدر شعر زیادہ صاف اور رواں اور ڈھلا ہوا ہوگا اور اردو میں جہاں تک ہم کو معلوم ہے یہ صفت میر انیس صاحب سے زیادہ کسی کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔

"روزمرّہ اور محاورہ"

جو الفاظ اور خاص ترکیبیں اہلِ زبان کی بول چال میں زیادہ مستعمل اور متداول ہوتی ہیں۔ اُن کو روزمرّہ کہتے ہیں۔ روزمرّہ اگرچہ ایک جداگانہ وصف سمجھا جاتا ہے لیکن درحقیقت وہ فصاحت ہی کا ایک فردِ خاص ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ عام بول چال میں وہی الفاظ زبان پر آئیں گے جو سادہ صاف اور سہل الادا ہوں، اور اُن میں کچھ ثقل یا درگرانی ہو تو رات دن کے بول چال اور کثرتِ استعمال سے وہ منجھ کر صاف ہو جاتے ہیں۔ روزمرّہ کے لئے فصیح ہونا لازم ہے۔

میر انیس کے کلام میں نہایت کثرت سے روزمرّہ اور محاورہ کا استعمال پایا جاتا ہے۔ اور اس پر اُن کو ناز بھی تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

مرغانِ خوش لحانِ چمن بولیں کیا
مر جاتے ہیں سُن کے روزمرّہ میرا

"حسنِ کلام"

حُسنِ کلام کا ایک بڑا نکتہ یہ ہے کہ مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ استعمال کئے جائیں۔ لفظ چونکہ آواز کی ایک قسم ہے اور آواز کے مختلف اقسام ہیں مہیب پُر رعب سخت، نرم، شیریں، لطیف اسی طرح الفاظ بھی صورت اور وزن کے لحاظ سے مختلف طرح کے ہوتے ہیں، بعض نرم، شیریں اور لطیف ہوتے ہیں بعض سے جلالت اور شان ٹپکتی ہے بعض سے درد اور غمگینی ظاہر ہوتی ہے۔ اسی بنا پر غزل میں سادہ شیریں سہل اور لطیف الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں قصیدہ میں زوردار اور شاندار الفاظ کا استعمال

پسندیدہ سمجھا جاتا ہے اسی طرح رزم، بزم، مدح، ذم، فخر و ادعا، وعظ و پند، ہر ایک کے لئے جدا جدا الفاظ ہیں شعراء میں سے جو اس نکتہ سے آشنا ہیں۔ وہ ان مراتب کا لحاظ رکھتے ہیں۔ اور یہ اُن کے کلام کی تاثیر کا بڑا جوہر ہے لیکن جو اس فرق مراتب سے واقف نہیں، یا ہیں لیکن ایک خاص رنگ اُن پر چڑھ گیا ہے کہ ہر قسم کے مضامین میں ایک ہی قسم کے الفاظ اُن کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ اُن کا کلام بجز ایک خاص رنگ کے بالکل بے اثر ہوتا ہے۔ یہی نکتہ ہے کہ سعدی سے رزم اور فردوسی سے بزم نہیں ہو سکی۔

میر انیس صاحب نے رزم، بزم، فخر، ہجو، نوحہ سب کچھ لکھا ہے۔ لیکن جہاں جس قسم کا موقع ہوتا ہے۔ اُسی قسم کے الفاظ اُن کے قلم سے نکلتے ہیں۔ رزمیہ فخریہ لکھتے ہیں تو فرماتے ہیں ؎

طاقت اگر دکھاؤں رسالتؐ مآب کی ‎ ‎ ‎ رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب

جلال و غیظ کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں ؎

کم تھا نہ ہمہمہ اسدِ کردگار سے ‎ ‎ ‎ نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے

کیا جانے کس نے روک دیا ہے دلیر کو ‎ ‎ ‎ سیدشت گو بخا ہے یہ غصہ ہے شیر کو

دیکھو! ان اشعار میں جو الفاظ آئے ہیں جس طرح اُن کے مفہوم میں غیظ و غضب ہے اسی طرح الفاظ کی صورت و لہجہ سے بھی ہیبت و غیظ و غضب کا اظہار ہوتا ہے

(شبلی نعمانی)

فرہنگ انگریزی الفاظ

ہمارے اخباروں اور رسالوں کی تحریروں اور مجالس کی تقریروں میں بعض انگریزی الفاظ مستعمل ہوتے ہیں جن کے اصلی معانی لوگ کمتر جانتے ہیں۔ ان کو ہم لکھتے ہیں تاکہ وہ اُن الفاظ کے معانی جاننے سے مضامین کے سمجھنے سے بہرہ یاب ہوں۔

نیچر اور اُسکے مشتقات

آج کل ہماری زبان میں بڑی دھوم دھام سے لفظ نیچر رواج پا گیا ہے۔ ہر کس و ناکس کی زبان پر ہے۔ ظریفوں کی محفل میں نقل مجلس ہے۔ نیچروں کی ظرافت کا مرجع ہے اور نیچر کا ہم وزن بیہودہ دماغ اپنی طرف سے اُس کے معانی گھڑتے ہیں اور اُن کے موافق اعتراضات جڑتے ہیں۔ ہماری زبان میں تو غیر زبان کا لفظ تھا یہ ہونا اس کا تعجب نہ تھا۔ مگر اصل زبان میں اس کا یہ حال ہے کہ جب کسی زمانہ میں اس کے سمجھنے میں انسان نے غلطی کی تو چھوٹا فلسفہ۔ چھوٹا علم اخلاق۔ چھوٹا مذاق ان میں پیدا کر دیا۔

(۱) نیچرل کے اصلی معنی پیدا ہونے کے ہیں، جس کا صحیح ترجمہ فطرت یا آفرینش یا سرشت ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے معنی یہ بھی لئے جاتے ہیں کہ وہ خود آفرینش ہے یا آفریدہ ہے یا سبب آفرینش ہے۔

(۲) نیچر اُس قوت کا نام ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے (جو کسی سے پیدا نہیں ہوا اور سارے

موجودات عالم کا بنانے والا ہی) ایسا بنایا ہی کہ وہ تمام موجودات عالم کی محافظت کرتی ہی اور ان کو اپنے اپنے کاموں اور انجاموں کی طرف ہدایت کرتی ہی اور کُل افعال و اعمالِ انسانی کی ہادی ہوتی ہی۔ وہ موجوداتِ عالم میں ایک ترتیب اور انتظام و نظام ایسا قائم کرتی ہی جس سے تمام عالم کے کام با قواعد مستمر ہوتے ہیں۔

(۳) کبھی تو نیچر کے معنی ایسے وسیع لئے جاتے ہیں کہ وہ عالمِ ارواح اور عالمِ اجسام دونوں میں داخل ہوتے ہیں کیونکہ نیچر اپنا کام ان دونوں عالم میں کرتا ہی اور کبھی نیچر کے معانی ایسے تنگ لئے جاتے ہیں کہ وہ فقط عالمِ اجسام ہی سے متعلق ہوتے ہیں اور اس صورت میں وہ عالمِ ارواح کے مقابل اور ضد میں کھڑے ہوتے ہیں۔

(۴) تمام مادّی اشیا، خواہ وہ ذو آلیہ (جان دار) یا غیر آلیہ (بیجان) ہوں ان کے جتنے قوا اور اسباب و خواص ہیں وہ نیچر کہلاتے ہیں۔ کسی خاص شے مثلاً پانی، آگ، درخت یا جانور کے نیچر سے مُراد یہ ہی کہ اُن کے تمام قوا و خواص و طرائق جن کے موافق وہ اور چیزوں کا اثر قبول کرتے ہیں یا اور چیزوں پر اپنا اثر کرتے ہیں یعنی وہ تمام قابلیتیں اور استعدادیں جس سے وہ مظہرِ قدرت پیدا کرتا ہی۔ پس جب کسی شے کے نیچر کے یہ معنی ہوں تو وہ تمام عالم کے خواص اور قوا کا مجموعہ ہوا۔

نیچر کا لفظ آرٹ کے مقابل میں آتا ہے۔ اس معنی کی تفصیل آرٹ کے معنی میں جو نیچے لکھے ہیں سمجھ میں آئینگے اب نیچر کے لفظ کے مشتقات اور مرکب تو صیفی کے معنی لکھے جاتے ہیں۔

(ا) نیچرل، نطرتی، قدرتی، فطرتی، جبلّی۔

(ب) سپر۔ نیچرل، فوق العادت، خرقِ عادت، فوق الفطرت۔

نیچرل وہ چیز ہے جو نیچر سے متعلق ہو۔ پس موجوداتِ عالم میں جو ترتیبِ نظام عادت کے موافق بقاعدہ مستمرہ ہو اُس کو نیچرل کہتے ہیں۔ اور اُس کے مقابل میں سوپر نیچرل ہے جس کے معنی فوق العادت یا خرقِ عادت یا معجزہ کے ہیں۔ جب کسی چیز کو نیچرل کہتے ہیں تو اُس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جہاں آفریں نے اِسی شے کیواسطے یہ امر ازل سے ابد تک کے لئے مقرر و معین کر دیا ہے کہ وہ ایک ہی طرح سے واقع ہوا کرے اور اس میں کبھی تغیر و تبدل نہ ہو اور جب کسی چیز کو سوپر نیچرل کہتے ہیں یعنی فوق العادت تو اُس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ چیز بجنسہ نہیں واقع ہوتی جب خدا کی مرضی ہوتی ہے تو وہ کبھی کبھی واقع ہوتی ہے یا ایک ہی دفعہ۔

(ج) کورس یا پاور (Power) آف نیچر۔ طریقہ یا قوتِ نیچر۔

اس کے معانی ہیں ارادۂ الٰہی یا مشیتِ ایزدی کے موافق بجنسہ بقاعدہ مستمرہ ایک ہی طور سے واقعات کا پیش آنا۔ قادرِ مطلق کی قدرت میں ہے کہ وہ اس اپنے کورس کو بدلدے گو کبھی اس کو بدلا نہیں اور اُس کے کمال کا اقتضاء ہے کہ وہ اسکو کبھی نہ بدلے

(د) نیچرل لا۔ قانونِ قدرت۔

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بعض واقعات بجنسہ ایک حالت کے بعد واقع ہوتے ہیں اور یہ حالتِ متقدمہ جس کو سبب یا علت یا اثر کہتے ہیں، خاص سبب یا خاص معلول یا خاص اثر پیدا کرتے ہیں اور بجنسہ اسبابِ متشابہ یا متماثل سے مسبب متشابہ یا متماثل مشاہدہ میں آتے ہیں مثلاً جب ہم کسی چیز کو اوپر سے بے سہارے چھوڑتے ہیں تو وہ نیچے زمین پر گر پڑتی ہے اُس کو نیچرل لا یعنی قانونِ فطری یا قدرتی یا فطرتی کہتے ہیں کہ پتھر اوپر سے چھوڑا گیا زمین پر گرتا ہے۔

(ہ) نیچرل ری لی جین (Religion) جس کے معنی نیچریہ مذہب قدرتی یہ مذہب نیچرل لا کے موافق ہوتا ہی وہ کسی مذہب کو رد نہیں کرتا بلکہ سپر نیچرل (فوق العادت) کو رد کرتا ہی یعنی معجزات و خرق عادت و کرامات کو وہ باطل ثابت کرتا ہی اور خالص مذہب کو جو خدا تعالیٰ نے انسان کی سرشت میں ودیعت کیا ہو اسی کو صحیح جانتا ہی جو توہمات و تحکمات سے پاک صاف ہے۔

(و) آرٹ جو نیچر کے ساتھ بولا جاتا ہی اس کے معنی قوت و ہنر کے ہیں مگر خیالی چیز کی جسمانی صورت بنانے کو آرٹ کہتے ہیں، قدرتی اشیاء کو انسان اپنے خیالات اور تجربوں سے ایسا درست بنائے اور تیار کرے کہ جس سے کوئی ہمارا ارادہ پورا ہو اور مقصد حاصل ہو اُسے آرٹ کہتے ہیں آرٹی فیشل (Arti ficial) مصنوعی چیز کو کہتے ہیں الفاظ آرٹ اور نیچر کو اپنی بول چال و تحریر و تقریر میں بہت سوچ سمجھ کر استعمال کرنا چاہیئے۔ نہ کہ اُلٹکر نیس اناپ شناپ۔

آرٹ ہماری زبان میں یہ لفظ بہت مستعمل ہی۔ اس لفظ کے اصل معنی قوت و ہنر کے ہیں، مگر اصطلاحی معنی اس کے خیالی چیز کی صورتِ جسمانی بنانے کے ہیں کہ قدرتی اشیاء کو انسان اپنے خیالات اور تجربوں سے ایسا درست بنائے اور تیار کرے کہ جس سے کوئی ہمارا ارادہ پورا ہو اور مقصد حاصل ہو۔ جیسے مصوری، نجاری موسیقی فائین آرٹ (Fine Art) کہلاتے ہیں۔

سائینس سائنس کا ترجمہ اکثر ہماری زبان میں علم حکمت کیا جاتا ہی۔ اصلی معنی اسکے جاننے کے ہیں مگر اصطلاحی معنی اُس علم کے ہیں جو مظہراتِ قدرت کا علم یا علل و اُصول ہو اور اس علم میں کسی شک و شبہ کی جگہ نہ ہو اور کبھی اس میں تغیر نہ ہو اور

وہ بالکل سچّا اور صحیح ہو اور سوا اُس کے اس میں کچھ اور نہ ہو۔ سائنس کا موضوع علم ہے اور آرٹ کا موضوع عمل ہے۔ سائنس سے اصول معلوم ہوتے ہیں۔ آرٹ سے قاعدے۔

ابتداءً زمانہ میں کاریگروں اور صنّاعوں نے صنعت کو ایجاد کیا گو کوئی اصول علمیہ اُن کے ذہن میں نہ تھے اور وہ اپنے تصور اور ہاتھوں کو کام میں لائے، اس لئے صنعت کو تقدیم سائنس (علم حکمت) پر ہے مگر جب صنعت کے ساتھ سائنس (علم حکمت) کا برتاؤ ہوا اور صنعت فقط تجربوں ہی کا مجموعہ نہیں رہا بلکہ اصول علمیہ (سائنس) کا بھی اس پر قبضہ و دخل ہوا تو اُس کو سائنٹیفک آرٹ (Scientific Art) کہنے لگے۔ درحقیقت صنعت کو تقدیم حکمت پر ہے یعنی آرٹ کو تقدیم سائنس پر یعنی آرٹ کو تقدیم سائنس پر ہے مگر بعض اس رائے کو نہیں مانتے ان کے نزدیک اگر سائنس نہ ہوتا تو آرٹ نہ ہوتا۔

سائنس کی کوئی فرع جدید ایسی نہیں جس کا بیج قدیمی علوم میں نہ پایا جائے تمام علوم جدیدہ کی اصل علوم قدیمہ میں موجود ہے، علوم قدیمہ میں جتنی باتیں صحیح و سچّی و مفید تھیں وہ علوم جدیدہ میں ایسی منجذب ہو گئی ہیں کہ وہ اُن سے جدا نہیں معلوم ہوتیں مگر متقدمین سائنس مدون کرنا نہیں جانتے تھے یہ زمانہ حال کا ایجاد ہے۔

بالفعل ہندوستان میں سب سے زیادہ ضرورت سائنس کی ہے۔ تمام مہذب ملکوں میں سائنس کا دَور دَورہ ہے جس کی بدولت دُنیا نئی دُنیا بن گئی ہے۔ آگ کا سلگانا ایک طالب علم چھ مہینے میں اُستاد سے سیکھتا ہے کہ آگ اس طرح روشن کرے کہ ایندھن کم از کم صرف ہو اور حرارت زیادہ سے زیادہ پیدا ہو اور ذرّہ کے برابر حرارت ضائع نہ ہو۔ غرض ہر پیشہ ور سائنس کے موافق ہو خواہ برہمن ہو یا درجی یا کمہار وغیرہ۔

اڈیٹر۔ اڈیٹر تو روزمرّہ کی بول چال میں خوب مروّج ہو رہا ہے۔ مہتمم و مدیر اس کا

ترجمہ کیا جاتا ہے۔ اس کے لفظی معنی (میں شائع کرتا ہوں) اُس آدمی کو کہتے ہیں جو
دوسرے کی تصنیف وتحریر کو شائع کرتا ہو۔ اب اس کی تمیز کے لئے دو قسمیں مقرر
کی ہیں۔ ایک قسم وہ اڈیٹر ہیں جو دوسرے کی تصنیف کو اصل سے بہتر بناکے شائع
کرتے ہیں۔ متن کی شرح لکھتے ہیں یا اس پر حاشیے چڑھاتے ہیں۔ ریویو لکھتے ہیں
غرض اپنی طرف سے دوسرے کی تصنیف کو ایسے لباس و پیرایہ میں لاتے ہیں کہ
اصل تصنیف کا حُسن زیادہ ہو جاتا ہے اور عوام وخواص کو رغبت اس پر زیادہ ہو جاتی
ہے۔ ایسے اڈیٹر کی لیاقت علمی چاہیئے کہ پرلے درجہ کی ہو کہ وہ دوسرے کی تصنیف کو
کما حقہ سمجھے اور اُسکے تمام مقاماتِ مشکلہ کو حل کرے اور اُس کے غوامض اور رموز
کے عقدوں کو کھولے جس سے اصل کتاب ایسی رونق پاجائے کہ اس کی گرم بازاری
ہو جائے۔ دوسری قسم کے اڈیٹر وہ ہیں کہ مختلف آدمی ان کے پاس اپنی تصنیفات وتحریرات
بھیجتے ہیں اور وہ ان سب کو یکجا جمع کرکے شائع کرتے ہیں۔ جیسے کہ اخبارات ورسائل اور
سلسلۂ کتب و انسائیکلوپیڈیا وغیرہ کے اڈیٹر ہوتے ہیں۔ ان کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ جس
کی تصنیف اُن کے پاس آئے اس میں کمی بیشی کریں اور قلم اصلاح سے اس کو درست
کردیں یا واپس بھیج دیں یا شائع نہ کریں یا ایک جزو کاٹ دیں۔ غرض غیر کی تصنیفات
میں وہ اپنے تصرفات کرنے کے مجاز ہوتے ہیں۔ ایسے اڈیٹر میں ضرور ہے کہ لیاقت جامع
العلوم ومجمع الفضائل ہونے کی ہو کہ وہ اکثر علوم سے ایسا ماہر ہو کہ جب کوئی تصنیف
اسکے روبرو پیش ہو تو وہ اُس کے بُرے بھلے ہونے کا امتحان کرسکے اور بے تکلف دوسرے
کی غلطی بتادے اور اصلاح دیدے۔ یہ لفظ اکثر اخباروں کے آخر میں لکھا ہوا ہوتا ہے۔ اُس کا
ترجمہ مہتمم اخبار کیا جاتا ہے اور بعض اس کا ترجمہ مدیر بھی کرتے ہیں۔ پس اخبار کا اڈیٹر اُس کو

جاننا چاہیئے کہ جس میں صفات مذکورۂ بالا پائی جائیں۔

کونفرنس کونفرنس انگریزی لفظ ہی جس کے معنی جمعیت یا مجلس کے ہیں جو کسی مفید مقصد و مطلب کے لئے خواہ وہ مذہبی ہو یا تجارتی یا زراعتی یا سیاسی یا ملکی یا تعلیمی اور علیٰ ہٰذالقیاس باضابطہ منعقد ہو اس کا اصلی موضوع یہ ہو کہ اسمیں جتنے آدمی جمع ہوں اُن کو بحث و مباحثے کرکے یہ سمجھائے کہ جس مطلب و مقصد کے لئے یہ مجمع جمع ہوا ہی۔ اُس کی حالت موجودہ قابل اطمینان نہیں ہو اسکے ساری عیوب و نقص یہ توضیح بیان کرکے بتلائے کہ وہ کون سے طریقے ہیں کہ جن کے ساتھ عمل کرنے سے وہ نقص و عیوب دور ہو سکتے ہیں ایسی براہین مبین اُن کے لئے بیان کی جائیں کہ جن کا اثر مجمع کے دل پر ایسا ہو کہ وہ ان طریقوں پر عمل کرنے لگیں مثلاً **آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کونفرنس** یعنی کل ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی مجلس وہ ہر سال ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں دن مقرر کرکے مسلمانونکو مدعو کرتی ہو اُن کو تبلاتی ہی کہ تمھاری تعلیم کی حالت قابل اطمینان نہیں اور نہایت تنزل پر ہو اور اس کی ساری خرابیوں اور بُرائیوں کو بیان کرتی ہو اور پند و نصائح و تقریر و تحریر سے انکو ہدایت کرتی ہو کہ تم تعلیم کے ایسے طریقے اختیار کرو کہ جس سے قومی ترقی ہو اور تمھارا نام روشن ہو اگرچہ اس کونفرنس کے بانی ہونے کی عزت **سر سید** کو حاصل ہو اور وہ اس کے مستحق بھی ہیں۔

ایجوکیشن (لفظی معنی پیدا کرنا) تعریف اس کی یہ ہے کہ انسان کی تمام قابلیتیں اور قوتیں خواہ جسمانی ہوں یا نفسانی اُن کا ظہور مناسب اعتدال میں کمال کے ساتھ ہو۔ کمال سے مُراد اُس حد سے ہو کہ جہاں تک وہ پہنچنے کے قابل ہو اور مناسب اعتدال سے مُراد یہ ہو کہ ہر ایک قوت و استعداد دوسرے کے ساتھ ایک مناسبت

رکھتی ہو جس میں اعتدال ہو اور افراط و تفریط اس کے درمیان نہ ہو۔
انسان ایسی عالت میں پیدا ہوا ہے اور اس کا مقتضا یہ ہو کہ وہ اپنے قوائے جسمانی اور نفسانی کو کام میں لاتا رہے، یہ تو اس کی نیچری ایجوکیشن ہو۔ لیکن اکثر ایجوکیشن سے مراد یہ ہوتی ہو کہ ہم اپنے قوا و قابلیتوں کے ظہور کے وسائل یوں کام میں لائیں جو اوروں کے حق میں بہتر و نافع ہوں۔ اب اس ظہور قابلیت انسانی کے وسائل میں سے ایک تعلیم یعنی ایجوکیشن اور دوسری تادیب یعنی ڈسپلین (Discipline) ہو تعلیم کے معنی علم پہنچانا جس سے نفس میں قوت روشنی پیدا ہو اور تادیب کے معنی عادات اور اوضاع و اطوار کا بنانا۔ اب یہ تعلیم و تادیب یا جسمانی ہوگی یا اخلاقی یعنی ایک جسم سے متعلق ہوگی دوسری نفس سے، پس جب ان دونوں قسم کی تعلیم و تادیب ساتھ ساتھ ہو کر وسعت پاتی ہے کہ جس سے انسان کی ترقی کے آگے قدم بڑھانے کا ظہور ہوتا ہو اُسے ایجوکیشن کہتے ہیں۔

کونگریس — کانگریس کے انگریزی زبان میں ۲ دو معنی ہیں۔ ایک معنی اس جماعت کے ہیں جس کے ممبر الکشن یعنی انتخاب سے باقاعدہ و باضابطہ مقرر کئے جائیں اور گورنمنٹ کی طرف سے اُن کو قوانین شاہی کے وضع کرنے کے اختیارات عطا کئے جائیں۔ دوسرے معنی اُس کے کثیر الاستعمال اس جماعت کے ہیں کہ گو وہ مستند فرمان اور سند شاہی نہ رکھتی ہو مگر وہ گورنمنٹ کی نکتہ چینی و خردہ گیر عیب و صواب میں و مشیر و صلاح کار، پبلک اوپینین یعنی جمہور انام کی آرائے روشن کی مظہر اور گورنمنٹ یا معترض گورنمنٹ کی تدابیر و صلاح ملکی کے برخلاف رائے زن ہو جیسے کہ نیشنل کونگریس ہو

لیگ — وہ جماعت جو ایسے کاموں کے لئے جن سے کہ اُن کو نفع و فائدہ حاصل

ہوا در مقصد دلی بر آئے متحد و متفق ہو۔ آل انڈین مسلم لیگ کے یہ معنی ہیں کہ ہندوستان کے کل مسلمانوں کا آپس میں اس لئے متحد ہونا کہ ایسے منافعہ حاصل کیجیے کہ جن سے مسلمانوں کو نفع عظیم پہونچے۔

ڈلی گیٹ ڈلی گیٹ کے معنی اس شخص کے ہیں جسے لوگ اپنی طرف سے منتخب کرکے اپنا قائم مقام ونائب مقرر کرکے کسی کام کے لئے بھیجیں اخباروں اور رسالوں میں اس کا ترجمہ نمایندہ بالکل غلط کیا جاتا ہی جو قانون دکھانی کی ایک شرم ناک اصطلاح کو یاد دلاتا ہے۔

سویلیزیشن سویلیزیشن کا ترجمہ نہایت صحیح تہذیب کیا جاتا ہی جس کے معنی محلّی بالفضائل اور مخلّی عن الرذائل ہی یعنی نیکیوں کی فضیلت سے آراستہ ہونا اور برائیوں کی رذالت سے پاک صاف ہونا۔ مگر انگریزی زبان میں اسکی مختلف طرح سے تعریف کی جاتی ہی جس کا مآل وہی ہے جو تہذیب کے معنی کا ہی وہ تعریف یہ ہی کہ انسان اپنی تمام لیاقتوں اور قابلیتوں کو برائے کا ظاہر کرکے اپنی سوسائٹی کے کل تعلقات کو کمال کے درجہ پر پہونچائے۔ اور کل سوسائٹی اور ہر فرد اسکی اپنی ترقی کرنے میں سعی و جد و جہد کرے۔ نیچر کے مظہرات اور قوانین اور قوا پر فتحیابی حاصل کرے جیسے کہ تم دیکھتے ہو کہ ہوا۔ پانی۔ سٹیم (دخان) الکٹریسٹی وغیرہ پر مہذب قوموں نے مسلّط ہوکر اپنے تئیں ایسا کامل بنایا ہی کہ کشورستانی سوا اُن کو وہ منفعت نہ حاصل ہوتی جو اس سے ہوئی مشرقی اور مغربی تہذیبوں میں فرق ہی مشرقی تہذیب روحانیت کی تکمیل پر اور مغربی مادّیات کی تکمیل پر زیادہ تر منحصر ہے۔

ایسوسی ایشن وہ جماعت جو ایسی دوستانہ ملے جُلے اور مل جُل کر کوئی مفید

کام کرے جس سے لوگوں کو فائدہ پہونچے اپنے ملک میں بہت سی ایسوسی ایشنیں دیکھتے ہو۔ یونائیٹڈ پٹریوٹک ایسوسی ایشن جس کے سکریٹری سرسید تھے مشہور معروف ہے۔

آئیڈیل آئیڈیل جس کی انگریزی زبان میں جمع آئیڈیلز ہے اس کے معنی خیال کے غایت کمال کے ہیں جن تک رسائی کبھی نہیں ہوتی اور وہ کبھی واقعیت یعنی فیکٹ نہیں بنتا فقط تکمیل کے خیال کو بتلاتا ہے۔

(ذکاء اللہ دہلوی)



ہندوؤں کا تعلق اُردو سے

علم الالسنہ یعنی فیلالوجی نے دنیا میں عجیب عجیب کرشمے دکھائے ہیں۔ اُس عہد کے واقعات نظر کے سامنے کردیئے جب کہ سلف کو بعد والی نسلوں کی اطلاع کے لئے اپنے کارناموں کے زندہ رکھنے کی کوئی تدبیر نہیں معلوم تھی۔ نوع انسان کے بچپن کے سفروں اور آغاز شعور انسانی میں آدمیوں کی نقل و حرکت اور سیر و سیاحت کے حالات ہمیں اُسی زندگی بخش فن سے معلوم ہوئے۔ ہمارے مجہول العہد بزرگوں کے نقش قدم جو قدیم الایام کی جلاوطنیوں اور صحرانوردیوں سے صفحۂ زمین میں جابجا بنگئے تھے اُنھیں ہم نے اس جدید علمی عینک کی مدد سے دیکھ لیا۔ اور اُسی کی مدد سے دور تر و دور تر بعید سے بعید اور گہرے سے گہرے واقعات کا انکشاف ہوتا جاتا ہے۔

مگر سب سے بڑی برکت و نعمت وہ انکشافات ہیں جو اس عینک کے ذریعے سے ہمیں خود اپنی زبان کے اندر نظر آئے۔ ہماری زبان سچ پوچھئے تو ایشیا کی اُس سراپا عظمت قوم کے تفرق و اتصال کی زندہ تاریخ ہے جس کی شاخیں نکلیں، پھیلیں، چھوٹیں، ملیں، ہٹیں، بڑھیں، لڑیں، ٹکرائیں اور پھر ایک ہوگئیں

اسی علم الالسنہ کے طفیل میں فی الحال یہ ایک طے شدہ تاریخی مسئلہ ہے کہ قدیم الایام میں تمدنِ انسانی کا سب سے ممتاز اور عظیم الشان درخت جو تاریخ میں آریہ کے نام سے مشہور ہے وسط ایشیا کے ایک مردم خیز خطے میں پھلا پھولا۔ اور جب اُسکی

ایک ابتدائی قلم اس سے کاٹ کے ارضِ مغرب اور یونان و روم کی سواد میں
میں نصب ہو چکی تو اور زیادہ پھیلا اور اُس کی دو زبردست شاخیں اِدھر اُدھر
بڑھنے اور پھیلنے لگیں۔ یہاں تک کہ ایک مشرق کی طرف بڑھ کے ہندوستان
پر سایہ افگن ہوئی اور دوسری مغرب میں پھیل کے ممالکِ عجم کی بہار بن گئی
ان دونوں شاخوں نے یہاں تک فروغ پایا کہ قدیم درخت کا اصلی تنہ فنا ہو کے صفحۂ
ہستی سے غائب ہو گیا اور اُن دونوں ممتاز و سرسبز شاخوں نے ہندوستان و ایران کی زمینوں
میں اپنے لئے نئے تنے پیدا کر لئے اب مقامی آب و ہوا کے اثر نے اُن کو ایک دوسرے
سے جدا اور مختلف خصوصیات سے متصف کرنا شروع کیا۔ اور دونوں میں جدا جدا
خصائص و تشخصات پیدا ہو گئے۔

آریہ قوم کی ان دو شاخوں کے ایک ہونے اور اُس کے بعد پھر ملنے کی سچی تاریخ
ہماری اردو زبان ہے مسلمانوں کا ہندوستان میں آنا در اصل ہزارہا سال کی
مفارقت کے بعد اُن دونوں شاخوں کا ہم آغوش ہونا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ مسلمان عرب سے آئے اور وہ آریہ قوم سے نہیں بلکہ باغِ عالم
کے ایک دوسرے درخت کی شاخ ہیں جو بنی سام کا درخت کہلاتا ہے اور شجرِ آریہ سے
پہلے دنیا میں سرسبز ہو چکا تھا۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے۔ تاجرانِ عرب ظہورِ اسلام
سے پہلے بھی جنوبی ہند کے مشرقی و مغربی سواحل پر آ کے بستے رہے اور اُس کے بعد
بھی آتے رہے اور توطن اختیار کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے علاوہ جب پہلی صدی
ہجری میں مسلمانوں نے ملک سندھ کو فتح کر لیا تو کثرت سے عربی خاندان آ کے سندھ
کچھ، کاٹھیاواڑ اور گجرات میں سکونت پذیر ہو گئے۔ یہ فی الحقیقت عربوں اور بنی سام کا آنا تھا

لیکن مسلمانوں کا وہ آنا جس نے ہندوستان پر گہرا تمدنی اثر ڈالا جس سے ہندوستان کی موجودہ معاشرت بنی اور اسکی موجودہ زبان پیدا ہوئی اُس کا آغاز سچ پوچھئے تو محمود غزنوی کے حملوں سے ہوا۔ یہ عربوں کا آنا نہ تھا بلکہ ایرانیوں اور فارسیوں کا آنا تھا جو دراصل اُسی قدیم آریہ شاخ کے پھل پھول تھے۔ محمود غزنوی خاص عجمی نژاد در آلِ ساسان کی نسل سے تھا۔ اور اس کی فوج میں علی العموم وہی لوگ تھے جو ایرانی تھے یا تورانی جن کو ایرانی اپنا ہم نسب اور ہم جد بتاتے تھے۔ غزنویوں کے بعد غوری سلاطین اسلام کا عہد شروع ہوا۔ وہ بھی گو مذہباً مسلمان تھے لیکن بلحاظ انساب تورانی تھے پھر غلاموں کا عہد آیا اور وہ بھی تورانی تھے۔ چند روز کے لئے سیدوں کا کمزور زمانہ رہا اور پھر حکومت عجمی الاصل خاندانوں کے ہاتھ میں آگئی۔ لودھی تغلق اور مغل یہ سب تورانی اور اہلِ عجم کے بنی عم تھے۔ بہرحال ہندوستان میں مسلمانوں کا جو متمدن دربار قائم ہوا اور جس نے ہندوستان کی سوسائٹی کو اپنے رنگ میں رنگا وہ سامی نہیں آریہ دربار تھا۔ اور اس میں مطلق شک وشبہ نہیں کیا جاسکتا کہ اگرچہ یہ لوگ دین اسلام کے پیرو ہونیکی وجہ سے عربوں کی عزت کرتے اور عربی معاشرت کے دلدادہ تھے مگر بذات خود آرین تھے اور اُن کا آنا آریہ قوم کی دو شاخوں کا باہم ملنا تھا۔

فی الحال کوشش کی جاتی ہے کہ پُرانا رشتہ زندہ کرکے یورپ والوں کو اہلِ ہند کا بھائی بند ثابت کیا جائے۔ اور مسلمان ایک غیر قوم بتائے جائیں جن کو آریہ قوم سے کوئی لگاؤ نہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جن مسلمانوں نے ہندوستان پر حکومت کی اور اُس میں اپنا جدید دربار قائم کیا وہ بنی سام نہیں آریہ تھے۔ عربی نہیں فارسی بولتے ہوئے ہندوستان میں آئے تھے۔ اہلِ ہند سے بمقابل اہلِ یورپ کے زیادہ قریب

کا رشتہ رکھتی تھیں کیونکہ یہ مشتبہ ہے عند الجمیع کہ ایران کے آریوں کو
ہندوستان میں آنے سے پہلے عرب نژاد نے منتشر کر دیا تھا۔ لیکن ایرانیوں سے
زیادہ یورپ کے آریوں کو رشتہ ہے۔ جو ان کا تھوڑا ورثہ تاریخ میں منتشر کر چکی تھیں
بہرحال اسمیں ذرہ بھی شک نہیں کیا جا سکتا کہ اہلِ یورپ کے بہ نسبت یہ عجمی فاتح
ہندوؤں کے زیادہ قریبی رشتہ دار تھے۔

(۲)
لیکن سامی و آریہ دونوں نسلوں کے تازہ وارد مسلمانوں نے گو کہ پہلے ان کی زبان
عربی اور دوسری زبان فارسی تھی اس صورت میں یہ قائم رکھتے ہی یہاں کی زبان کی
طرف غیر معمولی توجہ کی۔ اور اس ملک کی زبان کو نہایت سرگرمی اور ذوق و شوق
سے حاصل کرنا شروع کر دیا۔ اہل عرب ۹۳ھ (۷۱۱ء) میں وارد سندھ ہوئے
تھے اور پرانا عربی مورخ بلاذری لکھتا ہے کہ اُس کے اکتالیس ہی سال بعد یعنی ولید
بن یزید کے عہد میں اہل سندھ عربی بولنا اور لکھنا اُس زبان کی تعلیم میں ترقی کرنے لگے
تھے چنانچہ تھوڑے ہی روز میں عربی زبان کے سندھی نژاد شعرا کے یہاں تک نمود حاصل کر لی
کہ اُن کے اشعار بلاد شام و عرب میں مشہور ہوئے اور اُن کا نام احترام عرب کی
علمی صحبتوں میں عزت سے لیا جانے لگا۔ چنانچہ اُس عہد کا ایک شاعر لسان عرب
جس کا لقب ہی سندھی تھا آج تک مشہور ہے۔ اسکے ساتھ یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ متوطن
سندھ عربوں نے بھی سندھی زبان ذوق و شوق سے سیکھنا شروع کر دی تھی۔

اس کے تھوڑے دنوں بعد عربوں کا انہماک ہندوستان کی زبانوں میں یہاں تک
بڑھا کہ سندھی زبان کے عربی نژاد شاعر پیدا ہونے لگے جن کا کمال یہاں کی مہذب
صحبتوں اور معزز درباروں میں بہت مقبول تھا۔ اُس زمانے کا ایک مشہور سیاح

بزرگ بن شہریار خاں ناخدا جس کا سفرنامہ دارالسلطنت روس میں چھپا ہے لکھتا ہے
۲۷۰ھ (۸۸۳ء) میں کسی ہندو راجہ نے مسلمان حاکم سندھ کو لکھا مجھے مسلمانوں
کے عقائد سے مطلع فرمایئے۔ سندھ کے فرمان روا نے یہاں کے ایک ماہر السنۂ ہندی
شاعر کو بلا کے حکم دیا کہ آپ عقائد اسلامیہ کو سندھی زبان میں لکھ دیں۔ وہ ہندوستان
کی کئی زبانیں جانتا تھا۔ اور سب میں شعر کہتا تھا۔ اس راجہ کی زبان میں ایک نہایت
ہی فصیح و بلیغ نظم لکھی جس میں شریعت اسلامیہ کے کل اصول و عقائد موزوں کردئے
تھے۔ اس نظم کو سب نے پسند کیا۔ اور جب وہ راجہ کے پاس پہونچی تو شاعر کی قادرالکلامی
کی بیحد داد دی۔ اس کا مشتاق ہوا۔ اور حاکم سندھ کو لکھا کہ اس شاعر کو آپ میرے
پاس بھیجدیں، وہ شاعر گیا۔ جس سے راجہ نے قرآن مجید کا ہندی زبان میں ترجمہ
کرایا اور اسے بہت کچھ انعام و اکرام دیکر رخصت کیا۔

اس کے بعد جب قدیم سیاحانِ عرب اصطخری ابن حوقل بشاری اور مسعودی وغیرہ
سندھ میں آئے ہیں ان کے بیانوں سے یہ نتیجہ بخوبی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ سندھ میں ہندو
مسلمانوں کا میل جول اسقدر بڑھ گیا تھا۔ کہ ہندو عربی معاشرت سے اس قدر
متاثر نہیں ہوئے تھے جس قدر خود عرب ہندوستانی معاشرت سے متاثر ہوگئے
تھے۔ عربوں نے یہاں کی زندگی اختیار کرلی تھی۔ یہاں کی عورتوں سے نکاح کرتے
تھے۔ یہاں کی زبان بولتے تھے۔ اکثر یہیں کے ناموں اور لقبوں کو اختیار کرتے تھے
اور یہیں کے رسم و رواج کے پابند تھے۔

ان آریہ نسب مسلمانوں کے آنے کا آغاز بظاہر محمود غزنوی کے حملوں سے
نظر آتا ہے مگر دراصل ابوریحان بیرونی کی علمی کوششوں سے ہوا جس کے وطن میں

اگرچہ بڑا اختلاف ہے مگر میرے خیال میں سندھ کے فنا شدہ شہر برہمن آباد یا نیرون کا رہنے والا اور اُس ہندی آمیز اسلامی تمدن کی آخری یادگار تھا جو حسب بیان متذکرہ بالا سندھ میں قائم ہو گئی تھی۔ اُس نے عربی و سنسکرت دونوں زبانوں میں کمال پیدا کیا۔ ہندوستان کے اندرونی شہروں اور ہندوؤں کی قدیم علمی درس گاہوں میں طالب علمی کی، ہندوؤں کے علوم عربی میں اور عربوں کے علوم سنسکرت میں منتقل کئے اور برسوں اُن شہروں میں رہ کے جہاں اسلام کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ یہاں کی مروجہ زبانیں سیکھیں اور ایک ایسا عجیب و غریب شخص بن گیا کہ آج تک مغرب کی علمی دنیا میں حیرت و ادب کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

اُسی عہد سے وابستہ فارسی کا مشہور شاعر مسعود سعد سلمان ہے جس کی نسبت تذکرہ مجمع الفصحاء میں لکھا ہے :- "وے را سہ دیوان بودند تازی، ہندی، پارسی"۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں :- "تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ ہندی زبان میں اُسنے (مسعود) ایک دیوان لکھا تھا"۔

اُس کا خاندان اگرچہ ملکِ عجم سے آیا تھا مگر وہ خود لاہور میں پیدا ہوا تھا۔ اور اسی وجہ سے زبان ہندی کا اتنا بڑا زبان داں ہو گیا کہ اس کثرت سے وطنی زبان میں شعر کہتا تھا کہ اُن کا ایک مستقل دیوان مدوّن ہو گیا۔

یہ غزنویوں کے عہد اوّلین کا ایک نامور مسلمان شاعر تھا۔ اس کے چند ہی روز بعد مولوی محمد حسین آزاد مرحوم لکھتے ہیں کہ شہاب الدین غوری کے عہد میں ہندوستان کے مشہور ہندی شاعر چند کوی نے پرتھی راج راسا لکھی تو اُسکے کلام میں کثرت سے فارسی عربی الفاظ موجود تھے۔

یوں تو دو قوموں کے ملتے ہی باہم مبادلۂ الفاظ شروع ہو جاتا ہے مگر اس لین دین کی حقیقی منڈیاں دو ہوا کرتی ہیں۔ اول بازار۔ جہاں ضروری اشیاء کی خرید و فروخت کے ساتھ لفظوں کا سودا بھی ہونے لگتا ہے۔ اور دوسری نغمہ و سرود کی صحبتیں۔ جہاں جب ایک قوم کی محفل میں دوسری قوم کے مغنی اپنی اور اپنی زبان کے گیت بلکہ نغمے لے کر آتے ہیں تو عوام پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ اور خواص یعنی امیروں، دوست مہمانوں اور معزز لوگوں پر بھی طرب کی صحبتیں اثر زیادہ اثر ڈالتی ہیں۔ عام مسلمانوں کیلئے بازاروں میں الفاظ کے لین دین کی تجارت تو اسی دن کھل گئی تھی جس دن مسلمان ہندوستان میں آئے تھے۔ مگر بزم طرب کی محفلیں اس وقت گرم ہوئیں جب مسلمان فرماں رواؤں نے اپنے درباروں میں ہندی مغنیوں کو جگہ دی اور ملکی گانے لوگ کرنے لگے۔ ساتھ ہی مشائخ صوفیہ نے ادھر توجہ کی۔ اور موسیقی کے رواج دینے کیلئے مسلمانوں کے دینداروں پر جو مذہبی پہرہ تھا وہ اٹھ گیا۔ علمائے اس سے اختلاف کیا مگر قاضی حمید الدین ناگوری نے سلطان شمس الدین التمش کو اپنی ایک کرامت دکھا کے علماء کے فتووں کے خلاف محفلِ سماع کا ایسا گرویدہ کر دیا کہ مشائخ کی محفلوں میں طبل و سرود کا نغمہ گونجنے لگا۔

شمس الدین التمش نے عربی و عجمی نژاد مشائخ کا شوق پورا کرنے کیلئے غالباً ایرانی مغنیوں کو اپنے دربار میں جگہ دی ہو گی۔ مگر اس کا بیٹا فیروز شاہ گانے کا ایسا دلدادہ ہوا کہ بڑے بڑے گویئے دور دور سے آکے اس کی محفلِ نشاط میں جمع ہو گئے اور ہر شہر اور ہر قصبے سے گانے ناچنے والی عورتوں نے دہلی میں آکے بسنا شروع کر دیا۔ جن میں سے بعض چوٹی کے صاحبِ کمال مطربوں مغنیوں کو اسکے

دربار میں خاص جگہ مل گئی۔ فیروز شاہ کے بعد یہ سلسلہ زیادہ ترقی ہونا شروع ہو گیا معز الدین کیقباد۔ جلال الدین خلجی۔ علاء الدین خلجی دولت سلطانیہ سے بیشتر کے وہ پرانے تاجداران ہند ہیں۔ جن کو موسیقی کا بہت شوق تھا۔ اور اُن کے شوق نے دہلی میں خصوصاً اور سارے ہندوستان میں عموماً ہزارہا مطرب و مغنی پیدا کر دیئے

ابن بطوطہ کو دہلی اور دولت آباد دونوں شہروں میں "طرب آباد" نام کے محلے نظر آئے جن میں صرف ڈوم ڈھاڑیوں کی آبادی تھی۔ اور یہی نہیں کہ اُن میں "فقط ہندو" مغنی آباد ہوں۔ ہندو مسلمان دونوں تھے مسلمان بھی معمولی مسلمان نہیں بلکہ دیندار اور پابند شرع گویئے۔ جن کی وجہ سے اُن محلوں میں مسجدیں تھیں اور خوب آباد تھیں۔ اُن میں پنج وقتہ نماز ہوتی۔ اور رمضان میں جماعت سے تراویح پڑھی جاتی۔ شاہی درباروں میں عموماً ارباب نشاط کے داروغہ یا چودھری مسلمان تھے۔ جو اکثر ایرانی الاصل ہوتے۔ ان دو عنصروں کے ملنے سے فن موسیقی کے مسائل میں باہمی ردّ و بدل اور داد و ستد کے اصول کا جاری ہونا یقینی ہے۔ مگر اسی سلسلے میں موسیقی سے زیادہ اس لین دین کے عمل کا الفاظ میں جاری ہو جانا لازمی

چند ہی روز میں یہ علمی تجارت اور زیادہ ترقی کر گئی۔ کشمیر کے حکمراں سلطان زین العابدین نے جو فارسی کے علاوہ ہندی اور تبتی زبانوں میں پورا دخل رکھتا تھا اکثر عربی و فارسی کتابوں کا ترجمہ ہندی میں اور بہت سی ہندی کتابوں کا ترجمہ فارسی میں کرایا۔ اور سب سے پہلے اسی کے حکم سے مہابھارت اور راج ترنگی (قدیم تاریخ کشمیر) کا ترجمہ فارسی میں ہوا۔

اسی قریب زمانے میں امیر خسروؔ کے اشعار مشہور ہوئے جنھوں نے دہلی میں نشو و نما

پایا تھا۔ وہ شاعری کے علاوہ موسیقی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ اور ہندی نژاد ہونے کی وجہ سے ہندوستان کی ہر چیز کو پسند کرتے تھے۔ انھیں ہندوستان کی زبان ہندوستان کی معاشرت، ہندوستان کا گانا، ہندوستان کا مذہب، غرض یہاں کی ہر چیز پسند تھی۔ اور انھوں نے ہر چیز میں باہمی اتحاد اور ربط وضبط کی کوشش کی یہی نہیں کیا کہ فارسی و ہندی دونوں زبانوں میں کمال پیدا کر کے سخن آفرینی کی، بلکہ انھوں نے دونوں جگہ کے علوم وفنون کے ساتھ دونوں زبانوں کو بھی ملایا۔ اور فارسی و ہندی الفاظ کو باہم مربوط کر کے اس میں نئے نئے جوڑ پیوند لگانا شروع کیے ایک منظوم کتاب میں عربی فارسی اور ہندی کے ہم معنی اور مترادف الفاظ جمع کر دیئے جو خالق باری کہلاتی ہے۔ اور اگلے نصاب تعلیم میں داخل تھی۔ اس کتاب میں مختلف لفظوں کو ایک سلسلے میں منظوم کرنا ہی بجائے خود ان کو باہم ملانا اور جوڑنا تھا

اس کے بعد ہندوؤں نے فارسی پڑھ کے سلطنت کے دفاتر فارسی میں ملازمت شروع کی۔ اور اسی کے مقابل بعض سلطنتوں نے اپنے دفتروں کو خالص ہندوستان کی وطنی زبان میں رکھا۔ اور مسلمان ملازمت کے لئے یہاں کی وطنی زبان علمی حیثیت سے سیکھنے لگے۔

یہ تمام باتیں صاف طور پر بتا رہی ہیں کہ ان دنوں مسلمانوں اور ہندوؤں میں باہم میل جول اور ربط وضبط کس قدر بڑھ گیا تھا۔ اور اس ربط وضبط اور اتفاق و یکجہتی کا پھل جو قیامت تک ہمارے گزشتہ اتحاد کو نہ بھولنے دیگا۔ وہ ہماری اردو زبان ہے اس کا مٹنا دراصل اس مبارک عہد کی یاد مٹ جانا ہے جب ہم دونوں میں دوستی کے درجے سے بڑھ کے عزیز داری قرابت کا رشتہ خوب مضبوطی کے ساتھ

قائم ہو گیا تھا

ہر چیز کی تولید کے لئے والدین کی ضرورت ہے۔ اور جس شخص یا چیز کی اصلیت کا پتہ لگانا ہو تو ہمیں اُس کے حقیقی ماں باپ کو ڈھونڈھنا چاہیئے اُردو کے ماں باپ اسمیں ذرا شک نہیں کہ بھاشا اور فارسی ہیں جو اُس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبانیں تھیں۔ بھاشا وہ اصلی زمین ہے جس میں یہ پودا اُگا اور جسکی آب و ہوا میں اُس کا نشو و نما ہوا۔ بمقابل اس کے فارسی کو اس زبان کی ولادت میں باپ کی حیثیت حاصل ہے۔ جس نے تخم ریزی کی۔ اور زمین ہند کے بطن میں ایک نئے بچے کے لئے حیاتی مادہ پیدا کر دیا۔ جن لوگوں نے مسئلہ تولید میں غور کیا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ہر بچے میں جسقدر زیادہ اثر ماں کا ہوتا ہے باپ کا نہیں ہوتا۔ اُس کا سارا جسم۔ تمام اعضا، گوشت پوست رگ و پے سب ماں کے ہوتے ہیں ایک ضامن کی طرح پدری نطفے کے امتزاج سے اُسمیں بعض پدری خصائل و عادات مخفی و مستتر رہا کرتے ہیں۔ جو اکثر ثبوت دیدیا کرتے ہیں کہ کس باپ کا بچہ ہے۔ اور اسی بناء پر مشہور ہے کہ

"اَلوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیہِ"

یہ دونوں اثر اردو زبان میں صاف نظر آرہے ہیں۔ اصلی ڈھانچہ، نظام نحوی اصولِ اشتقاق سب خالص ہندی اور بھاشا کے ہیں۔ فارسی و عربی الفاظ عزیز پسندیدہ مہمانوں کی طرح آکے اس طرح مل گئے کہ ایک جان دو قالب ہو گئے ہیں آخر زمانے میں بہت سی فارسی کی بندشیں بھی پوری پوری ترجمہ کر کے زبان میں شامل کر لی گئی تھیں بلکہ بعض شعراء نے یہاں تک کیا کہ اُن فارسی بندشوں کو اُسی فارسی ترکیب سے اُردو میں نقل کر لیا۔ لیکن غور سے دیکھیئے تو وہ بندشیں بالکل بے ربط ہیں

اوراسی وجہ سے زبان میں کبھی نہ شامل ہوئیں۔ انشاء اللہ خاں اور مظہر جان جاناں کی جوگفتگو مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے آبِ حیات میں نقل کی ہے اُسے پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اُن دونوں فارسی لفظوں کے ساتھ فارسی بندشوں کو بھی لوگ کس بے احتیاطی سے گفتگو میں شامل کر دیتے تھے۔ سید انشاء کہتے ہیں:۔ "ابتدائے سن صباسے تا اوائلِ ریعان اور اوائلِ بیان سے الی الآن اشتیاق مالا یطاق تقبیلِ عتبہ عالیہ نہ بحدے تھا کہ سلکِ تحریر و تقریر میں منتظم ہو سکے۔"

مرزا صاحب جواب دیتے ہیں:۔ "اپنے تئیں کون بھی بدوِ طفلی سے تمھیں ایسے اشخاص کے ساتھ موانست اور مجالست رہا کی ہے۔"

اس قسم کی چند بندشیں مرزا غالب کے بعض اشعار میں بھی ہیں لیکن اُن دنوں لوگوں کی زبان سے ایسی ترکیبیں محض اس وجہ سے نکل جاتی تھیں کہ درباری زبان فارسی تھی۔ فارسی شعر و سخن اور ایرانی ادب کی مُہذّب صحبتوں میں زیادہ قدر تھی فارسی دانی کا اظہار بات کرنے والے کی علمی قابلیت کا ثبوت سمجھا جاتا تھا۔ اور لوگوں کو اپنی لیاقت ظاہر کرنے کے شوق میں اس کا خیال نہ رہتا کہ فارسی کے استعمال میں ہم کہاں تک بے احتیاطی کر رہے ہیں۔ بعینہٖ جس طرح آج کل اکثر انگریزی داں حضرات انگریزی لفظوں اور جملوں کے استعمال میں بے احتیاطی کیا کرتے ہیں۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ فارسی کا دور ختم ہوتے ہی اُس قسم کی تمام بندشیں زبان سے نکل گئیں۔ اور چھن چھنا کے وہ زبان باقی رہ گئی جس کا ماخذ چاہے کہیں سے ہو مگر اب اُردو ہے اور خالص اُردو ہے میں خیال کرتا ہوں یہ اصول معلوم ہونے کے بعد کہ اُردو کا اصلی ڈھانچہ ہندوستانی ہے۔ اور اُس میں فارسی۔ عربی الفاظ کا حفظ ضامن پڑ گیا ہے یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ

اُردو میں ہندی و سنسکرت اور فارسی و عربی کو کسی حد تک کتنا اور کس قسم کا تصرف کرنے کا حق حاصل ہے۔ اُردو کے ساتھ مذکورۂ بالا زبانوں کا رشتہ معلوم ہو جانے کے بعد یہ مسئلہ بہت اصول طریقے سے صاف ہو جاتا ہے۔ اس کی بندشوں نحوی ترکیبوں ترتیب الفاظ۔ افعال کی گردانوں۔ صفات و روابط کے استعمال اور ضمائر و صفات سے کام لینے میں دخل دینا خاص سنسکرت اور بھاشا کا حق ہے۔ اس میں اگر عربی زبان دخل دے تو وہ زبان کو بنائیگی نہیں بلکہ بگاڑ دیگی۔ اس لئے کہ اُردو کا اصلی ڈھانچہ بھاشا و سنسکرت سے ماخوذ اور انھیں کا بنایا ہوا اور بالکل آرین اصول کا ہے۔ فارسی کو اس میں دخل دینے کا کسی قدر حق ہو سکتا تھا۔ اس لئے کہ وہ بھی آرین زبان ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ اُردو کا اشتقاق اور اس کی نحوی ترکیبیں بالکل بھاشا کے مطابق ہیں۔ رہی عربی اُسے تو اس میں دخل دینے کا مطلق حق نہیں ہے۔ بمقابلہ اسکے عربی کو ترتیب و اصول نحوی چھوڑ کے صرف یہ حق حاصل ہے کہ اپنے ذخیرۂ الفاظ میں سے اُردو کو نئے نئے الفاظ دے۔ اس لئے کہ تولید زبان میں اس کا جو پہلا ضامن پڑا تھا اُس نے اُردو کی بندشوں میں عربی الفاظ کو مہمانِ عزیز اور مانوس بنا دیا ہے۔ اور جس طرح ہر باپ کو حق ہے کہ اپنے فرزند کو اپنے علمی و ادبی فنون سکھائے اسی طرح عربی کو حق ہے کہ اُردو کے لئے نئی اصطلاحیں مہیا کرے۔ اُس کے ذخیرے میں اپنے الفاظ سے وسعت و متانت پیدا کرے۔ اور دُنیا کو دکھا دے کہ یہ بچہ اگرچہ ہندی ماں کے بطن سے پیدا ہوا ہے مگر میرا فرزند ہے

آپ ملاحظہ فرماتے ہیں کہ اُردو میں زبردستی جا ہے جس زبان کے اسم لے لئے جائیں ربط نہیں کھاتے اس کے فطری اوزان سے باہر ہوتے اور عربی الفاظ اس میں آتے ہی اُس کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ اور یہ امتیاز کرنا دشوار ہوتا ہے کہ

وہ خالص اُردو لفظ ہیں یا عربی سے لئے ہوئے۔ اس لئے جسطرح عربی و فارسی کے لئے یہ ناجائز ہو کہ اُردو کی نحوی ترکیبوں اور بندشوں میں دخل دیں۔ اسی طرح بھاشا اور سنسکرت کے لئے ناجائز ہو کہ اس زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں نئے غیر مانوس لفظ داخل کریں جو اُس کے نظری اوزان اور تلفظ و نوعیت کے خلاف ہیں۔

لیکن دونوں کے حدود مقرر کر دینے کے بعد میں یہ کہنے پر مجبور ہوں زبان اُردو کا چوکھٹا دراصل سنسکرت اور بھاشا کا بنایا ہوا ہو۔ اس لئے یہ زبان خالص آرین زبان ہو۔ اور عربی و فارسی نے فقط اسے اپنے خوبصورت الفاظ کا زیور و لباس پہنا دیا ہو اس بنا پر مدتِ دراز سے میری رائے ہو کہ جو لوگ اُردو نحو و صرف مرتب کرنے میں عربی قواعد زبان سے مدد لیتے ہیں سخت غلطی میں مبتلا ہیں۔ عربی کے قواعد ہماری زبان میں ہرگز پورے نہیں اُتر سکتے۔

نحو و صرف کی اصلی عمارت افعال کی بحث پر قائم ہوا کرتی۔ عربی اور میرا خیال ہو کہ تمام سامی زبانوں میں فعلوں کا اشتقاق بغیر کسی دوسرے فعل کے ملائے فقط ایک حرف کے بڑھانے گھٹانے یا حرکتوں کے بدل دینے سے ہو جاتا ہی۔ بخلاف اسکے آریہ زبانوں میں بغیر کسی دوسرے فعل یا لفظ کے ملائے پورا اشتقاق ہو سکتا اسی طرح نحو اُردو کے صدہا مسائل ہیں جنکے بیان کرنیکا وقت نہیں ہو مگر وہ سب ثابت کرتے ہیں کہ اُردو آرین زبان ہو سامی نہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ثابت ہو جاتا ہو کہ اس زبانکو جو اُنس اور جیسا اتحاد بھاشا اور سنسکرت سے ہے فارسی عربی سے نہیں۔ اور اسی کا یہ نتیجہ ہو کہ اُردو سے اگرچہ ہندو مسلمان دونوں کو قریبی تعلق ہوا اور دونوں اسکے پیدا کرنیوالے ہیں۔ مگر ہندوؤں کا تعلق زیادہ مضبوط اور بہت بڑھا ہوا ہو۔

عبدالحلیم شرر

وسعت خیال

(باجازت)

خیال ایک ظرف ہی جو جزئیاتِ محسوسہ کا مخزن ہی عام ہی کہ وہ جزئیاتِ حسِ ظاہری سے محسوس ہوئی ہوں یا حسِّ باطنی سے۔ یہ وہ ظرف ہی جس میں وسعت ہی وسعت ہے تنگی اس ظرف کے سامنے دل تنگ ہی اور عقلِ انسان اس کے دائرہ وسعت سے دنگ جسقدر معلومات بڑھیں گے اسی قدر یہ ظرف بھی وسیع ہو جائیگا۔ محسوسات اور معلومات آنے نہیں پاتے کہ یہ میزبان پہلے ہی اپنی فیاضی اور سیرچشمی سے اُنکے لئے فرودگاہ تجویز کرلیتا ہی۔ خیال میں قوتِ جاذبہ اور معلومات میں قوتِ میلان ہوتی ہی اور جب یہ دونوں خلط ملط ہو جاتی ہیں تو جس طرح سرخ اور زرد یا سبز اور اودہ وغیرہ دو مختلف رنگوں کے ملنے سے ایک تیسرا رنگ پیدا ہو جاتا ہی اسی طرح جب ظرفِ خیال میں معلومات کا تداخل ہوتا ہی تو نہ صرف قوتِ علمی بلکہ قوتِ خیالی اپنا رنگ دکھاتی ہی اور قوتِ فاعلی اور انفعالی کا اثر زبان پر یا قرطاس پر ظاہر ہو جاتا ہی۔ ہم آج کل جو کچھ کرشمے دیکھ رہے ہیں یہ سب وسعتِ خیال کے ہی طفیل ہیں۔

اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب تک معلومات نہ ہو ظرفِ خیال کوئی شے نہیں جس طرح مکان کی زیب و زینت مکین سے ہی اسی طرح ظرفِ خیال کی رونق معلومات سے ہی فلاں شخص کے خیالات بہت صاف اور بلند ہیں، اس کے یہ معنی ہیں کہ اُسکے معلومات

وسیع ہیں۔ فلاں شخص کا دماغ روشن ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ علم و فن کی روشنی نے جہالت کی تاریکی زائل کردی ہے اور صحتِ خیال میں ایک شب چراغ روشن کر دیا ہے۔ جس شخص کی معلومات صحیح اور خیالات صاف ہیں وہ کبھی تنہا نہیں رہ سکتا اُسکے پاس ہر وقت ایک مونس و مشیر رہتا ہے ؎

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہو

شعرا اور انشا پرداز اسی کے سہارے جیتے ہیں۔ خیالات کا خزانہ جس شخص کے قابو میں ہو وہ اپنے کو بادشاہ سمجھتا ہے وہ جلوت سے گھبراتا ہے خلوت ہی کو اپنی زندگی کا ٹھکانا سمجھتا ہے، جس شخص کو تصفیۂ خیال حاصل ہے ذرا صوفیوں سے پوچھو کہ اُس کا کیا مرتبہ ہے اگر تصفیۂ خیال نہ ہو تو عبادت و ریاضت بالکل ہیچ ہے۔ عرفی کہتا ہے ؎

کسے کز طاعتِ لذّت بود محروم من ضامن کہ بگزارند در جنت ولے با داغ حرمانش

یعنی جو شخص رات دن عبادت و ریاضت کرتا ہے اور طاعتِ الٰہی کی لذّت سے نا آشنا ہے۔ میں اس بات کا ضامن ہوں کہ اُس کو جنت میں ضرور داخل کرینگے مگر داغ حرماں کے ساتھ، یعنی دیدار الٰہی حاصل نہوگا۔ ایسے شخص کو گویا رات دن کے آٹا پیسنے کی اُجرت یعنی چند کھوٹے پیسے ملجائیں گے۔ بڑے بڑے لوگ اسی تصفیۂ خیال کے لئے مٹ گئے اور مرگئے مگر بہت کم ایسے انسان گزرے ہیں جن کو یہ دولت نصیب ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ خیال کی وسعت صرف معلومات سے ہوتی ہے لیکن اُس میں صفائی، پاکیزگی، جدت، جودت اور روشنی اُسی وقت آتی ہے جب کہ وہ حق کی تلاش میں سرگرم ہو کر اپنی مُراد کو پہنچ جاتا ہے۔ طاعتِ خداوندی سے بشرطیکہ شوق، ذوق، خلوص و صفائی قلب سے کی جائے، خیال کا تصفیہ ہوتا ہے

طاعتِ الٰہی ایک صیقل ہے جو آئینۂ ہیولٰی کو صاف و شفاف کرتی رہتی ہے علماء و صلحا اور فضلاء و حکماء کی صحبت میں بیٹھنے سے خیال کو انبساط ہوتا ہے۔

فلاں شخص کے خیالات تاریک و تنگ ہیں اس کے یہ معنی ہیں کہ جس طرح اُس نے تعلیم نہیں پائی اُسی طرح علماء و فضلاء کی صحبت میں بھی نہیں بیٹھا۔ اسکو ایسے وسائل ہی میسر نہیں ہوئے جن سے ظرفِ خیال وسیع ہو کر خس و خاشاکِ جہالت سے صاف ہوتا۔ سنیاس والے جوگی۔ ترکِ دنیا کا دعویٰ کرنے والے صوفی ذاتِ بحت میں اپنے کو فانی بتانے والے وجودی جب اپنے مریدوں اور چیلوں کو کسی قابل سمجھتے ہیں تو اُن کے اُصول و عقائد میں یہ بات ٹھیری ہوئی ہے کہ عالمِ خواب میں (جس کو وہ واقعہ اور مشاہدہ یا ناسوت بتاتے ہیں) اُن کے سامنے روئے زمین کے دفائن و خزائن پیش کئے جاتے ہیں کیونکہ بیداری میں مال و دولت پر ہاتھ ڈالنے سے انسانوں کی شرم و حیا بھی دامن گیر ہوتی ہے اس لئے خزائن روئے زمین خواب میں پیش کئے جاتے ہیں کیونکہ وہ ایسا مقام اور موقع ہوتا ہے کہ کوئی مزاحم اور جاسوس نہیں ہوتا جس کی شرم سنیاس لینے والوں پر طاری ہو ایسے وقت میں اور ایسی حالت میں اگر کچھ بھی میلان اُس کی روح کو دنیوی نعمتوں کی طرف ہوتا ہے تو ٹکسال باہر کر دیے جاتے ہیں اور حکم ہوتا ہے کہ "آیاز قدرِ خود بشناس" ابھی چند روز اور بھی ریاضت کرو۔ تم میں ترقی کرنے کا مادہ اور موصل الی المطلوب ہونے کا ظرف ابھی پیدا نہیں ہوا۔ واقع میں یہ حالات کیسے ہی ہوں مگر تصفیہ خیال کی خوبی ظاہر کرتے ہیں۔

انسان جس شے سے عبارت ہے وہ صرف پاکیزہ اور روشن خیالات اور تصفیہ ادراکات کا ظرف ہے ورنہ اُس میں اور حیوانات مطلق میں مطلق فرق نہیں دنیا میں جسقدر

علوم و فنون پھیلے اور پھیلتے جاتے ہیں اور جس قدر مقدسین مذاہب گزرے ہیں جن کے نام بہت بڑی عزت کے ساتھ زبانوں پر جاری ہیں یہ سب روشن اور صاف خیالات ہی سے دنیا میں بہ نسبت دیگر افراد کے ممتاز ہوئے ورنہ جسمانی عنصر کے لحاظ سے تو سب مساوی ہیں۔ اب خیال کرنا چاہیئے کہ جس صورت میں اُن کے خیالات سے جو بڑی بڑی مجلدات میں موجود ہیں۔ طبائع اور قلوب انسانی دماغ پر یہ کچھ اثر پڑتا ہے تو اُن کی زندگی کی حالت میں قلوب انسانی کیسے کچھ اثر پذیر ہوتے ہوں گے

(شوکت)



سفر بغداد

سنہ ۱۹۰۴ء

(کراچی تا بصرہ)

(باجازت)

میں یہ نہ بتاؤں گا کہ میں کب اور کیوں اور کہاں سے روانہ ہوا، کیونکہ میرے دوست ان تمام باتوں سے واقف ہیں، اور جو مجھے نہیں جانتے انھیں بتانے کی ضرورت نہیں، صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ بغداد شریف جا رہا ہوں اور آج کل بصرہ کے اُس خوش سواد زندان میں جسے عرفِ عام میں قرنطینہ کہتے ہیں ہندوستان سے آنے کے جرم میں دس دن کی قید بھگت رہا ہوں۔

۲۶ مارچ سنہ ۱۹۰۴ء کو اپنے پیارے دوستوں سے، کچھ ارمان بھرے اور زیادہ تر حرمان بھرے دل کے ساتھ جدا ہوا، دوستوں نے جس عنایت اور محبت سے مجھے خیر باد کہا ہے، اس کے شکریہ کے بجائے شکایت کو دل چاہتا ہے، کیونکہ اُس نے جدائی کے قلق کو اور صد گونہ کر دیا۔

کراچی پہونچتے پہونچتے مجھے احباب اور اعزا کی کشش کئی اور شہروں میں بھی لے گئی ؎

چلا میں وادیِ الفت میں راہ سوزن کی
قدم قدم پہ مجھے ڈوبنے کو چاہ ملے

آخرِ کار ۳ اپریل کو جہاز "گولا" پر کراچی سے روانہ ہو گیا۔ موسم نہایت خوشگوار تھا اور سمندر کی جبیں پر ذرا بھی بل نہ تھا، اور اگرچہ میرا پہلا سمندر کا سفر تھا لیکن میں نہیں جانتا کہ سرگرانی اور طبیعت کا متلانا کسے کہتے ہیں، اور اگر سفرِ بحری ایسا ہی ہمیشہ ہوتا ہو تو میں عمر بھر سفر کرنے کو تیار رہوں۔ لیکن لوگ کہتے ہیں مئی، جون میں خلیج فارس کا مزاج برہم ہوتا ہے اور اُس وقت وہ کسی کی نہیں سنتے۔

۵ اپریل کو ۳ بجے سہ پہر کے قریب مسقط پہنچے۔ اُس مقام کو دیکھ کر طبیعت نہایت گھبرائی۔ پہاڑ ہی پہاڑ ہیں۔ جن پر درخت کیا، سوکھی گھاس تک کا ایک پتے تک کا نشان نہیں اور اُس پر حاکمِ مسقط کو دعویٰ ہے سلطانی کا۔ میری رائے میں اگر وہ اپنے تئیں مالکِ دورِ مسقط کہیں تو نہایت مناسب ہو۔ شہر مسقط پہاڑوں سے گھرا ہے اور خود پہاڑ کی ڈھال پر واقع ہے، اور دور سے تو خوش نما معلوم ہوتا ہے اور کئی منزل کے مکانات ہیں، جو سمندر کے کنارے تک چلے آئے ہیں۔ کراچی میں سردی تھی، اور آگے چل کر تو مجھے پوری پوری سردی ملی۔ مگر یہاں خیر سے ابھی سے وسطِ مئی کا لطف آ رہا تھا۔

میں نے چاہا کہ اُتر کے شہر دیکھ آؤں مگر قرنطینہ کے ڈاکٹر نے کسی کو اجازت نہ دی اور ہم مسقط کو دور ہی سے ڈنڈوت کر کے ۶ بجے شام کو روانہ ہو گئے۔ مسقط کے بعد بوشہر تک سمندر ذرا خراب تھا، مگر میری طبیعت پھر بھی خراب نہیں ہوئی ۸ اپریل کو ۸ بجے صبح بوشہر پہنچے۔ یہاں بھی اُترنے کی اجازت نہیں ملی، دوربین ہی سے شہر کو دیکھا، اور کچھ اچھا نہ پایا، (سنا ہے۔ بوشہر کے انگور کھٹے ہوتے ہیں)

مگر میں سمجھتا ہوں کہ آدھا تو شہر تو ہمارے جہاز کے گرد ہی آگیا تھا ایک صاحب مجسم قسطنطینیہ پھرتے تھے یعنی اُن کی ٹوپی پر نہایت جلی قلم سے لکھا ہوا تھا "قسطنطنیہ" جس کے نیچے ایرانی نشان یعنی شیر آگے کے پنجے میں شمشیر لئے کھڑا تھا مگر صرف ایک کمی تھی، وہ یہ کہ خود "قسطنطنیہ" صاحب کی صورت ڈراؤنی نہ تھی۔ پھر بھی میں اُن سے ہمیشہ دس قدم کے فاصلے پر رہا چار بجے شام کو انھیں بھی خیرباد کہا۔

۹ اپریل، ۷ بجے صبح۔ سبحان اللہ سبحان اللہ ہم کس خطے میں جا رہے ہیں رات ہی بھر میں یہ کیا طلسم ہوگیا، جہاز کی دونوں جانب کیا دل کش منظر ہے دو طرفہ کھجور کے درختوں کی مسلسل قطاریں ہیں، اور اُن کے پیچھے اور نیچے گلاب اور نارنگی اور انار کے درخت ہیں جو پھول اور پھل سے لدے ہوئے ہیں اور جہاں تک نگاہ دوربین کے ذریعے سے کام کرتی ہے یہ مارے خوشی کے پاگل کر دینے والا منظر سامنے ہے اور میں حقیقت میں تھوڑی دیر کے لئے پاگل ہوگیا تھا۔ جہاز پر دوڑا دوڑا پھرتا ہوں کبھی اس طرف کے منظر کو دیکھتا ہوں اور کبھی اس طرف کے۔

معلوم ہوا کہ ہمارا سفینہ سمندر چھوڑ کے دجلہ اور فرات کے مجموعہ پانی کے سینہ پر چل رہا ہے اور ایک طرف ساحل ترکی ہے اور دوسری طرف ایرانی۔ دجلہ اور فرات کے نام نے میں عرض نہیں کر سکتا کہ میرے دل پر کیا اثر کیا۔ آہ! تو اب ہم اُن دریاؤں پر ہیں، جو اسلامی تاریخ۔ اسلامی فسانہ، اسلامی ادب، اسلامی شاعری کے ہر صفحے پر موج زن ہیں۔

دجلہ و فرات! دجلہ و فرات!! تو یوں کہیے کہ یہ اُن منظروں میں سے گزرتے ہیں، اور ان ساحلوں کو سیراب کرتے ہیں جن نے سوائے کشمیر کے کہیں کسی

دریا کا کنارہ آج تک دور تک ایسا سرسبز و شاداب نہیں دیکھا، اور اصل تو یہ ہے کہ جہلم کا کنارہ شاداب ہے اور بہت شاداب ہے آخر ملک کشمیر ہے، لیکن دو طرفہ میدان نظر آتا ہے، اگرچہ سرسبز میدان ہے یہاں اس دریا کے کنارے سوائے گھنے، اونچے اور سرسبز درختوں اور پھولوں کے آپ اور کچھ نہیں دیکھ سکتے ہیں، اوپر آسمان ہے نیچے پانی ہے، اور دائیں بائیں نظر کو یہ درخت روک رہے ہیں اور یہ سلسلہ میں سنتا ہوں کہ یہاں سے بغداد تک یعنی چار سو میل تک قائم ہے، آپ کا جہاز ان سبز پوش سنتریوں کے بیچ میں فاؤ سے (جہاں سے یہ سلسلہ شروع ہوا ہے) بغداد تک جائیگا۔ شاید لوگ خرمے کے درختوں کی اس قدر تعریف سن کر زیر لب مسکرائیں گے۔ اگر یہ خیال رہے کہ یہ حجاز یا سوڈان کے خرمے کے درخت نہیں ہیں، کہ چار، پانچ ایک جگہ کھڑے ہیں اور گرد سیکڑوں میل تک ریت کا چٹیل میدان ہے۔ یہ عراقین کے نخلستان اور خرماستان ہیں جن کے سایہ میں ہر قسم کے پھول اور پھل لگے ہوئے ہیں اور دماغ کو معطر کر رہے ہیں۔

دو بجے ہم محمرہ پہونچے، یہ ایک چھوٹا سا مقام ہے، یہاں ایرانی سرحد ختم ہوئی ہے، اور یہاں سے دو طرفہ ساحل ٹرکی ہے۔

یہاں بھی وہی قرنطینہ! ”کولا یربرٹش سفارت کے ایک جج ہز آنر بلیٹر ودتھ یگرٹ قسطنطنیہ سے بغداد تشریف لے جارہے تھے، جو جہاز ہندوستان سے آتا ہے، اس کے مسافروں پر بصرہ میں ایک نہ دو، دس دن کا قرنطینہ ہوتا ہے۔ اس سے بچنے کے لئے یہ ترکیب کی گئی تھی کہ بغداد سے برٹش اسٹیم لانچ کا یٹ محمرہ بھیجا گیا تھا تاکہ وہ محمرہ سے اس میں سوار ہو کے بصرہ جائیں اور کہیں کہ میں

محمرہ سے آرہے ہوں، تو اُن پر کو قرنطینہ نہ ہوگا۔ لیکن وقت یہ آن پڑی کہ محمرہ کے قرنطینہ
کے افسروں نے کہا کہ اگر یہاں اُترینگے تو پانچ دن قرنطینہ میں رہنا ہوگا! آخرکار یہ
ہوا کہ لانچ جہاز کے ساتھ ساتھ چلا اور جب ایرانی سرحد سے نکل گئے تو ایک خالی مقام
دیکھ کر پیچھے سے جہاز کھڑا کیا گیا اور ہز آنر دکا میٹ میں سوار ہو گئے اور باقی ہم سب
یوں ہی حسرت سے دیکھتے رہے۔

محمرہ سے بصرہ صرف کوئی تیس بتیس میل کے فاصلے پر ہے، اور ذرا آگے بڑھتے
ہی بصرہ کے مکانات شروع ہو جاتے ہیں، دریا کے کنارے درختوں کے جھنڈ ہی
تیب ایجوں رہی ہیں، مگر اب ان میں اُمرائے بصرہ کے مکانات شروع ہو جاتے ہیں
اور ان قدرتی بے جان پھولوں میں انسانی زندہ پھول اور غنچے نظر آنے لگتے ہیں،
یعنی حسین اور نہایت حسین یہودی آرمینین اور خال خال ترک عورتیں لڑکے اور
لڑکیاں دوڑ دوڑ کے لبِ دریا ہمارے جہاز کو دیکھنے آتے ہیں، اور ہم دوڑ دوڑ کے
ڈک کے کنارے اُن کو دیکھنے جاتے ہیں، کاش یہ سلسلہ ناتمام ہی ہوتا، مگر وہ تو ایک
دو گھنٹے ہی میں جہاز بصرہ پہونچ گیا، اور وہاں سے سرکاری کشتی میں بٹھا کر ہم سب
قرنطینہ پہونچائے گئے ع

زنداں کو چلے مچل مچل کر

مگر حق یہ ہے کہ ہمارا قید خانہ بُرا نہیں، اُس کے سامنے دریا کا منظر نہایت عمدہ
ہے، اور رات دن کشتیوں کا تانتا بندھا رہتا ہے، یہاں گاڑی کا کام کشتی دیتی
ہے، اس لئے کہ ہر وقت بادبانی، اور غیر بادبانی اور دخانی کشتیاں سامنے سے
گزرتی ہیں، بعض یہودیوں کا جھرمٹ اُن کشتیوں میں عود بجاتا اور عربی گانے

جنھیں ہم خاک نہیں سمجھتے، اگا نا سامنے سے گزرتا ہے اور عجب پُر لطف سین ہوتا ہے۔

قرنطینہ کا مکان سیکنڈ کلاس والوں کے لئے خاصے آرام کا ہے، اور میں سوائے اس کے کہ تنہا ہوں، نہایت آرام سے ہوں، موسم بے انتہا پیارا ہے کھڑکی کے سامنے گلاب کا تختہ کھلا ہوا اور مہک رہا ہے اور اگر یہ سچ ہے کہ

بہشت آں جا کہ آزارے (ہائے مار ڈالا کمبخت مچھر نے کاٹا ہے، لکھنے میں مصروف ہونے کی وجہ سے ان کی بھنبھناہٹ کی آواز بھی تو نہیں سنی، ورنہ یہ تو خبردار کرکے کاٹتے ہیں) نباشد + کسے را با کسے (ارے تیری ایسی کی تیسی، پسو ہیں کہ قہر خدا کا، تمام کپڑوں کے اندر گھس گئے، اور مارے ددوڑوں کے تمام جسم سوج گیا) کارے (ارے توبہ پھر مچھر نے کاٹا۔ اب بغیر اس کے کہ تمام کپڑے اتار ڈالوں، پسوؤں کا ملنا مشکل ہے، مچھر کو تو آسانی سے مار بھی سکتے ہیں، کل ڈاک جائے گی، مضمون ختم کرنا ضروری ہے اور یہ کاٹ کاٹ کر بے تاب کئے دیتے ہیں) نباشد + تو یہ مقام بہشت (ہائے! ہائے! کیسا کاٹتے ہیں، میں باز آیا اس بصرہ سے، اس شدت کے مچھر اور پسو تو میں نے کہیں نہیں دیکھے) ہے۔

اور یہ خیال رہے کہ مارچ اور اپریل کے بصرہ کا ذکر کر رہا ہوں ورنہ جون، جولائی میں تو بصرہ کا نام لیتے ہوئے بھی زبان پر چھالا پڑتا ہے، رہا بغداد، تو وہ اس ولایت کا شملہ یا نینی تال یا کشمیر سمجھا جاتا ہے، کراچی سے یہاں تک جس شخص سے بغداد کا ذکر آتا ہے، اس کے تعریف کے اس کی زبان خشک ہوئی

جاتی ہے بغداد کا موسم یوں اچھا، میوے یوں اچھے، پانی یوں اچھا غرض کہ ہر چیز اچھی ہی اچھی ہے۔

اور صاف تو یوں ہو کہ جگہ تو سب یہ اچھی ہیں، مگر دس دن کا قرنطینہ، خدا کسی کو اس مصیبت میں نہ ڈالے۔ اب مجھے بھی یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ میں دس دن کی قید (غنیمت تھا کہ قید با مشقت نہ تھی) بھگت چکا ہوں قسمت میں یہ لکھا تھا۔ اب تک منظر ہی دیکھے، یا کسی آدمی سے بھی ملا؟ ہاں کیوں نہیں۔ کراچی سے جہاز پر بیٹھتے ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اب زیادہ تر واسطہ ایرانی، عرب، یہودی ترک اور آرمینیوں سے ہو گا۔

جہاز پر میرے ہم کلاس تین صاحب تھے ایک ایرانی، دو ارمنی۔ ایرانی صاحب کو اوّل تو میں انگریز سمجھا، باتیں کرنے سے خیال ہوا (چونکہ انگریزی ٹھیک نہیں بول سکتے تھے) فرنچ ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ایرانی ہیں۔ آقا محمد نمازی شیرازی نام ہے شنگھائی سے آرہے ہیں، اور وطن جا رہے ہیں شنگھائی میں بہت بڑے تاجر ہیں۔ یہ سن کے مجھے بہت بڑی خوشی ہوئی۔ حقیقت میں بعد بمبئی کے مسلمانوں کے اگر تجارت میں کوئی مسلمان قوم ہمت سے کام لیتی ہے، تو وہ ایرانیوں کی قوم ہی، ترکوں کا تو اس میں نام و نشان نہیں۔ شیرازی صاحب اپنے ملک کے شیدا تھے، اور ان کے خیالات سننے کے لئے میں نے خواہ مخواہ ایران اور ایرانیوں پر اعتراضات کرنے شروع کئے، اور مجھے نہایت لطف آتا تھا جب وہ سچے جوش و خروش سے اپنے ملک کی حمایت کرتے تھے۔

دونوں ارمنی بمبئی میں تجارت کرتے ہیں اور اپنے وطن بصرہ کو آرہے ہیں

جب وہ عربی میں باتیں کرتے تھے، تو مجھے مخالفین عربی بہت یاد آتے تھے کہ کاش وہ انھیں دیکھیں اور بتائیں کہ عربی نے ان پر کیا ستم ڈھایا، اچھے خاصے انگریز بنے ہوئے تھے۔

یہاں قوموں میں بہت مغالطہ ہوتا ہے مسلمان، عیسائی اور یہودی عبا اور قبا بھی پہنتے ہیں اور بہت سے کوٹ پتلون پہنتے ہیں، ترکی ٹوپی سب اوڑھتے ہیں اور تو اور ناموں سے بھی تو پتا نہیں چلتا کہ کون مسلم ہے اور کون غیر مسلم میرے ساتھی ارمنی جو تھے، ان کے نام تھے۔ نصر اللہ مسیح اور شکر اللہ صباغ۔

یہاں ایک اور عجیب بات دیکھی، ہمارے ہاں تو انگریز عموماً اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ہندوستانی انگریزی کپڑے پہنیں اور خاص کر یہ کہ انگریزی ٹوپی اوڑھیں، یہاں ترک اس بات کے خواہشمند ہیں کہ سب اُن کی ٹوپی اوڑھیں۔ چنانچہ یہ دونوں ارمنی انگریزی ٹوپی پہنتے تھے بصرہ پہونچتے ہی ترکی ٹوپی پہننے لگے، میں نے پوچھا تو کہا، ہم ترکی رعایا ہیں، لہٰذا ہمیں یہاں ترکی ٹوپی پہننی ضروری ہے۔

یہودی عموماً عبا و قبا پہنتے ہیں، اور عرب تو بالکل ہی۔ ترک سب یوروپین لباس پہنتے ہیں، اور اپنے تئیں یوروپین سمجھتے ہیں، یعنی عربوں، یہودیوں اور ارمنیوں سے بالاتر۔

مگر میں دیکھتا ہوں کہ یہاں سرکاری نوکر ارمنی زیادہ ہیں، اور ترک کم، اب تک مجھے پانچ چھ ترکی حکام سے واسطہ پڑا ہے۔ اُن میں سوائے احمد بک کے جو بصرہ کے سول سرجن ہیں، باقی سب (یعنی ڈاکٹر قسطنطینہ وہیڈ کلارک وغیرہ) گریک یا ارمنی ہیں،

احمد بیک نوعمر آدمی ہیں۔ ڈاکٹر کیسے ہیں یہ تو میں نہیں جانتا، مگر فیشن ایبل جنٹلمین بہت زیادہ ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کپڑے ابھی پیرس سے سلوا کر منگوائے ہیں۔

اس معاملے میں ہمارا علی گڑھ کالج دب کے نہیں رہا۔ قید تنہائی میں بیٹھا بیٹھا دوستوں کی تصویریں اور گروپ جو ساتھ لایا ہوں دیکھا کرتا ہوں وہ دو ارمنی بھی جو ساتھ ہی قید میں آئے، اور تصویریں دیکھنے لگے۔ اور پوچھنے لگے، کیا یہ سب ہندوستانی ہیں میں نے کہا، ہاں! تو انھیں یقین نہ آتا تھا، کیوں کہ وہ تو بمبئی کے بوہروں اور خوجوں کا لباس ہی ہندوستان کے مسلمانوں کا لباس سمجھتے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ یہ تو ترک معلوم ہوتے ہیں، اور ان میں سے دو ایک کی تصویر کی بہت تعریف کی ہیں لے کہا یہ کیا ہیں ہمارے کالج میں ان سے بڑھ بڑھ کر ہیں۔

جن صاحبوں کی تعریف ہوئی ہے، میں اُن کے نام نہیں لکھنے کا، جب خدا ملائےگا تو بتاؤں گا، فی الحال سب دوست سمجھیں کہ انھیں کی تعریف ہوئی ہے۔

لوگ یقین نہ کریں گے، مگر مجھے سندباد صاحب سے بھی نیاز حاصل ہوا، اب تو بہت معمر ہو گئے ہیں، اور جیسا سب جانتے ہیں، مدتِ مدید سے خانہ نشین ہیں، اور سیاحت ترک کر دی ہے۔

میں نے عرض کی کہ اب سیاحت کو کیوں تشریف نہیں لے جاتے، فرمایا کہ اب سیاحت کا اور جہازرانی کا کیا لطف، دخانی جہاز میں بصرہ سے بیٹھے، جہاں چاہو چلے جاؤ۔ نہ خوف نہ خطرہ، نہ جہاز کی تباہی، نہ نئے نئے جزیروں کا ملنا۔

میں نے عرض کیا، آپ نہیں تو آپ کی قوم، جو جہازرانی میں سب کی استاد رہی ہے وہ تو کچھ کرے۔ یا تو عرب دنیا بھر میں جہاز اور وہ بھی بادبانی جہاز لئے پھرتے تھے

یا اب بصرہ سے بمبئی تک بھی نہیں لے جا سکتے"۔ اس کو سن کر ایک آہ سرد بھری اور فرمایا "میاں تم ابھی بچے ہو، تم ان باتوں کو کیا جانو، یہ خدائی کارخانے ہیں۔ ع
ہر کسے پنج روز نوبت اوست۔ اب عرب وحشی اور جاہل ہیں، اب جو لوگ اس کے اہل ہیں ان کے پاس یہ کام گیا"۔ یہ فرمایا، اور اس نورانی چہرے پر دو بڑے بڑے آنسو ڈھلکتے نظر آئے اور پھر وہ یکایک نظروں سے غائب ہو گئے۔

اس تقریر کا مجھ پر بھی بہت اثر ہوا، بڑی دیر تک میں خیال میں محو رہا اور پھر میں نے سوچا تو دیکھا کہ ان کا فرمانا صحیح تھا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

(۲)

(بصرہ تا بغداد)

رسید مژدہ کہ ایام غم نہ خواہد ماند　　چناں نماند چنیں نیز ہم نہ خواہد ماند

چنانچہ ایسا ہی ہوا، ہمارا بھی زمانۂ رنج و محن یعنی قرنطینہ ختم ہو گیا اور ہم اپنے قفس سے باہر بال و پر نکل آئے۔ قسمت کا ستارہ اوج پر تھا یعنی اسی روز "مجیدیہ" نامی جہاز بغداد کو روانہ ہونے والا تھا بعد "خرابیٔ بصرہ" قرنطینہ کے مکان سے سیدھے جہاز پر پہونچے اب جہاز پر جو قدم پڑتا تھا اس میں ایک خاص غرور کی شان تھی، کیونکہ اب ہم آزاد تھے اور اس لفظ آزادی کے معنی کی تہ پر ہم اب پہنچے تھے۔

سہ پہر کو جہاز بصرے سے روانہ ہو گیا، اور اس وقت میں نے اطمینان سے جہاز کا چکر لگانا شروع کیا، فرسٹ کلاس میں صرف ایک ترک مصطفٰے فہمی آفندی ناظرِ دیوانِ عمومیہ ولایتِ بغداد تھے، دوسرا مسلمان میں تھا (میں بھی مجبوری سے اس کلاس میں تھا) کیونکہ سیکنڈ کلاس میں بالکل جگہ باقی نہ تھی باقی سب یہود و نصاریٰ

تھے، سیکنڈ کلاس بالکل یہود و نصاریٰ سے پُر تھی، صرف ایک تھرڈ کلاس تھی جس میں
شوکتِ اسلام ظاہر ہو رہی تھی۔ اللہ اکبر! مسلمانی حکومت میں بھی دولت اور دولت
کے ساتھ عیش و آرام دوسری ہی قوموں کے پاس ہے! تھوڑی دیر بعد کپتان سے
ریہ یاد رہے کہ جہاز ایک انگریزی کمپنی کا ہے اور کپتان انگریز ہے باتوں میں اس کا
ذکر آگیا، تو اُس نے عجیب باتیں بتائیں، یہ کپتان تیس برس سے اس جہاز پر ہے
اس لئے اس کا تجربہ کوئی آج کا تجربہ نہیں ہے۔ اُس نے کہا کہ تیس برس پہلے بغداد
کے مسلمان تاجر کسی طرح یہودیوں سے کم نہ تھے بلکہ بڑھ کے ہی تھے۔ لیکن اسوقت
یہودیوں نے یورپین یا کہنا چاہیئے امریکن ڈھنگ کی تجارت نہ سیکھی تھی، اس لئے
مقابلہ برابر کا تھا، تاجر سیدھے سیدھے لوگ ہوتے تھے۔ لیکن پھر یہودیوں نے امریکن
ٹرسٹ کا قاعدہ اختیار کیا، جس میں تاجر کا مقصد شروع شروع میں نفع حاصل کرنا
نہیں ہوتا بلکہ اپنے حریف کو نقصان پہونچانا، اس لئے وہ حریف کو تباہ کرنیکے
لئے اپنا مال کوڑیوں کے مول بیچ دیتا ہے کہ خود بھی تباہ ہو جاتا ہے اور جب مقابلہ
کے لئے کوئی نہیں رہتا، تو میدان اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور پھر وہ آہستہ آہستہ
تجارت کا مالک بلا شرکتِ غیرے ہو جاتا ہے۔ اس وقت اسی طریقے سے یہودیوں نے
مسلمان اور نصاریٰ کو تجارت کے میدان سے نکال دیا ہے اور اسوقت بصرہ و
بغداد کی تین چوتھائی دولت اور تجارت اُن کے ہاتھ میں ہے۔ یہودیوں کے بعد نصاریٰ
کا نمبر ہے اور مسلمان تیسرے درجہ پر ہیں۔ عراق و شام کے یہودی بھی قابلیت کے لحاظ
سے عجیب قوم ہیں اہل بابل انھیں قید کر کے لائے اور حالت جلا وطنی میں انھوں نے
دولت پیدا کرنی شروع کی، یونانی و رومی و عرب و عجم و مغول و ترک نے یکے بعد

دیگرے حکومت کی مگر اس قدیم قوم نے ان سب کو اپنی دولت کا چوکیدار سمجھا اور سمجھتی ہے اور انھیں اُن کی چوکیداری کا حق دیتی ہے اور خود دولت پیدا کرنے میں مشغول رہتی ہے۔ چوکیدار کبھی کبھی انھیں ذلیل سمجھتے ہیں مگر روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے تو انھیں کے آگے دستِ سوال دراز کرتے ہیں۔ اسوقت بغداد میں کوئی مہاجن اور بینکر غیر یہودی نہیں ہے۔

یہ تو اُس دولت کا حال ہے جو چلتی پھرتی چھاؤں کہی جاتی ہے (گو یہ چلتی پھرتی چھاؤں اُن کے پاس سے چلتی پھرتی نظر نہیں آتی) مگر قدرت نے ایک دولت یہاں مساوی تقسیم کی ہے اور وہ دولتِ حسن ہے۔ یہود و نصاریٰ وارمنی و عرب عراق کی سب قومیں اس سے برابر بہرہ مند ہوئی ہیں، جہاز پر سوائے میرے اور چند بمبئی ہندیوں کے جو کربلائے معلیٰ کی زیارت کو جا رہے تھے کوئی سانولا نہ تھا، یہ تو مردوں کی کیفیت تھی اور عورتوں کے حسن کا عالم تو یہاں کچھ اور ہی ہے۔ میں نے بغداد میں ابھی تک سوائے حبشیوں کے کوئی کریہ المنظر عورت نہیں دیکھی حسن یہاں سب میں یکساں ہے۔ لیکن چونکہ عیسائیوں اور یہودیوں میں پردہ مطلق نہیں، اس لئے جلب نظر یہ زیادہ کرتی ہیں عراق کشمیر یا یورپ کی طرح سرد ملک نہیں، قریب قریب ہندوستان کے برابر گرم ہے۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ قدرت نے یہ نعمت بھی یہاں کے لوگوں کو ایسی دریا دلی سے دے رکھی ہے؟ جہاز پر بھی مجمع حسینوں کا غیر معمولی تھا اور دوسرے روز مجھے معلوم ہوا کہ چھوٹے پیمانہ پر محاصرۂ ٹرائے اور محاصرۂ چتوڑ گڑھ کے واقعات "جدیدیہ" پر بھی ہو رہے ہیں اور ہیلن اور پدمنی کی ایک جانشین دو یہودی خاندانوں کے امن و امان میں خلل انداز ہے، یعنی ایک نہایت حسین لڑکی مع اپنے والدین کے بغداد جا رہی تھی

اس لڑکی کی شادی بغداد کے ایک نوجوان یہودی سے ٹھیری تھی وہ بھی ساتھ تھا لیکن جہاز پر ایک دوسرا نوجوان مع اپنے والدین کے تھا۔ جو لوگ اس بات پر اڑے ہوئے تھے کہ اول الذکر نوجوان سے شادی نہ ہونے دیں بلکہ اس لڑکی کو اپنے گھر کا نور بنائیں۔ روزانہ ان تینوں خاندانوں میں کسی نہ کسی بہانے سے لڑائی ہوتی تھی یہاں تک کہ بعض اوقات کپتان کو دخل دینا پڑتا تھا ؎

شہر ہمہ ست کز یں فتنہ پر آشوب شود ایں قدر نیز نباید کہ کسے خوب شود

مگر ہیلینیوں اور پدمنیوں کے نئے پیرس اور علاء الدین خلجی ضرور پیدا ہو جاتے ہیں جو اُن کی خاطر ہزارہا خلق خدا کا خون کر دیتے ہیں یہاں اگر تین خاندانوں میں لڑائی ہو گئی تو کونسا تعجب ہے۔

دوسرے روز شط العرب (جسے میں نے اس سے قبل دجلہ و فرات کا مجموعہ یا بانی نام نہ معلوم ہونے کی وجہ سے کہا تھا) ختم ہو گیا۔ یعنی وہ مقام آگیا، جہاں دجلہ و فرات کا سنگم ہوتا ہے۔ اور پھر ہمارا جہاز الف لیلہ کے چہیتے اور شیخ سعدیؒ اور شعرائے عرب کے ممدوح دریائے دجلہ پر چلنا شروع ہوا۔ اللہ رے دجلہ کی پیچیدگیاں ایسا ہی کوئی دریا اسقدر پیچ اور چکر کھاتا جاتا ہو۔ اسوجہ سے جہاز بہت کم فاصلہ طے کر سکتا تھا۔ اگر دریا سیدھا بہتا تو جہاز زیادہ فاصلہ طے کرتا۔ مگر مجھے ایسے پُر لطف منظر کب نظر آتے؟ ہاں اس وقت یاد آیا، فاؤ سے بصرے تک کے منظر کی میں نے بیحد تعریف کی تھی اور لکھا تھا کہ میں سُنتا ہوں کہ بصرے سے بغداد تک دریا کے دونوں کناروں پر ایسے گھنے درخت نہ تھے جیسے فاؤ سے بصرے تک تھے، لیکن پھر بھی بڑے اعلیٰ درجہ کے اور دلکش نخلستان نظر آئے جو شاداب ہیں تو بصرے کے

نخلستانوں سے شاید بڑھے ہی ہوئے تھے اور دجلہ کے کنارے صحرا نوردبدؤں کے خیمے بھی نظر آئے ہمارے جہاز کو دیکھ کر یہ لوگ کنارے پر ساتھ ساتھ دوڑتے اور چیختے چلاتے تھے اور جہاز کے مسافران کے لئے خرمے اور نارنگیاں پھینکتے تھے جنھیں وہ بڑے شوق سے اُٹھاتے تھے اور ناچتے تھے، ان لوگوں کو دیکھ کر مجھے خیال آتا تھا کہ یہ بھی قضا و قدر کا ایک چھوٹا سا مذاق ہے کہ جن ممالک میں ہزاروں برس اوّل مدنیت نے ایسی ترقی کی ہو کہ بابل، نینوا و مدائن کا نام تاریخ میں یادگار رہے، وہاں بیسویں صدی عیسوی میں بادیہ نشین عرب اپنے خیمے لگائے پڑے ہوں اور تمدن میں صرف اتنے بڑھے ہوں کہ گلے چراتے ہوں کون کہہ سکتا ہے کہ انسانی ترقی دیرپا ہے؟ اب ہم اس خطے میں جا رہے تھے جس کا چپہ چپہ قدیم تاریخ کی زینت ہے۔ وہ جہاں بکریاں چر رہی ہیں طاق کسریٰ ہے، وہ مٹی کا ڈھیر جو مزبلہ معلوم ہوتا ہے سلوکیا (مدائن) ہے۔ وہ کونے میں انق کے کنارے جو مقام نظر آتا ہے وہاں یونانی جنرل فلاں و فلاں خیمہ زن ہوا تھا اور وہاں رومن شاہنشاہ کا پرچم لہراتا تھا جب وہ یہاں سے گزرا تھا۔

جو تھے روز یار تھا، گلزار تھا، باد صبا تھی، میں نہ تھا؟ نہیں میں بھی تھا دن کے نو بجے تھے آفتاب میں مطلق تمازت نہ تھی، ہوا نہایت خوشگوار تھی، کہ ہم شاہد مقصود سے ہم کنار ہوئے یعنی دار السّلام مدینۂ بغداد پہونچے۔

جہاز آہستہ آہستہ گمرک بغداد (کسٹم ہوس) تک پہونچا، اس عرصے میں میرے خیالات نے آہ! کس کس زمانے اور کس کس وقت کی سیر کرلی اور کن کن واقعات کو مجسم کرکے اپنے سامنے بلا لیا! مگر گمرک پہ پہونچنا تھا کہ سُبک سیر خیالات عہد خلافت عباسیہ سے بڑی بیدردی سے واپس بلائے گئے۔ کشتی والوں اور حمالوں کی

ایک فوج سے ہیں محصور کر لیا گیا۔ جنہوں نے بڑی فصاحت اور روانی کے ساتھ مجھے عربی سنانی شروع کی، اور میری طرف سے اُس عربی کی داد نہ ملنے پر کسی نے بکس اٹھایا کسی نے بستر۔ میں کچھ فارسی کی لیاقت جتاتا ہوں اور کچھ ترکی کی ٹانگ توڑتا ہوں مگر وہاں کون سنتا ہے۔ آخر یہی مناسب سمجھا کہ اگر اسباب گم کرنا منظور نہیں ہے تو ان لوگوں کے ساتھ ہو لینا چاہیئے ؎

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست   می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

اسباب ایک کشتی میں رکھدیا گیا، اور میں بھی اس طرح گویا کہ اسباب کا ایک جزو ہوں ایک کونے میں رکھدیا گیا، اور یوں یا بدستِ دگرے، دست بدستِ دگرے، ہم (یعنی میں معہ اسباب) کمرک پہونچے، اور وہاں اپنی قلیل ترکی دانی نے اسقدر سمجھادیا کہ اگر اپنا کل اسباب بکھروانا نہیں چاہتے، اور اپنی کل کتابیں ضبط کرانا نہیں چاہتے تو ایک روپیہ افسر کمرک کے بھینٹ چڑھاؤ۔ ہم نے خوشی خوشی اُس قاضی الحاجات روپئے کو نذر کیا اور کمرک سے باہر آئے، یہاں ایک صاحب جو میرے آنے سے واقف تھے۔ مگر مجھ سے واقف نہ تھے ملے، میں نے اپنے تئیں اُن کے سپرد کیا اور اب ہماری پریشانیوں اور تکالیف کا خاتمہ ہو گیا۔ بعد الحمد۔

.. ..

.. ..

.. ..

آج مجھے بغداد میں دو مہینے ہو گئے ہیں، اس لئے اس کے متعلق رائے کچھ دیکھ کے قائم ہوئی ہے۔ یورپ والے تو ہندوستان کے اعلیٰ سے اعلیٰ شہروں کو بھی خراب کہتے

ہیں لیکن جہاں تک میونسپلٹی کا تعلق ہے، بغداد، ہندوستان کے شہروں سے بھی گیا گزرا ہے۔ یہ نہیں کہ یہاں میونسپلٹی نہیں، میونسپلٹی ہے، اس کا رئیس (پریسیڈنٹ ہے) اور منتخب شدہ اور حکومت کے نامزد کردہ، دونوں قسم کے اعضاء (ممبر) ہیں، مگر شہر کے اور شہر چھوٹا نہیں، بڑا عمدا شہر ہے) تمام گلی کوچے کچے ہیں، کوئی پکی سڑک نہیں، کوچے تنگ اور پیچدار جن میں ہفتہ بھر کوڑا پڑا رہتا ہے، ہفتہ میں ایک مرتبہ صفائی ہوتی ہے صرف میدان یعنی وہ حصہ جہاں ترک رہتے ہیں اور کچہریاں ہیں، صاف ہے اور وہاں سڑکیں بھی چوڑی ہیں، اگرچہ کچی لیکن ع

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

بغداد کے مکان سب پکے اور شاندار ہیں، دجلہ کے دونوں کنارے قصر بہت خوبصورت اور نئی وضع کے ہیں، سڑک سے مکانوں میں داخل ہو جیئے تو تعجب ہوتا ہے کہ مکانوں میں کیسی صفائی رکھی جاتی ہے۔ یہاں عام طور پر لوگ مصارفِ زندگی میں زیادہ خرچ کرتے ہیں، مکانات کے تمام کمرے الافرنگ (یوروپین وضع میں) سجے ہوتے ہیں۔ سلاملق یا مسافر اودہ سی (ڈرائنگ روم) کی آرایش میں بہت صرف کیا جاتا ہے اور اکثر ڈرائنگ روم کے سٹ نہایت خوبصورت اور قیمتی ہوتے ہیں۔ اہلِ بغداد کے شوق کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ باوجود ان سڑکوں کے یہاں بہت سی فٹن اور بگھیاں ہیں اور کم دبیش سو بائسکلیں ہیں جو ان سڑکوں پر خدا ہی جانتا ہے کس طرح دوڑتی پھرتی ہیں۔

گورنمنٹ ہوس یعنی وہ عمارت جس میں تمام کچہریاں اور دفاتر ہیں اور جسے یہاں سرائے حکومت کہتے ہیں۔ بڑی شاندار عمارت اور دفاتر ہندوستان کے دفتروں

کے بلکہ ان سے بہتر سجے ہوئے ہیں۔

مدینۃ العلم والفضل بغداد، اپنی تمام فضیلت کھو بیٹھا ہے۔ مدرسہ نظامیہ کے شہر میں آج پرانی یا نئی تعلیم کا کوئی ایسا مدرسہ نہیں ہے جسے کالج کے لقب سے یاد کیا جائے ہاں دس بارہ اسکول ہیں، جن میں زیادہ تر یہود و نصاریٰ کے یا امریکن مشن پروٹسٹنٹ مشن فرنچ کیتھولک مشن کے ہیں۔ یہ اسکول ہندوستان کے مشنری اسکولوں کی طرح بہت منتظم اور عمدہ حالت میں ہیں۔ مسلمانوں کی طرف سے کوئی اسکول نہیں۔ صرف حکومت کی طرف سے چند اسکول ہیں۔ مثلاً مکتب ابتدائیہ، مکتب رشدیہ، مکتب اعدادیہ، مکتب صنائع، مگر اہل شہر عرب مسلمان ان میں بھی کم پڑھتے ہیں، ترک ہی زیادہ تر ان مدرسوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

مکتب اعدادیہ فوجی اسکول ہے، یہاں سے تعلیم پاکر طلبہ قسطنطنیہ کے ملٹری کالج میں بھیجے جاتے ہیں۔ اعدادیہ کے سب طالب علم فوجی وردی پہنتے ہیں اور یہ گورے گورے چھوٹے چھوٹے کپتان و کرنیل و جنرل اپنی چھوٹی چھوٹی وردیوں اور لال لال ٹوپیوں میں بہت ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ کیا خبر ہے کوئی آیندہ زمانے کا عثمان پاشا ان ہی میں پڑھ رہا ہو۔؟

یہاں تعلیم نسواں کے معنی صرف مضامین متعلق تعلیم نسواں لکھنا نہیں ہے عیسائیوں اور یہودیوں کے تو بہت سے مدارس نسواں ہیں۔ اس کے کہنے کی ضرورت نہیں، مسلمانوں کے لئے بھی ایک مکتب نسواں ہے، جو ہائی اسکول کے درجہ تک ہے۔ اور اس میں ترکی اور بعض عربی خانمیں پڑھتی ہیں۔ خانموں کے ذکر میں پردہ کا ذکر بھی بے موقع نہ ہوگا یہاں تمام مسلمان عورتیں، ادنیٰ اور اعلیٰ درجہ

کی برقع اوڑھ کر خود بازار جاتی ہیں اور خود خرید و فروخت کرتی ہیں، ترکی خاتونوں کا پردہ بالکل برائے نام ہوتا ہے اُن کے چہرے کا نقاب اسقدر باریک ہوتا ہے کہ بعض اوقات قریب سے دیکھنے والوں کو چہرہ صاف نظر آتا ہے۔ لباس ترکنوں کا بالکل انگریزی ہے لیکن عربنوں کا عربی ہوتا ہے۔

ترکی حکومت کا سِول انتظام کیسا ہی ہو، اور خدا شاہد کہ اس میں اصلاح کی سخت ضرورت ہے، لیکن میں افواج عثمانی کی بہت تعریف سُنتا تھا، وہ بہادر اور توانا ضرور ہیں مگر اتنا کہنا پڑتا ہے کہ احمد فیضی پاشا[1] مشیر (کمانڈر انچیف) ولایت بغداد عساکرِ عثمانیہ کو اچھی حالت میں نہیں رکھتے، وردیاں پھٹی ہوئی ہیں، جوتے ٹوٹے ہوئے ہیں اور وہ اس حالت میں سڑکوں پر پڑی پھرتے ہیں۔ میں سنتا ہوں کہ ممالکِ عثمانیہ کی دیگر ولایات ایسی ابتر حالت میں نہیں ہیں، انھیں خرابیوں کے رفع کرنے کے لئے سلطنتِ عثمانیہ میں نئے تعلیم یافتوں کی ایک پارٹی ہے جسے یہاں عام طور پر اس کے فرانسیسی نام (نوجوان ترک) کے نام سے پکارتے ہیں، اور جسے انگریزی اخبارات ینگ ٹرکش پارٹی کے لقب سے یاد کرتے ہیں، یہ پارٹی ٹرکی کی نیشنل کانگریس سمجھنی چاہیئے۔ صرف فرق اسقدر ہے کہ اس ٹرکش نیشنل کانگرس کے ممبر ٹرکی میں ابھی زبان نہیں کھول سکتے اور انڈین نیشنل والے دھڑلے سے ہندوستان میں جلسے کرتے ہیں اور اخبار نکالتے ہیں۔ بانی اس پارٹی کا مرحوم مدحت پاشا تھا جسے میں اپنے اعتقاد کے موافق ٹرکی کا لبرل سید احمد خاں اور پولیٹکل نجات دہندہ سمجھتا

---

[1] یہ ولایت بغداد کے مشیر ہیں اور اب کوئی سال بھر سے والی بغداد (گورنر جنرل بغداد) بھی یہی ہیں۔ یہاں عام طور پر ان کے انتظام سے ناراضی پھیلی ہوئی ہے۔

ہوں۔ اس پارٹی والے بے چارے لندن اور پیرس میں جا جا کر جلسے کرتے ہیں وہاں سے اخبار نکالتے ہیں مگر ان کے ہمدرد یہاں بجز آں کہ بصدقِ دل دعائی کنند اور کچھ نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ پارٹی ہمیشہ ایسی خستہ حالت میں نہیں رہی، جب میں احمد مدحت پاشا کا دور دورہ تھا، تو اس پارٹی کا زور تھا، اور ۱۸۷۶ء میں ترکی کو پارلیمنٹ نصیب ہوگئی تھی۔ کاش وہ دورہ قائم رہتا، تو آج ترکی کا چھوٹا بھائی جاپان ایسا ترقی نہ کرتا، بلکہ ترقی کی بساط پر اس کے ساتھ یہ بھی بیٹھی ہوتی۔

اس پارٹی کے چند ممبروں سے میری بھی ملاقات ہوئی اور تبعہ دولتِ اجنبی سمجھ کر اپنے خیالات کو انھوں نے مجھ سے ظاہر نہیں کیا۔ اُن کی لیاقت اُن کی وسعتِ نظر، اُن کی حبِ وطن اور حبِ ملت دیکھ کر مجھے تعجب ہوتا ہے کہ یہ لوگ ملک کے دشمن سمجھے جاتے ہیں۔ یہ لوگ سلطان عبدالحمید خاں سے بالکل خوش نہیں اور انھیں ہمیشہ تخت سے اتارنے کے درپے رہتے ہیں، ابھی حال ہی میں ریوٹر نے اطلاع دی تھی کہ خود سلطان کے داماد، کامل پاشا مع بہت سے اعلیٰ عہدہ دار کے شاہزادی خدیجہ دخترِ معزول سلطان مراد خاں کے ساتھ خفیہ خط و کتابت رکھنے کے جرم میں پکڑے گئے۔ یہ بھی ینگ ٹرکش پارٹی کی ناکام کوششوں سے ایک کوشش تھی، یہاں اس کے حالات مفصل معلوم ہوئے ہیں، کوشش یہ تھی کہ سلطان عبدالحمید خاں کو معزول کرکے سلطان مراد کو دوبارہ تخت پر بٹھائیں، مگر پوری نہ ہوئی، نوجوان ترکوں کو چھوڑ کر عام اہلِ ملک بہت وفادار معلوم ہوتے ہیں۔

اللہ اللہ! بغداد کی خاک میں کیسے کیسے بزرگ سوتے ہیں، امام موسیٰ کاظم و امام محمد تقی علیہم السلام، شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ

اُن کے مزاروں کی زیارت میں نے کی! اور ہر جگہ نہ معلوم کن کن خیالات کا ہجوم ہوا افسوس ہے کہ میں مذہبی آدمی نہیں اور نہ مجھے مذہبی واقفیت ہے تاہم میرے بیہودل پر اس امر کا اثر ہوتا تھا کہ میں ان بزرگوں کی حضوری میں ہوں جو اپنے علم، اپنی فضیلت اور اپنے تقدس کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کیلئے باعثِ فخر و سببِ برکت تھے،

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا مزار نہایت ہی شان دار ہے! مگر شیخ، اور امام ابوحنیفہؒ کے مزاروں کی عمارتیں بہت اعلیٰ درجہ کی نہیں! تاہم کیا اُن کی شان مزار کی رفعت سے مستغنی نہیں؟

مگر دارالخلافۂ بغداد کے شاہی محل کہاں ہیں؟ وہ کتب خانے وہ مدرسے، وہ رصدگاہیں کدھر ہیں؟ مدرسۂ نظامیہ کس جگہ ہے؟ قصرِ خلد کس طرف ہے؟ آہ! یہ سوالات ہلاکو خاں سے کرو۔ ہم کیا جواب دیں۔ شمس العلماء مولانا حالی دہلی کے سیاح سے کہتے ہیں ؎

دیکھا اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
لیکے داغ آئیگا سینے پہ بہت اے سیاح

لیکن یہاں اس نصیحت کی بھی ضرورت نہیں، کیونکہ یہاں کھنڈر تک نہیں رہے ولایتِ بغداد کے سرکاری سال نامہ میں مؤلف تاریخی عمارات کے ذکر میں فرماتے ہیں!

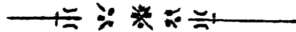
جہاں آج کل دفترِ نظارتِ رسومات ہے، وہاں مدرسۂ نظامیہ تھا!"

ہارون اور ماموں کی تمام کوششوں کا یہ نتیجہ ہے!! ہاں ایک زبیدہ کا مقبرہ تو شکستہ حالت میں باقی ہے، جہاں عرب راہزن رات کو جمع ہو کر مالِ غنیمت آپس میں تقسیم کرتے ہیں۔ بابل جو ہزاروں برس پہلے تباہ ہوا اس کے کھنڈر تو باقی ہوں اور نہ باقی ہوں تو عباسیوں کے جاہ و جلال کے نشان! مگر بابل کو ہلاکو نے تھوڑا ہی

تاراج کیا تھا۔
کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ جو قوم بغداد کو تباہ کرے، اُسی کی ایک شاخ جامع مسجد و قلعۂ دہلی، تاج محل آگرہ جیسی عمارتیں ہندوستان جا کر بنائے! کیا یہ مغلوں کی طرف سے تباہی بغداد کا نادانستہ کفارہ تھا؟

بہر حال اے بدبخت دہلی و آگرہ: تم پھر بھی خوش نصیب ہو کہ تمھاری بہت سی عمارتیں قائم ہیں! اور تمھارے کھنڈر ابھی غائب نہیں ہوئے مگر اے بغداد! ———؟

سجّاد حیدر (یلدرم)



فروغِ ادب

(باجازت)

اگر ادبی رسالوں کی کثرت۔ اخبارات کی بہتات اور نئی کتابوں کے اشتہارات کو دیکھ کر رائے لگائیں۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس زمانہ میں علم ادب کو بہت فروغ ہے۔ اور اُردو زبان کے دن پھرنے والے ہیں۔ لیکن نظر غائر سے دیکھیں۔ تو یہ آثار ترقی محض سطحی ہیں۔ اور ابھی ہمارے مُلک میں لٹریچر کی وہ قدر جس کا وہ مستحق ہے۔ پیدا نہیں ہوئی ابھی نہ ادیبوں کو یہ خبر ہے۔ کہ ان کے سینوں میں کیسی دولت اور اُن کے دماغوں میں کیسی قوت پنہاں ہے۔ اور نہ ان کے خرمنِ ادب کے خوشہ چین یہ جانتے ہیں۔ کہ انھیں ادبی خدمت کرنے والوں کی کس درجہ قدر کرنی چاہیئے۔

دُنیا میں لٹریچر سے بڑے بڑے کام نکلے ہیں اور نکل سکتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کی اُردو خواں دنیا ابھی اس اصول سے بہت کچھ بے خبر ہے۔ لٹریچر بظاہر تو الفاظ کا مجموعہ ہے مگر الفاظ اگر دل سے نکلیں۔ اور کسی عالی دماغ کے افکار کا نتیجہ ہوں تو تاثیر میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور دلوں میں گھر کر جاتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ادیب فنا فی الادب ہو جائے۔ اُٹھتے۔ بیٹھتے۔ سوتے۔ جاگتے اسے فکر سخن کے سوا اور کوئی کام نہ ہو۔ وہ ہو اور اُس کی کتابیں۔ وہ ہو اور اُس کے خیالات دُنیا کے معمولی تفکرات سے جہاں تک ممکن ہو اس کی قوم یا اس کا ملک اُس کو بیفکری مُہیا کر دے اور عملی زندگی کی کشمکش سے وہ الگ اور آزاد رہے۔ یہاں کیا ہوتا ہے

جہاں کہیں کسی شخص میں اس کمال کی جھلک نظر آئی۔ لوگ ہر قسم کی توقعات اس سے وابستہ کر لیتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے معمولی تحریرات کا کام بھی اسی سے لو۔ کوئی کہتا ہے تقریر کے لئے بھی اِسے ہی بلاؤ۔ کوئی اسے کسی تحریک کا بانی بنانا چاہتا ہے۔ کوئی کسی تجویز کا عملی پیشوا۔ بیچارہ ادیب آخر انسان ہی تو ہے۔ اور کوئی انسان کمزوریوں سے خالی نہیں۔ اسے یہ گوناگوں رجوع خلائق اپنی اصلی جگہ کھڑا نہیں رہنے دیتا۔ کہیں میدانِ تقریر کی تالیوں کی دلکش آواز اُسے لبھاتی ہے۔ کہیں عارضی تحریروں کی داد اُسے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ کبھی سیاسی تحریکوں کی دلچسپی اور آسان شہرت اُسے اپنا گرویدہ بناتی ہے۔ اور کبھی وہ تجارتی تجاویز سے مالا مال ہونے کی آرزو کا شیدائی ہوتا ہے۔ اس رنگارنگ کی کشش کے سبب خالص ادبیات کی راہ سے معراجِ کمال پر پہونچنا اُسے ایک کٹھن راستہ نظر آتا ہے۔ جب وہ یہ سوچتا ہے کہ اگر وہ ایک گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر محوِ سخن رہیگا تو خواہ وہ کیسے ہی اچھے اور اچھوتے خیال پیدا کرے۔ مدتوں خود اس کے سوا کوئی ان کا مزا لینے والا نہ ہوگا۔ اگر ان کو شائع کرنا چاہیگا۔ تو اس کے پاس اشاعت کے خرچ کیلئے روپے نہ ہونگے اور اگر صرف برداشت بھی کر سکے گا تو شاید دیر تک اس مطبوعہ جنس کا کوئی خریدار نہ پیدا ہو۔ تو وہ اس شہرت کو جو فوراً یا جلد ہاتھ آئے۔ خواہ ناپائدار ہو۔ اُس شہرت پائدار پر جو ایسی مصائب کے بعد ہاتھ آئے ترجیح دیتا ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھیں تو ترقی جاہ و منصب کی ہر بلندی اور ہر شہرت اس حیاتِ جاوید کے مقابل جو ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ جنہوں نے اعلیٰ لٹریچر کی کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں کیا حقیقت رکھتی ہے؟

آج کل بہت سے ادبی قابلیت والے دماغ اپنا کام معمولی مضمون نگاری سے شروع کرکے مضمون نگاری پر ختم کر دیتے ہیں۔ مضمون نگاری بطورِ مشق تو ابتدا میں لازم ہے۔ مگر حیف ہے اگر یہی انتہا ہو۔ قوتِ مضمون نگاری اکثر وقفِ سیاسیات نظر آتی ہے۔ سیاسیات بجائے خود اہمیت رکھتی ہیں اور جدید زندگی کے لوازم میں ہیں۔ لیکن جو درجہ ہمہ اوست کا سیاسیات کو ہمارے ملک میں بعض اصحاب نے دے رکھا ہے یہ نہ اُن کے لئے نہ اغراضِ ملکی کیلئے مفید ہے بلکہ خود سیاسیات کی خدمت لٹریچر کے ذریعے سے بہت کچھ ہو سکتی ہے۔ کسی اُستادِ فن کا ایک فقرہ یا ایک مصرعہ بسا اوقات زبان زد خاص و عام ہو کر سیاسی تخیل میں ایسی لہر پیدا کرتا ہے۔ جو سارے ملک میں پھیل جاتی ہے۔ اور ملک کی سیاسی زندگی میں جان ڈال دیتی ہے۔ جو لوگ اس ایک فقرہ یا ایک مصرعہ سے محظوظ ہوتے ہیں۔ اُنھیں خبر بھی نہیں ہوتی کہ جس شخص کی زبان سے وہ فقرہ یا وہ مصرعہ نکلا ہے۔ اُس نے کتنے ایسے فقرے یا مصرعے سوچے اور رد کئے ہونگے۔ پیشتر اس کے کہ اسکی نگاہِ انتخاب ان موزوں الفاظ پر پڑی جنھیں سن کر ہر سننے والے نے یہ سمجھا کہ کہنے والے نے گویا اسکے دل کی بات کہہ دی ہے۔ امیر مینائی نے کیا خوب کہا ہے

امیر اک مصرعۂ تر تب کہیں صورت دکھاتا ہے
بدن میں خشک جب شاعر کے ہوتا ہے لہو برسوں

یہ محنت۔ یہ کوفت برداشت کرنا۔ یہ سوز یہ گداز ادیب کی زندگی کے لئے مایۂ ناز ہے اور اپنے جوہرِ اصلی کی حفاظت کرنا اس پر فرض ہے۔ اور اُس کو اُس کی حفاظت میں مدد دینا اہلِ ملک کے لئے لازم ہے۔

یہ اصول اگر عام طور پر تسلیم ہو جائے اور اس پر عمل در آمد ہونے لگے تو ادب کو وہ فروغ نصیب ہو جس کی آرزو ہے اور اس سے ملک کے حق میں مفید نتائج پیدا ہوں۔ جب اہل ادب اس اصول پر کاربند ہوں۔ اور اُن کے ابنائے ملک اُن کے کام کی کماحقہ قدر کریں تو ادب کی ترقی کا ایک نیا دَور شروع ہوا۔ اس نئے دَور کے متعلق اُردو کی ادبی دُنیا کو چند باتیں خاص طور پر ملحوظ رکھنی چاہئیں اوّل یہ کہ اعلیٰ درجہ کے ماہرانِ فن کے کمالات تو اپنی قدر دانی پر خلائق کو خود مجبور کر لیتے ہیں۔ قدر دانی وہ چاہیئے جو ہر کہ دمہ کو حسب مراتب نصیب ہو۔ یعنی جیسے کسی عمارت کے کام میں معمار، مزدور، نجار، آہن گر، نقشہ نویس، اور سب انجنیئر سب درکار ہیں۔ اسی طرح ایوانِ ادب کی تکمیل کے لئے ناظم ناثر، فسانہ نویس، مورخ اور مترجم سب بکار ہیں۔ اور ہر کسی کا کام اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے۔ گو شائقین ادب کے زمرہ میں کچھ لوگ نظم کے زیادہ دلدادہ ہونگے۔ اور کچھ نثر کے زیادہ قائل بعض فسانوں کے مشتاق اور بعض تاریخ کی طرف مائل کوئی ترجمہ سے حظ اُٹھانے والے اور کوئی طبع زاد مضامین کی تلاش میں رہنے والے۔ لیکن یہ کسی کو حق نہیں کہ ادبیات کے کسی ایک حصہ کو بے قدر یا حقیر جانے۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ ادبی دُنیا کے سب کارکن فروغِ ادب کے خواہاں ہیں اور اُن کا مقصدِ اصلی ایک ہے۔

عبدالقادر

حضرتِ داغ دہلوی اور حضرت امیر مینائی

(باجازت)

جملہ اصنافِ سخن پر قادر ہونا انسان کی ہستی سے باہر ہے کیونکہ شاعری کی دُنیا ایسی دُنیا نہیں کہ چند روزہ زندگی میں اس کی تمام منزلیں طے ہو جائیں اسکی پوری پوری سیر کرنے کے لئے عمرِ نوح درکار ہے سخن کے دریائے ناپیداکنار میں ہزار وں موتی ہیں اور بڑے بڑے تیرنے والوں نے اس میں غوطہ زنی کی مگر ایک آدھ موتی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا اُن کا خاص سبب یہ ہے کہ شاعر علوم پر خواہ کتنا ہی عبور رکھتا ہو مگر ابتداء سے اس کا دلی رجحان کسی خاص صنف کی طرف ہوتا ہے اور اسی میں اس کی مشق حاصل ہوتی ہے یعنی اگر قصیدے کی طرف توجہ ہے تو قصیدے ہی میں کامل ہوگا غزل سے دلچسپی ہے تو غزل ہی کا استاد شمار کیا جائیگا۔ مہارت پیدا کر لینا دوسری بات ہے مگر کمال صرف ایک ہی صنف میں ہو سکتا ہے۔

فردوسی، انوری، سعدی وغیرہ گو مسلم الثبوت استاد تھے لیکن ان کی شاعری بھی ابیات اور قصائد اور غزلیات کے دائرے میں محدود تھی۔ اسی طرح اُردو شعراء بھی ایک ایک رنگ کے اُستاد گزرے ہیں۔ ریختہ گوئی کا میدان بقول حضرت غالب دہلوی رح ؎

ریختہ کے تمھیں اُستاد نہیں ہو غالب
سُنتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

میر تقی کے ہاتھ رہا۔ مرثیہ گوئی اور مدحِ اہلِ بیت علیہم السلام میر انیس اور

مرزا دبیر کے حصے میں آئی۔ واسوخت اور مثنوی امانت اور میر حسن نسیم کے لئے وقف ہوئی اسی طرح آتش و ناسخ وغیرہ بھی اپنے اپنے رنگ کے استاد ہوئے غرض یہ ہی کہ استادوں کو اس فن سے واقفیت پوری ہوتی ہو مگر کمال محدود ہوتا ہی۔ ہمارے خیال میں کلیات شاعری کی سب سے بڑی جزئی غزل ہی ابتدائی مشق کا دارومدار بھی اس پر ہے اور انتہا بھی اس پر موقوف ہو کیونکہ قصائد وغیرہ کے مضامین مخصوص ہوتے ہیں جن کا نظم کرلینا ایک مشاق شاعر کے لئے بہت آسان ہی مگر غزل کا تعلق اُن جذبات سے ہے جو ہر طبیعت میں پیدا نہیں ہوتے استعارہ تشبیہ تجنیس یہ تمام باتیں حسن کلام میں داخل ہیں مگر غزل میں اُن کو بہت کم برتا جاتا ہی جذبات کا نقشہ کھینچنے کے لئے محض سادگی کی ضرورت ہی لفظی ملمع سازی اور استعارات و تشابیہ کا رنگ بھرنے سے معنی کی تصویر مسخ ہو جاتی ہی دیگر قیود اور رعائتوں کا لحاظ مضمون کی اصلیت کو خبط کر دیتا ہے۔

غزل کا مشاق اور باکمال اُستاد وہی شاعر ہوسکتا ہی جو سوز و گداز کے مضامین لکھنے میں پوری قدرت رکھتا ہو اور اس کا تیز قلم ان جذبات کو جو درد بھرے دل میں پیدا ہوئے ہیں سلیقہ سے ادا کرسکے۔

اس دور میں حضرت داغ اور حضرت امیر بھی اس پایہ کے شاعر گزرے ہیں کہ زمانے نے ان کا نام اُستادوں کی فہرست میں ہمیشہ کے لئے جلی قلم سے لکھدیا ہے بدنصیب زبان اُردو جو ایام غدر میں تاراج ہو چکی تھی اور جس کا سرمایہ حوادث کے ہاتھوں لٹ چکا تھا اس کا از سر نو آراستہ کرنا اور دُلہن بنا کر دنیائے شاعری میں لانا انھیں دو استادوں کا کام تھا یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ مردہ زبان

کے قالب میں روح پھونکنا انھیں دو معجز بیان شاعروں کا حصہ تھا۔

ان کو آپس میں ترجیح دینا آسان کام نہیں کیونکہ اگر حضرت امیر فن شاعری کے پورے پورے ماہر تھے تو حضرت داغ معاملہ بندی پر قادر تھے۔ حضرت امیر کی فکر بلند پرواز تھی تو حضرت داغ کے لئے زبان مایہ ناز تھی۔ بہر حال میزانِ سخن میں دونوں کا پلہ برابر رہا اب دیکھنا صرف یہ ہے کہ رنگ تغزل کو جس کی ہم تشریح کر چکے ہیں کس نے خوبی کیسا تھ چمکایا ہے ہم ذیل میں دونوں کے چند اشعار بطور موازنہ لکھتے ہیں اور انصاف کو مدِ نظر رکھ کر اپنی ناقص رائے بھی پیش کرتے ہیں ؎

امیر

میرے سیاہ خانے میں شب کو وہ حور تھا
پتلی کی طرح پردۂ ظلمت میں نور تھا

درحقیقت کامل تشبیہ ایسی ہی ہوتی ہے۔ یعنی سیاہ خانے میں وہ حور اس طرح تھا جیسے پردۂ ظلمت میں نور پھر پتلی کے لفظ نے مضمون کو اسقدر اجالا ہے کہ سبحان اللہ

داغ

جب تک کسی کی چاہ نہ تھی کیا سرور تھا
میرا ہی دل بغل میں مری رشک حور تھا

نہایت سادہ اور پاکیزہ مضمون ہے۔ واقعی غزلیت کی یہی شان ہے ؎

امیر

اے برق حسن یار یہ اچھا ظہور تھا
دیدار کو کلیم تھے جلنے کو طور تھا

دیکھئے اس مطلع میں نہ تشبیہ ہے نہ کوئی اجنبی ترکیب مگر مضمون کو اس صفائی سے ادا کیا ہے کہ داد نہیں دی جا سکتی۔ پھر دوسرا مصرعہ اس بلندی سے دیا ہے کہ مضمون کی شان دوبالا ہو گئی ؎

داغ
ہاں امتحانِ برقِ تجلّی ضرور تھا
کیا میں نہ تھا اس آگ میں جلنے کو طور تھا

حضرتِ امیر کا مطلع لاجواب تھا مگر حضرتِ داغ نے بھی جدّت سے کام لیا ہے امتحان کا لفظ عجب شان لئے ہوئے ہے (ہاں) کا لفظ حضرتِ داغ کے متروکات میں سے ہے مگر چونکہ یہ شعر گلزارِ داغ کا ہے اس لئے قابلِ اعتراض نہیں ؎

امیر
میرے عمل تو قابلِ دوزخ ہی تھے مگر
کرتا جو وہ نہ رحم تو رحمت سے دور تھا

اخلاقی مضمون ہے۔ یعنی میرے اعمال ضرور قابلِ دوزخ تھے مگر نہ بخشنا اُس کی رحمت سے بعید تھا۔ رحم اور رحمت میں کوئی معنوی فرق نہیں تاہم شاعر نہایت پرلطف ہے۔

داغ
کیوں نا اُمیدِ عفو ہوں کیا یہ سُنے گا وہ
اس کا نہ بخشنا تری رحمت سے دُور تھا

دونوں شعروں کا مضمون قریب قریب ہے مگر حضرتِ داغ کی ترکیب شستہ ہے اور ردیف زیادہ ٹھکی ہوئی ہے ؎ امیر

گرمیاں کرکے رُلاتے ہو مجھے یاد رہے
چھالے ڈالینگے یہ جلتے ہوئے آنسو دل میں

دل سے جلتی ہوئی آنکھوں نے جو لگا پانی
ضبطِ اُلفت نے کہا قید ہیں آنسو دل میں

دونوں شعر نہایت اچھے ہیں تخیل کا لطف بھی پایا جاتا ہے۔ اور الفاظ بھی مساعد ہیں ؎

داغ
اشک پیتا ہوں اگر ضبطِ محبت کے لئے
ریزے الماس کے بنجاتے ہیں آنسو دل میں

یہ بھی بہت اچھا خیال ہے گویا ضبطِ محبت میں آنسوؤں کا پینا زیادہ تکلیف کا باعث ہو جاتا ہے، آنسو دل کو چھلنی کرنے کے لئے الماس کے ریزے بنجاتے ہیں (الماس کا کام کاٹنا ہے) پہلے مصرع میں اشک کا لفظ موجود ہے اس لئے دوسرے مصرع میں آنسو کا لفظ بظاہر زاید معلوم ہوتا ہے مگر معنی کے لحاظ سے موزوں ہے بغیر اس کے شعر کی ترکیب درست نہیں ہو سکتی ؎

امیر
ہجر میں ہوش نہیں صبر نہیں تاب نہیں
جا بھی لے درد دل اب کیوں ہے پڑا تو دل میں

اس شعر میں تعقید کی وجہ سے قافیہ پر کسی قدر ضعف آگیا ہے تاہم مضمون قابلِ داد ہے ؎

داغ
ایک تیرے ہی نہ رہنے سے رہا کیا کیا کچھ
کوئی حسرت نہ رہی جب سے رہا تو دل میں

نہایت چست بندش ہے۔ حضرت امیر سے یہ قافیہ نہ بندھ سکا مگر حضرت داغ نے زبان کی حدود میں لاکر خوب نظم کیا ہے ؎

امیر
وہ کہتے ہیں نکلنا اب تو دروازے پہ مشکل ہے
قدم کوئی کہاں رکھے جدھر دیکھو ادھر دل ہے

کسی فارسی شاعر کا مشہور شعر ہے کہ ؎

مرا بکوئے تو رفتن چہ مشکل افتادست
بہر طرف کہ نظر می کنم دل افتادست

مگر حضرت امیر نے جدت سے پہلو بدلا ہے اور اچھی بات پیدا کی ہے ؎ داغ

قرینہ سے عجیب آراستہ قاتل کی محفل ہے — جہاں سر چاہیے سر ہے جہاں دل چاہیے دل ہے
محفل کے لئے قرینہ اور قاتل کے لحاظ سے سر و دل کا تقابل نقش بکرسی ہے
خصوصیت کے ساتھ مصرعِ ثانی نہایت دلکش ہے فصاحت کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے

امیر
مجھے تو درد ہے تیرا تجھے کیوں ہے یہ بیدردی
مرے پہلو میں بھی دل ہے ترے پہلو میں بھی دل ہے

گویا دل دل سب برابر مگر یہ متضاد عمل کیسا ہے

داغ
بھلا دیکھیں تو بازی کون لیجائے محبت میں
تم اپنے نام کے دلبر ہو اپنے نام کا دل ہے

امیر
درِ کریم پہ محشر میں تاکہ راہ ملے
گناہگاروں میں چھپ چھپ کے بیگناہ ملے

یعنی درِ کریم پہ گناہگاروں ہی کی رسائی ہوئی۔ اگر بیگناہ بھی چوری چھپے پہونچے تو انھیں کا بھیس بدل کر اور انھیں کے طفیل میں۔

داغ
قریب میکدہ مجھ کو جو تھا نقاہ ملے
گلے تو اب کے کیا کیا مرا گناہ ملے

گلے ملنے کا محاورہ کتنے اچھے موقع پر صرف کیا ہے، حضرتِ امیر کے مطلع میں متانت ہے مگر یہ مطلع شوخ ہے اور صاف ہے

امیر
دمِ اخیر تو ظالم ذرا نگاہ ملے
کچھ اس غریب مسافر کو زادِ راہ ملے

واہ کیا حسرت ہے ؎

داغ
کہاں تھے رات کو ہم سے ذرا نگاہ ملے
تلاش میں ہو کہ جھوٹا کوئی گواہ ملے

کتنا پھڑکتا ہوا مضمون ہے، گویا نگاہ کا نہ ملنا شب کی کیفیات گزشتہ کا پتہ دے رہا ہے اور اسی لئے جھوٹے گواہ کی تلاش ہے۔ یہ رنگ تو حضرت داغ کے سوا کسی کو نصیب ہی نہیں ہوا ؎

امیر
ہمیں بھی طور پہ موسیٰ کی طرح راہ ملے
کبھی تو دیکھنے والوں سے بھی نگاہ ملے

"دیکھنے والوں سے نگاہ کا ملنا" اس کا مزہ کچھ اہل نظر ہی لے سکتے ہیں ؎

داغ
بھلا ہو پیر مغاں کا ادھر نگاہ ملے
فقیر ہیں کوئی "چلو" خدا کی راہ ملے

یہاں نگاہ کے ملنے نے کچھ اور کیفیت پیدا کی ہے جس کی توضیح اشارۃً مصرع ثانی میں ہے اور یہ ترکیب تو کہ (فقیر ہیں کوئی "چلو" خدا کی راہ ملے) زبانگی جان ہے ؎

امیر
میں ہوں وہ کعبہ نشیں جا کے دیر کے در پر
پکارتا ہوں کوئی بت خدا کی راہ ملے

بت پرستی میں کم از کم اتنی تو ثابت قدمی ہو کہ باوجود کعبہ نشین ہونے کے بتوں کی آرزو دیر کے در پر لے ہی گئی اور وہاں خدا کی راہ میں سوال بھی کیا تو بتوں ہی کا شعر میں لفظی رعائتیں زیادہ تر قابل داد ہیں ؎ داغ

ترا غرور سمایا ہے اس قدر دل میں نگاہ بھی نہ ملاؤں جو بادشاہ ملے

گویا غرور دیکھتے دیکھتے خود بھی مغرور ہو گئے ؎

ہزاروں وعدے کئے پر دعا نہ کی اک دن

امیرؔ فقیر بھی ہمیں جھوٹوں کے بادشاہ سے ملے

حضرتِ داغؔ سے زبان اور محاورات کے پہلو کم چھوٹتے ہیں مگر یہ فیضانِ سخن ہے کہ اس قافیہ کا سہرا حضرتِ امیرؔ ہی کے سر رہا (جھوٹوں کے بادشاہ) ایک عام محاورہ ہے مگر فقیر کے لفظ سے اس کا حسن دوبالا ہو گیا۔ پھر مصرعِ اولیٰ میں معاملات کا ثبوت بھی اچھا ہے ؎

کروں میں عرض اگر جان کی اماں پاؤں

داغؔ کہوں پتہ کی اگر قہر سے پناہ ملے

دونوں مصرعوں کی نشست برابر ہے پھر یہ ٹکڑا کہ (کہوں پتہ کی) زیادہ معنی خیز ہے اور مزے دار ہے ؎

کرم کرے جو وہ بندہ نواز بندوں پر

امیرؔ بتوں کو ڈھونڈھنے نکلیں خدا کی راہ ملے

وہی بات ہے کہ ع کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے + بتوں کی تلاش میں خدا کی راہ ملنا نہایت پاکیزہ تخیل ہے ؎

ہوا ہے دردِ جگر سے یہ گھر اتاریک

داغؔ کہ موت ڈھونڈھتی پھرتی ہے کوئی راہ ملے

اچھی تلاش ہے ؎ امیرؔ

کھلے جو لب ترے اقرارِ وصل کرنے میں   ہوا میں خوش کہ برابر کے دو گواہ ملے

اقرارِ وصل پر برابر کے دو گواہ لبوں سے بہتر نہیں ہو سکتے۔ اُستادانہ شعر ہے

بلا سے دعوائے اُلفت نہ پیش کرتے ہم
ملے ہوئے ہیں جو دشمن سے دو گواہ ملے

اس شعر کی ترکیب بھی شُستہ ہے مگر حضرت امیر نے اس قافیہ میں بڑی فکر سے کام لیا ہے۔

مندرجۂ بالا اشعار سے نکتہ سنج ناظرین دونوں کے جوہر کمال کا اندازہ بخوبی کر سکتے ہیں۔ ہماری رائے میں فیصلہ یہ ہے کہ حضرت امیر بحیثیت مضمون آفرینی وہی شان رکھتے ہیں جو ایک کہنہ مشق اور مستند اُستاد کی ہونی چاہیئے۔ لیکن حضرت داغ کو قدرتاً طبیعت اتنی شوخ اور رسا ملی تھی کہ اس کا جواب ہونا غیر ممکن تھا تغزل کے رنگ میں مذاق دونوں کا متحد ہے بہر حال دونوں نے ادبِ اُردو کی خدمت اپنی قوت سے زیادہ کی ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ اُردو ریختہ گوئی کا وجود ابھی تک شاعری کی دُنیا میں قائم ہے اور اُس کے حامی اور زندہ رکھنے والے برقرار ہیں۔ ان دونوں محسنوں کے احسانات سے قوم قیامت تک سبکدوش نہیں ہو سکتی

قدرت میرٹھی

حصّهٔ نظم

حصۂ نظم

مرزا محمد رفیع سوداؔ

تشبیب قصیدہ

(۱)

جوں غنچہ آسماں نے مجھے بہرِ عرضِ حال
دی سو زباں دہن کو لیکن سبھی میں لال

ہرگز کسی گرہ کے لئے جز خراشِ دل
مارا نہ آسماں نے کبھو ناخنِ ہلال

روشن طبیعتوں سے بُرا ہی یہ تیرہ عقل
کرتا ہے نورِ مہر کو سایہ کے پائمال

رکھتا ہے پُر غرور کو جوں نیزہ سر بلند
جوں جادہ خاکسار کو ڈے ہے زمیں پہ ڈال

یک تن نوالہ خوار نہوا اِس سے تا ابد
ہی سرنگوں ازل سے یہ اب کاسۂ سفال

ہر روز نعمتوں سے کرے سفلہ کو غنی
محتاجِ نانِ شب ہو سدا صاحبِ کمال

پارے کو دے ہے رتبۂ اکسیر بعدِ مرگ
دولت کبھی کسو کو نہ دی اُن نے بے زوال

گر پائے سوختن نہ رہے اُن کے درمیاں
ہرگز کرے نہ شمع سے پروانہ کا وصال

ڈھانپے ہی جا نماز تلے زاہدوں کا عیب
دیتا ہی رازِ عشق کو پردے سے یہ نکال

ہم پر سدا رکھے مئے گلرنگ کو حرام
خونِ بہار تیغِ خزاں پر کرے حلال

ہر روز اُٹھ کے غنچۂ رنگِ گل کو کرے ہی تنگ
ہر شب رکھے ہی خاطرِ بلبل کو پُر ملال

اے دل غرض کسی کو نہ دے چین آسماں
شکوہ نہ کر تو اس سے کہ ناحق ہے یہ جدال

حاصل نہو سوائے مشقت کے اور کچھ — آہن کو سرد کوٹئے گر تا ہزار سال
ہم پست فطرتوں پہ چلی کب تیغ چرخ — دوڑے اُدھر ہی آب جدھر ہو زمیں پہ ڈھال
گر ہو شعور اس سے نہ چاہیں کشادِ کار — اس مطلعِ دوم کو پڑھیں جس کے حسبِ حال
گردوں سے کار بستہ کھلے کیونکہ ہے محال — ہرگز نہیں ہے عقدہ کشا ناخنِ ہلال
پس کیا ضرور تھا جو کیا شکوۂ سپہر — اے دل تو ہرزہ گوئی سے اپنی زباں سنبھال

خواہش ہے دو جہاں کی اگر تو زبان سے
جز مدح شاہ سرو علن مت سخن نکال

تشبیبِ قصیدہ

(۲)

سودا پہ جب جنوں نے کیا خواب خور حرام — لائی گھر اس طبیب کے ہے عقل جس کا نام
احوال اس کا دیکھ کے کہنے لگا طبیب — اب فصد و مسہل اس کے لئے ہے مفید عام
کہنے لگا سن اس کو وہ دیوانہ در جواب — مجھ میں لہو کہاں یہ ترا ہے خیال خام
جو کچھ کہ میرے تن میں لہو تھا سو ایکی سال — عامل نے خیر آباد کے پی کر کیا تمام
مسہل طلب کرے ہے غذا کی زیادتی — مجکو سو ماہ عید بھی گزرا مہ صیام
کیا سودا اس علاج سے کہہ اس کے ما سوا — تا اپنی میں دوا کروں اب کر کے قرض دام
تب اُن نے یوں کہا کہ بتاؤں میں وہ علاج — اس درد سے تو پا کے شفا ہو جو شاد کام
اُس کے حضور عرض یہ کر جس کے سایہ میں — مور ضعیف پیل سے لے اپنا انتقام
سنتے ہی یہ نوید قصیدہ برائے نذر — لے کر اب اس جناب میں حاضر ہوا غلام

تشبیب قصیدہ بہاریہ

(۳)

اُٹھ گیا بہمن و دَے کا چمنستاں سے عمل تیغِ اُردی نے کیا ملکِ خزاں مستاصل
سجدۂ شکر میں ہے شاخِ ثمردار ہر ایک دیکھ کر باغِ جہاں میں کرمِ عزّ و جل
قوتِ نامیہ لیتی ہے نباتات کا عرض ڈال سے پات تلک پھول سے لے تا بہ پھل
واسطے خلعتِ نوروز کے ہر باغ کے بیچ آب جو قطع لگی کرنے روِش پر مخمل
بخشتی ہے گلِ نورستہ کی رنگ آمیزی پوششِ چھینٹ قلمکار بہر دشت و جبل
عکسِ گلبن یہ زمیں پر ہے کہ جیسے آتے کارِ نقاشیٔ مانی ہے دوم دہ اوّل
تار بارش میں پروتے ہیں گہرہائے تگرگ ہار پہنانے کو اشجار کے ہر سو بادل
بار سے آبِ رواں عکسِ ہجومِ گل کے لوٹتے ہے سبزہ پہ اذبس کہ ہوا ہے بیکل
شاخ میں گل کی نزاکت یہ بہم پہونچی ہے شمع ساں گرمیٔ نظارہ سے جاتی ہے پگھل
جوششِ روئیدگی خاک سے کچھ دور نہیں شاخ میں گاؤ زمیں کے بھی جو پھوٹے کونپل
دمِ عیسیٰ سے فزوں فیض ہوا ہے یاں تک دین میں قسمِ جمادات سے شاید ہو خلل
فکر رہتی ہے مجھے یہ کہ زباں سے اپنی کہیں دعوائے خدائی نہ کریں لات و ہبل
حدِ ایام کے پیش اب مددِ نامیہ سے بچۂ مرغِ چمن تخم سے آتا ہے نکل
سبز ہوتا ہے فصیحی کے سبب سے ہر بار جو زباں سے سخن اب حوصلے کے آتا ہے نکل
دستِ گل خوردہ و شاخِ گل دگلزار ہیں بجہاں نشو و نما کرنے میں ہیں ضرب مثل
غنچہ پہ کچھ نہیں موقوف عجب شَل ہے یہ گل بہم پہونچے ہے عقدہ ہو کس طرح کا حل

اُڑے ہے اُن کے نظر لاکھ طرح کا وہ پھول | اُن گلوں چھوٹ جو نگہ کے ہیں سدا مستعمل
یاسمن رنگ جو رکھتی ہے خزاں سے مانا | چاہتی ہے لبھا جت کرے سبزے سے بدل
چشم نرگس کی بصارت کے زبس ہے درپے | غنچۂ لالہ نے سرمے سے بھری ہے مکحل
اس قدر محو تماشا ہے کہ نرگس کی طرح | چشمۂ سیارۂ گلستاں میں جھپکتی نہیں پل
آب جو گرد چمن لمعۂ خورشید سے ہے | خط گلزار کے صفحہ پہ طلائی جدول
سایۂ برگ ہے اس لطف سے ہر اک گل پر | ساغر لعل ہیں جوں کھینچے زمرد کو حل
سنگ نے رتبۂ آئینہ کیا ہے پیدا | تیغ کہسار ہوئی بس کہ ہوا سے صیقل
برگ برگ چمن ایسی ہی صفا رکھتا ہے | گل کو دیکھو تو نگہ جا رہے سنبل پہ پھسل
لرزش طاری ہوئی پھرتی ہے خیاباں میں نسیم | پاؤں رکھتی ہے صبا صحن میں گلشن کے سنبھل
اتنی ہے کثرت لغزش یہ زمین ہر باغ | جو ثمر شاخ سے اترا سو گرا سر کے بل
فیض تاثیر ہوا یہ ہے کہ اب حنظل سے | شہد ٹپکے جو لگے نشتر زنبور عسل
دانۂ جس شور زمیں میں نہ کھلا دہقاں سے | سبزہ واں دانۂ شبنم سے ہوا ہے جنگل
کشت کرنے میں ہر اک تخم سے از فیض ہوا | گرتے گرتے یہ زمیں برگ و بر آتا ہے نکل
جوہری کو چمنستان جہاں میں اس فصل | آگیا لعل و زمرد کے پرکھنے میں خلل
تا کجا شرح کروں میں کہ بقول عرفی | اخگر از فیض ہوا سبز شود در منقل

غزلیات

(۱)

مستعد ہو نہیں اُس کی تجلی کے بیاں کا | جوں شمع سراپا ہو اگر صرف زباں کا
پردے کو تعین کے در دل سے اٹھا دے | کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

اس گلشن ہستی میں عجب دید ہے لیکن ، جب چشم کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا
سودا جو کبھو گوش سے ہمت کے سنے تو مضموں یہی ہے جرس دل کی فغاں کا

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

(۲)

دل مت ٹپک نظر سے کہ پایا نہ جائیگا جوں اشک پھر زمیں سے اٹھایا نہ جائیگا
پہونچیں گے اس چمن میں نہ ہم داد کو کبھی جوں گل یہ چاک جیب سلایا نہ جائیگا
عمامہ کو اتار کے پڑھیو نماز شیخ سجدے سے ورنہ سر کو اٹھایا نہ جائیگا

ظالم میں کہہ رہا کہ تو اس خوں سے درگزر
سودا کا قتل ہے یہ چھپایا نہ جائے گا

(۳)

میرے سخن کو فہم سکے یوں فہیم کا قیمت شکن صدا ہی یہ دُرِّ یتیم کا
میخانے میں ازل کے مرے دل سے زاہدا دھویا ہے نقش ساقی نے امید و بیم کا
غنچہ کو دل کے یاں ہی دم سرد سے شگفت شرمندہ اس چمن میں نہیں میں نسیم کا
پہنے اگر لباس گدائی حریر پوش برچھی بدن پہ اس کے رواں ہو گلیم کا

سودا یقین کر اس کا دمِ فقر ہے غلط
بالیدہ ہووے جو کوئی ناز و نعیم کا

(۴)

اشک کے قطرے سے نیساں کا اثر رکھتی ہی شمع سر سے لیکر تا قدم سلکِ گہر رکھتی ہی شمع

کون ہے میرا عجز پر دانۂ مرغِ نامہ بر — شرح سے کاتب کے میرے خبر رکھتی ہے شمع
تو میرے غم سے نہ رویا اور میری خاک پر — شام سے تا صبح اپنی چشم تر رکھتی ہے شمع
راہرو سوئے عدم کو جنبش پا کیا ہے شرط — خانۂ فانوس میں ہر شب سفر رکھتی ہے شمع

حسن کو سودا جو دعویٰ سلطنت کا اب نہیں
سر پہ اپنے کس لئے یہ تاج زر رکھتی ہے شمع

(۵)

جب اس چمن میں چھوڑ کے ہم آشیاں چلے — اک ہم صفیر نے بھی نہ پوچھا کہاں چلے
کیا لہلہاتا تھا ہم نے اُلجھتا جو کوئی خار — جوں گل ہم اس کے باغ سے دامن فشاں چلے
ہر بات میں ہے ایسی کتر بیونت اس کی یاد — مقراض کی طرح سے کہ جس کی زباں چلے
غافل ہماری آہ سے رہنا نہ بے خطر — کر خوف ایسے تیر سے جو بے کماں چلے

راہ عدم بھی دور ہے سودا کہ جس کے بیچ
جس طرح پیر جائے ہے دوڑیں جواں چلے

میر محمد تقی میر

غزلیات

(۱)

دل جو زیرِ غبار اکثر تھا — کچھ مزاج ان دنوں مکدر تھا
اس پہ تکیہ کیا تو تھا لیکن — رات دن ہم تھے اور بستر تھا
سرسری ہم جہان سے گزرے — ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا

بار سجدہ ادا کیا تہِ تیغ　　کب سے یہ بوجھ میرے سر پر تھا
خوش رہا جب تلک رہا جیتا
میرؔ معلوم ہے قلندر تھا

(۲)

طریق خوب ہے آپس میں آشنائی کا　　نہ پیش آوے اگر مرحلہ جدائی کا
یہیں ہیں دیر و حرم اب تو یہ حقیقت ہے　　دماغ کس کو ہے ہر در کی جبہ سائی کا
رکھا ہے باز ہمیں در بہ در کے پھرنے سے　　سروں پہ اپنے ہے احسان شکستہ پائی کا
ملا کہیں تو دکھا دیں گے عشق کا جنگل　　بہت ہی خضر کو غرہ ہے رہنمائی کا
نہ پوچھ مہندی لگانے کی خوبیاں اپنی
جگر ہے خستہ ترے پنجۂ حنائی کا

(۳)

جان اپنا جو ہم نے مارا تھا　　کچھ ہمارا اسی میں وارا تھا
کون لیتا تھا نام مجنوں کا　　جبکہ عہدِ جنوں ہمارا تھا
ہم تو تھے محو دوستی اس کے　　گو کہ دشمن جہاں ہمارا تھا
لطف سے پوچھتا تھا ہر کوئی
جب تلک لطف کچھ تمھارا تھا

(۴)

ہوئیں رسوائیاں جس کے لئے چھوٹا دیار اپنا　　ہوا وہ بے مروت بے وفا ہرگز نہ یار اپنا
خدا جانے ہمیں اس بیخودی نے کس طرف پھینکا　　کہ مدت ہو گئی ہم کھینچتے ہیں انتظار اپنا

اگرچہ خاک اڑائی دیدۂ تر نے بیاباں کی ٹُٹے نکلا نہ خاطر خواہ ٹُٹنے سے غبار اپنا
عجب ہم بے بصیرت ہیں کہاں کھولا ہی بار آکر جہاں سے لوگ سب رخت سفر کرتے ہیں تیار اپنا
گیا وہ بوجھ سب ہلکے ہوئے ہم میر آخر کو
مناسب تھا نہ جانا اس گلی میں بار بار اپنا

(۵)

ہو کوئی بادشاہ کوئی یاں وزیر ہو اپنی بلا سے بیٹھ رہے جب فقیر ہو
یاں برگ گل اڑاتے ہیں پرکالۂ جگر جا عندلیب تو نہ مری ہمصفیر ہو
اس کے خیال خط میں کرے یاں دماغ صرف کرتی ہے بے مزہ جو قلم کے صریر ہو
کس طرح آہ خاک مذلت سے میں اٹھوں افتادہ تر جو مجھ سے مراد ستگیر ہو
حد سے زیادہ جور و ستم خوشنما نہیں ایسا سلوک کر کہ تدارک پذیر ہو
ایسا ہی اسکے گھر کو بھی آباد دیکھیو جس خانماں خراب کا یہ دل مشیر ہو
اک وقت خاص حق میں مرے کچھ دعا کرو
تم بھی تو میر صاحب قبلہ فقیر ہو

(۶)

جب نام ترا لیجے تب چشم بھر آوے اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے
کیا جانے وہ مرغانِ گرفتار چمن کو جب تک کہ بصد ناز نسیم سحر آوے
ہر سو سر تسلیم رکھے صید حرم میں وہ صید فگن تیغ بکف تا کدھر آوے
صناع ہیں سب خوار ازانجملہ ہوں میں بھی ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے
اے وہ کہ تو بیٹھا ہے سر راہ پہ زنہار
کہیو جو کبھو میر بلاکش ادھر آوے

(۷)

کوفت سے جان لب پہ آئی ہے — ہم نے کیا چوٹ دل پہ کھائی ہے
لکھتے رقعہ یہ لکھ گئے دفتر — شوق نے بات کیا بڑھائی ہے
دیدنی ہے شگفتگی دل کی — کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے
دل سے نزدیک اور اتنا دور — کس سے اس کو کچھ آشنائی ہے
یاں ہوئے خاک سے برابر ہم — واں وہی ناز خود نمائی ہے
آرزو اس بلند بالا کی — کیا بلا میرے سر پہ لائی ہے

مرگِ مجنوں سے عقل گم ہے میرؔ
کیا دوانے نے موت پائی ہے

(۸)

بات کیا آدمی کی بن آئی — آسماں سے زمین پنوائی
چرخ زن اس کے واسطے ہے مدام — ہو گیا دن تمام رات آئی
ماہ و خورشید و ابر و باد سبھی — اس کے خاطر ہوئے ہیں سودائی
کیسے کیسے کئے تردد جب — رنگ رنگ اس کو چیز پہنچائی

شکر کے سجدوں میں یہ واجب تھا
یہ بھی کرتے سدا جبیں سائی

(۹)

کعبے میں جاں بلب تھے ہم دوریٔ بتاں سے — آئے ہیں پھر کے یارو اب کے خدا کے یاں سے
جب کوندتی ہے بجلی تب جانب گلستاں — رکھتی ہے چھیڑ میری خاک آشیاں سے

آنکھوں ہی میں رہے ہو دل سے نہیں گئے ہو — حیران ہوں یہ شوخی آئی تمھیں کہاں سے
خاموشی ہی میں ہم نے دیکھی ہے مصلحت اب — ہر اک سے حال دل کا مدت کہا زباں سے

اتنی بھی بدمزاجی ہر لحظہ میر تم کو
الجھاؤ ہے زمیں سے جھگڑا ہے آسماں سے

(۱۰)

برقع کو اٹھا چہرے سے وہ بت اگر آوے — اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے
ممکن نہیں آرام دے بیتابی جگر کی — جب تک نہ پلک پر کوئی ٹکڑا نظر آوے
ہم آپ سے جاتے رہے ہیں ذوق خبر میں — اے جان بلب آمدہ رہ تا خبر آوے
مت ممتحن باغ ہو اے غیرت گلزار — گل کیا کہ جسے آگے ترے بات کر آوے

کہتے ہیں ترے کوچے سے میر آنے کہے ہے
جب جائیے وہ خانہ خراب اپنے گھر آوے

خواجہ میر درد

غزلیات

(۱)

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا — کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا
دل زمانے کے ہاتھ سے سالم — کوئی ہوگا کہ رہ گیا ہوگا
دل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں — کہیں غنچہ کوئی کھلا ہوگا

یک بیک نام لے اُٹھا میرا — جی میں کچھ اس کے آگیا ہوگا
اُس نے قصداً بھی میرے نالہ کو — نہ سُنا ہوگا گر سُنا ہوگا

دل بھی اے دردؔ قطرۂ خوں تھا
آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

(۲)

ہم نے کس رات نالہ سر نہ کیا — پر اُسے آہ کچھ اثر نہ کیا
سب کے یاں تم ہوئے کرم فرما — اس طرف کو کبھی گزر نہ کیا
دیکھنے کو رہے ترستے ہم — نہ کیا رحم تو نے پر نہ کیا
تجھ سے ظالم کے پاس میں آیا — جان کا میں نے کچھ خطر نہ کیا
کتنے بندوں کو جان سے کھویا — کچھ خُدا بھی تو نے ڈر نہ کیا
کونسا دل ہے جس میں خانہ خراب — خانہ آباد تو نے گھر نہ کیا

سب کے جوہر نظر میں آئے دردؔ
بے ہُنر تو نے کچھ ہنر نہ کیا

(۳)

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دُور نہ تھا — پر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا
رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور — شمع کے مُنہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا
ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً لیکن — میں نے پوچھا تو کہا خیر یہ مذکور نہ تھا
باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کے — وہاں پہونچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا
دردؔ کے ملنے سے اے یار بُرا کیوں مانے — اسکو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا

(۴)

چمن میں صبح یہ کہتی تھی ہو کر چشم تر شبنم
بہار باغ تو یوں ہی رہی لیکن کدھر شبنم

ہمیں تو باغ تجھ بن خانۂ ماتم نظر آیا
ادھر گل پھاڑتے تھے جیب روتی تھی ادھر شبنم

بھلا ٹک صبح ہونے دو اسے بھی دیکھیو گئے
کسی عاشق تگے رونے سے نہیں رکھتی خبر شبنم

نہ پایا جو گیا اس باغ سے ہرگز سراغ اسکا
نہ پلٹی پھر صبا ادھر نہ پھر آئی نظر شبنم

نہ سمجھا دردؔ ہم نے بھید یاں کی شادی و غم کا
سحر خنداں ہے کیوں روتی ہے کس کو یاد کر شبنم

(۵)

گر دیکھئے تو مظہر آثار بقا ہوں
اور سمجھئے جوں عکس مجھے محو فنا ہوں

کرتا ہوں پس از مرگ بھی حل مشکل عالم
بجیس ہوں یہ ناخن کی طرح عقدہ کشا ہوں

ممنوں مرے فیض کے سب اہل نظر ہیں
جوں نور ہر اک چشم کا دیدار نما ہوں

ہے مظہر انوار صفا میری کدورت
ہرچند کہ آہن ہوں پہ آئینہ بنا ہوں

احوال دو عالم ہے مرے دل پہ ہویدا
سمجھا نہیں تا حال پر اپنے تئیں کیا ہوں

آواز نہیں قید میں زنجیر کی ہرگز
ہرچند کہ عالم میں ہوں عالم سے جدا ہوں

ہوں قافلہ سالار طریق قدما دردؔ
جوں نقش قدم خلق کو میں راہ نما ہوں

(۶)

آرام سے کبھو بھی نہ یکبار سو گئے
ایسے ہمارے طالع بیدار سو گئے

خواب عدم سے چونکے تھے ہم تیرے واسطے
آخر کو جاگ جاگ کے ناچار سو گئے

اٹھتی نہیں ہے خانۂ زنجیر سے صدا
دیکھو تو کیا سبھی یہ گرفتار سو گئے

وہ مر چکے جو رونق بزم جہان تھے
اب اُٹھیے درد یاں سے کہ سب یار سو گئے

(٧)

واقف نہ یاں کسو سے ہم ہیں نہ کوئی ہم سے | یعنی کہ آ گئے ہیں بہکے ہوئے عدم سے
گر چاہیے تو ملیے اور چاہیے نہ ملیے | سب تم سے ہو سکے ہے ممکن نہیں تو ہم سے
ہر چند یہ تمنا در خور نہیں ہمارے | نزدیک تو جو آوے کیا دور ہے کرم سے
اب ہیں کہاں وہ نالے سرگشتگی کدھر ہے | تھیں سب وہ باتیں ثابت میرے ہی دم قدم سے

اے درد پر بھی کچھ تو میری ہی سی مصیبت
گھیرے ہے اور ہی غم چھوٹے جو ایک غم سے

(٨)

مرا جی ہے جب تک تری جستجو ہے | زباں جب تلک ہے یہی گفتگو ہے
خدا جانے کیا ہوگا انجام اِس کا | میں بے صبر اتنا ہوں وہ تند خو ہے
تمنا ہے تیری اگر ہے تمنا | تری آرزو ہے اگر آرزو ہے

نظر میرے دل کی پڑی درد کس پر
جدھر دیکھتا ہوں وہی روبرو ہے

(٩)

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے | کس لیے آئے تھے ہم کیا کر چلے
کیا ہیں کام اِن گلوں سے اے صبا | اِک دم آئے اِدھر اُدھر چلے
دوستو دیکھا تماشا یاں کا بس | تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے

شمع کی مانند ہم اس بزم میں
چشم نم آئے تھے دامن تر چلے

ہم جہاں میں آئے تھے تنہا ولے
ساتھ اپنے اب اسے لیکر چلے

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

دردؔ کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

سید انشاء اللہ خاں انشا

غزلیات

(۱)

فقیرانہ ہے دل مقیم اس کی رہ کا
غرض کیا کہ محتاج ہو بادشہ کا

خرابات کی جب سے لذت پڑی ہے
چھٹا بیٹھا مسجد و خانقہ کا

صنم خانہ جاتا ہوں تو مجھ کو ناصح
نہ بہکا نہ بہکا نہ بہکا نہ بہکا

تری آشنائی میں کیا ہم نے پایا
دیا نقد دل اور اپنی گرہ کا

کبھی تجھ سے انشاؔ نے بوسہ نہ مانگا
گنہ گار ہے وہ فقط اک نگہ کا

(۲)

ٹک آنکھ ملاتے ہی کیا کام ہمارا
تس پر یہ غضب پوچھتے ہو نام ہمارا

میں نے جو کہا آئیے نہ مجھ پاس تو بولے
کیوں کس لئے کس واسطے کیا کام ہمارا

رکھتے ہیں کہیں پانؤں تو پڑتا ہی کہیں اور ساقی تو ذرا ہاتھ تو لے تھام ہمارا
اے بادِ سحر محفلِ احباب میں کہیو دیکھا ہے جو کچھ حالِ ترِ دام ہمارا

بیتابیِ دل کے سبب اُس شوخ تک انشاؔ
پہونچے ہے بلا واسطہ پیغام ہمارا

(۳)

نگہ جو پڑی تجھ سے رشکِ قمر پر گئی پھیل بس چاندنی سارے گھر پر
مجھے رونا آتا ہے شمعِ سحر پر کہ بیچاری اب مستعد ہے سفر پر
کبھی عمر بھر پھر نہ تلوے جلیں گے قدم آپ رکھیے ذی چشمِ تر پر
مِرے دودِ دل نے فقیرانہ دھونی لگائی ہی جا عرشِ اعظم کے در پر
اجی کیوں رُلاتے ہو مجھ کو تمھیں کیا نہیں رحم آتا مری چشمِ تر پر
یہی جی میں ہے اب کہیں بیٹھ رہیے بس اِک باندھ تکیہ کسی رہ گذر پر

پڑھ انشاؔ غزل اور ایک تازہ ایسی
کہ ہو آفریں جس کی ہر شعرِ تر پر

(۴)

دھوم اتنی تمے دیوانے مچا سکتے ہیں کہ ابھی عرش کو چاہیں تو ہلا سکتے ہیں
سوچئے تو سہی ہٹ دھرمی نہ کیجیے صاحب چٹکیوں بیچ مجھے کب آپ اُڑا سکتے ہیں
حضرتِ دل تو بگاڑ آئے ہیں اُس سے لیکن اب بھی ہم چاہیں تو پھر بات بنا سکتے ہیں
ہی محبت جو تری دل میں وہ ایک طور پہ ہے ہم گھٹا سکتے ہیں اسکو نہ بڑھا سکتے ہیں
ایک ڈھب کے جو قوافی ہیں ہم اُن میں انشاؔ ایک غزل اور بھی چاہیں تو سنا سکتے ہیں

(۵)

کیا ظالم کو تیری یاری میں — رہے اب تک امیدواری میں
دل جو بے خود ہوا صبا لائی — کس کی بو نکہت بہاری میں
ٹک ادھر دیکھ تو بھلا اے چشم — فائدہ ایسی اشکباری میں
چٹ لگا دیتے ہیں مرے آنسو — سلک گوہر کی آبداری میں
بندۂ بوتراب ہے انشا
شک نہیں اس کی خاکساری میں

(۶)

کمر باندھے ہوئے چلنے پہ یاں سب یار بیٹھے ہیں — بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی — تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
بسان نقش پائے رہروان کوئے تمنا میں — نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں
یہ اپنی چال ہے افتادگی سے ان دنوں پہروں — نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں
کہیں ہیں صبر کس کو آہ ننگ و نام کیا شے ہے — غرض رو پیٹ کر ان سب کو ہم یکبار بیٹھے ہیں
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

(۷)

کوئی اس دام محبت میں گرفتار نہ ہو — اے خدا یہ تو کسی بندہ کو آزار نہ ہو
سیر تو ایک طرف لاکھ غنیمت کہ یہاں — سانس لینے میں کوئی شخص گنہگار نہ ہو
جس طرح پھول کی باس ایسی ملاقات اچھی — جس سے خاطر کو کسی شخص کی کچھ بار نہ ہو

آج ہے دھوم اسیرانِ قفس میں کچھ اور — جا کے دیکھو تو کوئی تازہ گرفتار نہ ہو
بختِ بیدار اگر خواب میں تجھ کو پاوے — تو وہ پھر تا بہ قیامت کبھی بیدار نہ ہو
نہ چلے ایسی ہوا بھی جو بری تجھ کو لگے — پھول ایسا نہ کھلے جو تجھے درکار نہ ہو

نت ہنسی اور خوشی ہی رہے انشاء اللہ
میرے والی وہ کسی چیز سے لاچار نہ ہو

(۸)

فی المثل آئینہ ساں شفاف جس کا دل نہ ہو — دیکھنے والوں کو تسکیں اس سے کچھ حاصل نہ ہو
نورِ حق افرادِ انسانی میں گر شامل نہ ہو — ہستیِ موہوم کا نقشہ ہی پھر باطل نہ ہو
اک اداسی کارواں پر چھا گئی اے ساربان — ٹک خبر لیجو کہیں لیلیٰ کی یہ منزل نہ ہو
عشق کا دریا وہ دریا ہے کہ عمرِ خضر بھی — صرف گر ہو جائے تو پیدا کہیں ساحل نہ ہو
گر سبک روحی بہم پہونچی تو مانندِ نسیم — کوچۂ تنگِ رگِ گل سے گزر مشکل نہ ہو

ورد ہو مشکل کشا کے نام کا انشا جسے
کیوں بھلا دونوں جہاں کی اسکی حل مشکل نہ ہو

(۹)

ہے مجھ کو ربط بسکہ غزالانِ رم کے ساتھ — چوکوں ہوں دیکھ سایہ کو اپنے قدم کے ساتھ
کیا کام ہم کو سجدہ نہ دیر و حرم کے ساتھ — مستوں کا سر جھکے ہے صراحی کے خم کے ساتھ
کوئے بتاں سے طوفِ حرم کو چلے تو ہم — لیکن کمال حسرت و حرماں و غم کے ساتھ
او جانے والے مڑ کے ذرا دیکھیو ادھر — مانندِ سایہ ہم بھی ہیں تیرے قدم کے ساتھ
اے رہ روانِ ملکِ فنا مستعد رہو — تیار ہو رہے ہیں بہت سے عدم کے ساتھ

اب چھیڑ چھاڑ کی غزل انشاؔ اک اور لکھ
ہیں لاکھ شوخیاں ترے نوکِ قلم کے ساتھ

(۱۰)

کیا کیا آہ ناتواں تو نے | آگ سی پھونک دی یہاں تو نے
آفریں تجھ کو اے دلِ بے صبر | آ پھنسایا مجھے کہاں تو نے
ضعفِ پیری مجھے دیا کن نے | اے جواں تو نے لے جواں تو نے
مہربانی یہ کن نے فرمائی | مہرباں تو نے مہرباں تو نے
قرب کن نے دیا یہ انشاؔ کو
اے میرے یار قدرداں تو نے

(۱۱)

بندگی ہم نے تو جی سے اپنے ٹھانی آپ کی | بندہ پرور خیر آگئے قدردانی آپ کی
کیا کہوں مارے خوشی کے حال میرا کیا ہوا | آمد آمد جو ہوئی کل ناگہانی آپ کی
میرے حق میں اب جو یہ ارشاد فرمایا کہ ہے | ق | خوب یاں منقوشِ خاطر جانفشانی آپ کی
لیک میں اوڑھوں بچھاؤں یا لپیٹوں کیا کروں | روکھی پھیکی ایسی سوکھی مہربانی آپ کی
دو گلابی لا کے ساقی نے کہا انشاؔ کو رات
زعفرانی میرا حصہ ارغوانی آپ کی

(۱۲)

دو گھڑی دن سے کہا میں نے کہ کیا ارشاد ہے | سن کے بولے اب ہوا کیا بات تیری یاد ہے
خاک پر مت پھینک اے ساقی یہ دُردِ تہ نشین | چاٹ جاوینگے حریف اس کو یہ مے کی گاد ہے

سن کے یہ اشعار میرے کہتے ہیں یہ اہل تیک　　کوئی اس کو کیا کرے یہ تو خدا کی داد ہے

بس کے دیتا ہوں انشا سے ذرا بچ کھیلیو

وہ بلا ہے قہر ہے آفت ہے اک استاد ہے

(۱۳)

ہے جی میں قفل خانۂ خمار توڑیئے　　یعنی در بہشت کو یکبار توڑیئے

یہ کیا کہ ان کے دل کو نہ زنہار توڑیئے　　سو بار جا کے جوڑیئے سو بار توڑیئے

یوں چاہتے ہیں آج بھر کیف میکشاں　　یعنی کہ قفل خانۂ خمار توڑیئے

سایہ میں جس درخت کے آرام پایئے　　کیا ظلم ہے کہ اس کے ہی اثمار توڑیئے

اس تاک پر یہ اپنی اچھل پھاند ہے کہ پھر　　دروازۂ مقفل گلزار توڑیئے

شوخی تو دیکھ آج یہی قصد ہے کہ خیر　　جس ڈھب سے ہو دے خاطر دلدار توڑیئے

انشا یہ روڑھ را اٹھ ہے اک تا کو بھادکی

اس توڑ جوڑ کا نہ کبھی تار توڑیئے

شیخ غلام ہمدانی مصحفی

غزلیات

(۱)

نظارہ کروں دہر کی کیا جلوہ گری کا　　یاں عمر کو وقفہ ہے چراغ سحری کا

کیا لطف مقام ان کو جو مشتاق عدم ہیں　　دل کوچ میں رہتا ہے ہمیشہ سفری کا

کیا بھیجوں میں قاصد کو وہاں کوچے میں جس کے　　جبرئیل کو مقدور نہیں نامہ بری کا

یہ کس کی ہے رفتار کہ صفحے پہ زمیں کے — ہر نقش قدم خاکا ہے تصویر پری کا

بندہ ہے ترا مصحفیِ خستہ کو یارب
محتاج طبیبوں کی نہ کر چارہ گری کا

(۲)

ہوا ہے دشمن جاں اب تو باغباں میرا — چمن میں رہنے نہ دیگا یہ آشیاں میرا
زمیں پہ اسنے نہ دیئے مجکو عمر بھر جھپکر — کہاں کا دشمن جاں تھا یہ آسماں میرا
اُٹھا ہوں بسکہ زمانے سے حسرتیں لیکر — جنازہ دوشِ اَحبا پہ ہے گراں میرا
کل اس کی بزم میں مذکورِ شعر ہوتا تھا ق — کچھ اس میں آ جو گیا ذکر درمیاں میرا

لگا یہ کہنے کہ ہاں مصحفی کو لاؤ شتاب
کہ ایک عمر سے ہے وہ تو مدح خواں میرا

(۳)

شب کہ دل درد و الم سے سر بسر لبریز تھا — صورِ محشر کی طرح ہر نالہ شور انگیز تھا
ایک ہی تیشے میں سر فرہاد کا دو ہو گیا — کیا کرے فرہاد بیچارہ کہ تیشہ تیز تھا
فصلِ گُل میں کیوں نہ کرتے ہم بھی دعوائے جنوں — مثلِ گل چاکِ گریباں ہم کو دستاویز تھا
کی ذرا آب دمِ شمشیرِ قاتل نے کمی — ورنہ پیمانہ ہماری عمر کا لبریز تھا

کہتے ہیں اہل محلہ مصحفی کل مر گیا
کیا عجب اس کا کہ تھا بیمار و بدپرہیز تھا

(۴)

رہا ہے گُل سے افزوں بیم تاراجِ خزاں مجکو — بناتا ہی نہ تھا ایسے چمن میں آشیاں مجکو

قیامت کے تو آنے میں نہیں شک یہ تامل ہے　　لحد سے اُٹھنے دیگا کس طرح خواب گراں مجکو
میں کچھ مردہ نہیں کیوں جیتے جی یارب دکھاتے ہیں　　فشار قبر کا عالم زمین و آسماں مجکو
پڑا ہوں شاخ سے گر کر میں برگ زرد کی صورت　　خدا جانے کہاں لیجائے اب بادِ خزاں مجکو
رہا کچھ آسرا رستے میں منزل پہ پہنچنے کا　　نظر آتی رہی جب تک کہ گردِ کارواں مجکو
گلستانِ جہاں میں نغمہ پردازِ کہن ہوں میں　　نوا سنجوں میں بہتر جانتا ہے باغباں مجکو

سبک اے مصحفی یاں تک ہوا میں ضعف پیری سے
کہ آخر زیست اپنی ہو گئی بارِ گراں مجکو

(۵)

غمِ دل کا بیان چھوڑ گئے　　ہم یہ اپنا نشان چھوڑ گئے
راہ میں مجکو سب مرے ساتھی　　جان کر ناتوان چھوڑ گئے
سفر اس دل سے کر گئے غم و درد　　یار سُونا مکان چھوڑ گئے

لے گئے سب بدن زمیں میں ہم
مصحفی اک زبان چھوڑ گئے

(۶)

لوگ کہتے ہیں محبت میں اثر ہوتا ہے　　کون سے شہر میں ہوتا ہے کدھر ہوتا ہے
نہیں معلوم کہ ماتم ہے فلک پر کس کا　　روز کیوں چاک گریبانِ سحر ہوتا ہے
میں بھی یادِ دلِ گم گشتہ میں روتا ہوں بہت　　کسی رہرو کا جو دنیا سے سفر ہوتا ہے

مصحفی ہم ترے ملنے کو کئی بار آئے
یہ تو بتلا تو کسی وقت بھی گھر ہوتا ہے

(۷)

دل محزوں نہوا شاد گلستاں میں کبھی
توڑ کر پھول بھی رکھے نہ گریباں میں کبھی

کوفت یہ دل نے اٹھائی کہ نہ ٹھہرے آنسو
یاد آئی جو تری موسم باراں میں کبھی

آہ کس کو یہ کیا پہلے پہل تو نے شکار
آج تک خوں نہ لگا تھا ترے پیکاں میں کبھی

شاید آتا ہے اسیروں میں کوئی تازہ اسیر
اس قدر شور نہ تھا خانۂ زنداں میں کبھی

مصحفیؔ جب سے ہیں اس غنچہ دہن سے ہوں جدا
آشتی میں نے نہ دیکھی لب و دنداں میں کبھی

(۸)

مجھکو سحر خجل نہ کرے روئے یار سے
بس اتنی آرزو ہے شب انتظار سے

پیری میں کوئی جاتا ہے عاشق کا سوز دل
کہنہ جو ہو تو جھڑتی ہے آتش چنار سے

گویا کلید قفل طبیعت تھی شاخ گل
کیا کیا طلسم ہم پہ کھلے ہیں بہار سے

وہ ناتواں ہیں کہ تری رہگذار میں
اُٹھنے کی مانگ لیتے ہیں طاقت غبار سے

خاک اُس کی اُس کے کوچہ میں ہنے دے لے صبا
بیجا خلش ہے مصحفیؔ خاکسار سے

شیخ امام بخش ناسخ

غزلیات

(۱)

غم افلاس کہاں دل ہے تونگر اپنا
زرد چہرہ نہیں فاقوں سے یہ ہی زر اپنا

اتنی مدت سے ہوئیں وادیِ وحشت میں خراب
کہ وطن جاؤں تو پاؤں نہ کبھی گھر اپنا

اشکِ حسرت سے سوا بادۂ گلرنگ سے ہائے
مثلِ زاہد کبھی دامن نہ ہوا تر اپنا

ذکرِ پرواز تو کیا تنگ ہی ایسا یہ چمن
جھاڑ بھی سکتے نہیں ہم کبھی شہپر اپنا

دربیان اُس کوچے کا ناسخ جو ہے مانندِ حسن
گھر میں ہم رہتے ہیں اور ڈھونڈھتے ہیں گھر اپنا

(۲)

تیرے پرتو نے کیا گنگا کو دریا نور کا
جس نے دیکھا نہر کو سمجھا وہ شعلہ طور کا

ہو گئی ہے راہِ عدم کیونکر کہ مجھکو ضعف ہے
اُس کے منہ تک ہاتھ لیجانا سفر ہے دور کا

موذیوں پہ قہر یارب لطف سے خالی نہیں
کیا مزا دیتا ہے لٹنا خانۂ زنبور کا

سوزش اپنے داغ میں بھی ہے برنگِ آفتاب
چاہیے جراح مرہم صبح کے کافور کا

غیرِ حق آئی نہیں ہرگز زباں پہ کوئی بات
ہے یہی اس دارِ فانی میں نشاں منصور کا

تو نہیں ساقی تو میخانے میں اک برپا ہے حشر
مے کے شیشہ میں نظر آتا ہے نقشہ صور کا

ہجر میں کیا میکشی ناسخ کہ سودا کی طرح
زخم نے دل کی طرح دیکھا نہ منہ انگور کا

(۳)

دولتِ کونین جو چاہے کرے توقیرِ صبح
بوتۂ زر کرتی ہے خورشید کو اکسیرِ صبح

آگئی پیری مگر شاہد پرستی ہے وہی
آفتاب اپنی بغل میں بھی ہے مثلِ پیرِ صبح

چاہیے کوئی رہے غافل نہ فیضِ صبح سے
دیکھ تو مُردوں کو زندہ کرتی ہے تاثیرِ صبح

دمبدم ضعفِ بصر ایسا ہے بے دیدارِ دوست
دن چڑھے مجھ سے پڑھی جاتی نہیں تحریرِ صبح

چھا رہی ہے میرے بختوں کی سیاہی ہر طرف
کچھ شبِ فرقت میں اے ناسخ نہیں تقصیرِ صبح

(۴)

دولتِ تقدیر کو تدبیر کی حاجت نہیں،
معدنِ زر ہے جہاں اکسیر کی حاجت نہیں
راستی سے اس قدر وہ کج ادا بیگانہ ہے
اُس کے ابرو کی کماں کو تیر کی حاجت نہیں
حشر تک زیرِ زمیں دوروز بالائے زمیں
جز لحد دنیا میں کچھ تعمیر کی حاجت نہیں
زندگانی ہے علامت مرگ کی اے غافلو
اور کچھ اس خواب کو تعبیر کی حاجت نہیں
ہیں ہی اے ناسخ نہیں کچھ طالبِ دیوانِ میر
کون ہے جس کو کلامِ میر کی حاجت نہیں

(۵)

لوگ دنیا سے جو دن رات سفر کرتے ہیں
کوچ کی بے خبروں کو یہ خبر کرتے ہیں
کس کو وحشت میں ملا ہے یدِ طولا ایسا
روز ہم چاک گریباں سحر کرتے ہیں
میرے ویرانے میں رہتے ہیں مقرر جو یہاں
کشورِ ہوش سے جو لوگ سفر کرتے ہیں
کام جلوت سے نہیں رکھتے ہیں خلوت کے سوا
کس کی محفل کہ ترے دل میں گزر کرتے ہیں
قلزمِ اشک سے دھوتے ہیں سیاہی ناسخ
ہم شبِ گور کو رو رو کے سحر کرتے ہیں

(۶)

تاب کیا دیکھوں جو اُس کے روئے تابناک کو
کاہ کا رتبہ وہاں ہے شعلۂ ادراک کو
خاک میں پوشیدہ ہو جائیں گے سب عالی دماغ
کرتی ہے گردِ زمیں دیکھو سنانِ افلاک کو

تا دمِ مردن نہ نکلی اوج کی حسرت تو کیا　　لیگئی صرصر فلک تک میرے مشتِ خاک کو

باغ سے دریا سے صحرا سے فراقِ یار سے
خوش کروں لے جاکے ناسخ کیا دلِ غمناک کو

(۷)

گر مرا تابوت یاروں کا وبالِ دوش ہے　　گور تو میرے لئے کھولے ہوئے آغوش ہے
خوب بزمِ دہر میں آتش زبانی کر چکے　　آجکل اپنا چراغِ زندگی خاموش ہے
میں وہ بیکس ہوں ہوا مجھ پر نہ کوئی نوحہ گر　　آدمی تو کیا چراغِ گور تک خاموش ہے
مرگ کے ساماں مہیا ہیں قضا کی دیر ہے　　باڑہ واں تلوار پر ہے یاں لہو کا جوش ہے

مثلِ ناسخ چاہیئے بیہوش ہو پیکر شراب
اس خراباتِ کہن میں جو کوئی ذی ہوش ہے

(۸)

جبتک فلک گردش ہی اسکی اک جہاں گردش میں ہے　　مثلِ فانوسِ خیالی آسماں گردش میں ہے
کیوں نہ ظالم کی مدد کرتا رہے دورِ فلک　　تیزیِ شمشیر کی خاطر فساں گردش میں ہے
ہوں وہ سرگشتہ کہ میری عکس کی تاثیر سے　　آئینہ آٹھوں پہر گرداب ساں گردش میں ہے
ہے طلب میں دشت دشت آوارہ مثلِ گردباد　　بعدِ مردن بھی غبارِ عاشقاں گردش میں ہے
سعی سے فارغ نہیں ہر چند ہوں سیر اہلِ حرص　　ہے دہن لبریزِ نعمت سے زباں گردش میں ہے

یہ نشاں ہے ناسخِ سرگشتہ کے ویرانے کا
آسیاں کی طرح سنگِ آستاں گردش میں ہے

(۹)

کچھ عدم کا بھی خیال اے دل تجھے یاں چاہیے
گو عزیزِ مصر ہے پر یادِ کنعاں چاہیے

دمبدم کہتی ہے میری کشتیِ عمرِ رواں
مجھ کو آبِ خنجرِ قاتل کا طوفاں چاہیے

عمر گزری روتے روتے ہنس بھی لوں اب جی میں ہے
میرے منہ پر کوئی قاتل زخمِ خنداں چاہیے

وردِ مژگاں کی زباں سے ہیں لبِ جاناں کے وصف
اشکِ خوں کی چشم کو تسبیحِ مرجاں چاہیے

طالبِ دنیا مؤنث ہیں بھلا کیا اُن سے کام
مرد ہے ناسخ تو عشقِ شاہِ مرداں چاہیے

خاقانیٔ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق

قصیدہ

حبذا ساقیِ فرخ رخ و خورشید جمال
مرحبا مطربِ ہاروت فن و زہرہ خصال

بارک اللہ کہ درافشاں ہے تو اے ابرِ بہار
خیر مقدم کہ خراماں ہے تو اے بادِ شمال

للہ الحمد لبالب ہے مے عیش سے جام
شکر اللہ ہے زرِ گل سے چمن مالا مال

جوشِ روئیدگیِ سبزہ سے ہو جائیگا سبز
گل زمینِ چمنِ حسن میں تا دانۂ خال

شررِ تیشۂ فرہاد سے پیدا ہوئے گل
بل بے جوشِ گلِ خود رو سرِ دامانِ جبال

جوشِ فوارہ ہے واں کثرتِ تارِ بارش
سرِ مجنوں کے جھٹے آلودہ جہاں گرد سے بال

کیا عجب رحمتِ باری سے کہ وقتِ باراں
ابرِ مردہ سے بھی ہو قطرہ فشاں آبِ زلال

معجزِ باد سے مانندِ عصائے موسےٰ
شجرِ خشک بھی ہو جائے تر و تازہ نہال

شورِ بلبل بھی یہ رکھتا ہے نمک آج کہ گل
بن گیا کثرتِ شبنم سے نمکداں کی مثال

دیتی ہے طاقتِ پروانہ یہ کیفیت سے
اس ہوا میں ہے بطِ مے کہ اڑے وہ لیکے پر و بال

ہے یہ وہ دور کہ ہر صوفیٔ صافی مشرب — رقصِ مستاں میں ہے وجد کناں شاملِ حال
بے دموں کو کہو جو بے چارہ گر عیسیٰ دم — شمعِ مُردہ کے رگِ تار سے کھولیں قیفال
پتلیاں ناچتی ہیں چشم کے گھر میں بے ساز — جنبشِ دستِ مژہ پہ ہے اس انداز سے تال
اللہ اللہ رے سرسبزیٔ گلزارِ جہاں — آج یک رنگ ہے رنگِ روشِ خضرؑ و بلالؓ
ہوں قلم ہاتھ اگر کوئی لکھے خطِ غبار — صفحۂ دہر پہ کیا دخل کہ ہو گردِ ملال
روزِ جشن آج ہے اس کا کہ جسے کہتی ہے خلق — نائبِ ختمِ رسل ظلِ خدائے متعال
وہ بہادر شہِ غازی کہ اگر تیغ اس کی — اپنی دکھلائے چمک چرخ پہ کٹ جائے ہلال
وہ نکو خوئے نکو رائے خجستہ منظر — وہ بلند اختر و فرخ روش و فرخ فال
وہ مسیحا دم و یوسفؑ رخ و داؤدؑ الحاں — وہ سلیماںؑ حشم و موسیٰؑ کف و صالحؑ اعمال
چمنِ خلق و نسیمِ کرم و ابرِ سخا — چشمۂ فیض و ہنر کانِ عطا بحرِ نوال
آسماں جاہ و عطارد رقم و مہرِ علم — مشتری دانش و مہ بینش و مریخ جلال
خسروِ جم حشم و داورِ کسریٰ انصاف — شاہِ دارا دل و سلطانِ سکندر اقبال

مدحِ حاضر میں پڑھوں اس کی وہ مطلع جس سے
ہمسری کی نہ رکھے مطلعِ خورشید مجال

مطلعِ ثانی

ہو تری اک نظرِ فیض سے ناقص کو کمال — مہر سے گر مہ کامل ہو دو ہفتہ میں ہلال
نیرِ جاہ ترا وہ جسے تا دورِ فلک — نہ کسوف و نہ غروب و نہ ہبوط و نہ وبال
آگے بخشش کے تری خرمنِ دُر یکدانہ — آگے ہمت کے تری کوہِ طلا اک مثقال
ہو شبے جوں چادرِ مہتاب گلیمِ شبِ تار — رخِ پُر نور جو تو پونچھ کے جھاڑے رومال

جام سے قطرہ جو ٹپکا تو معلق ہی رہا — دستگیری نے لیا تیری جو گردوں کو سنبھال
گر تیرے قہر کی گرمی تپ محرق بن جائے — لب دریا پہ حبابوں کی جگہ ہوں تبخال
قوتِ ماسکہ ممسک کے قوا سے گم ہو — فیض جاری سے تری بخل کو یاں تک ہو زوال
حکمت آموز ترا علم جہاں ہو تو وہاں — نہ ارسطو کو ہو طاقت نہ فلاطوں کو مجال
ہو تری عقل سے عاجز دم بحثِ معقول — اک معقولے میں فقط فعل کے عقل فعال

قطعہ

دم ہی کیا باد صبا میں کہ دم سیر جہاں — تیرے گلگونِ سبک سیر کی جائے دنبال
یوں ہی دو چار قدم خاک اڑا کر رہ جائے — اور پہونچ جائے کہیں سہی وہ کہیں مثل خیال
ہے وہ ہیکل میں اگر دیو تو صورت میں پری — ہے اڑان اسمیں ملک کی تو بشر کی سی خصال
جلد اتنا کہ جہاں عرصہ جولاں اس کا — عہد مستقبل و ماضی کا وہاں ہے اک حال
زیب تن اس کی جو مہندی کا ہے ہر گل تصویر — پھرتا کا دے میں ہے صورتِ فانوس خیال
اس فلک سیر کو جولاں کرے تو ہے یہ ڈر — مزرع سبز فلک ہو نہ مبادا پامال

قطعہ

تیرے ہاتھی کی بلندی کی طرف کی جو نگاہ — سر پہ اندیشے نے لی ہاتھ سے دستار سنبھال
کہکشاں کو وہ فلک پر سے زمیں پہ پھینکے — نیشکر راہ میں مانگیں اگر اس سے اطفال
جیسے ماتھے پہ بزرگوں کے ہو سجدہ کا نشاں — اس مستک پہ شہا جلوہ نمایوں ہے ڈھال
ہو جو اس فیل کا خرطوم سرافیل کا صور — آئے اعدا پہ قیامت سر میدانِ قتال
اس کے دانت اسکے لئے ہیں روشن تیر شہاب — ہے جن اعدا کو سر اوج شیاطیں کے مثال
آبداری میں تری تیغ کی ہے برق کی موج — قطعہ کیا تماشہ ہے کہ ہے آب سے آتش سیال

تیری شمشیر کو ہی خونِ عدو روز مباح — یہ غلط تیسرے دن ہوتا ہی مردار حلال

طائرِ روحِ عدو کے لئے صیادِ اجل — سبزۂ تیغ میں جوہر سی لگا رکھتا ہی جال

طاقتِ دم زدن اس دور میں ہی کس کو ہی — دیکھ کر تیرا نسق اے شہِ فرخندہ خصال

یہ ترا ذکر جو آتا ہے زباں پر تو نفس — لب پہ آ جائے سب سینے سے پے استقبال

ہو قوی دست اگر زورِ حمایت سے تری — شیر سے پنجہ کرے پنجۂ مژگانِ غزال

تقویت دیوے اگر پاس حفاظت تیرا — شعلۂ شمع کو صرصر سے نہ ہو اضمحلال

ہے ترے عہد میں فتنے سے زمانہ خالی — فیلسوفی ہی حکیموں کی خلا کہنا محال

قطعہ

آتش و آب میں یہ ربط ترے عدل سے ہے — دیوے ہیزم کو جلا کر کوئی پانی میں جو ڈال

کاکلِ موجِ دُخاں کے لئے اُس کی دریا — لے تہ آب سے شانہ پرِ ماہی کا نکال

خبرِ جملۂ عشرت ہے ترا جشنِ سعید — مُبتدا جس کا شہا غرّۂ ماہِ شوال

ہوتی ہے حیرتِ توصیف سے تیری شاہا — روشِ غنچۂ تصویر زباں منہ میں لال

بس دعا ہی پہ فقط ختمِ سخن کرتا ہے — یہ جو ہی ذوقِ ثنا خواں ترا اور بیچ سگال

جشن ہر سال ترا تجھکو مبارک ہووے
ہی یہ جب تک کہ زمانے میں حساب و سال

غزلیات

(۱)

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا — جو آپ ہی مر رہا ہو اُس کو گر مارا تو کیا مارا

نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکسیر بن جاتا — اگر پارے کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا

بڑے موذی کو مارا نفسِ امارہ کو گر مارا   نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا
ہنسی کے ساتھ یاں روتا ہے مثلِ قلقل مینا   کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا
گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے میں   اگر لاکھوں برس سجدہ میں سر مارا تو کیا مارا

دلِ بدخواہ میں تھا مارنا یا چشمِ بدبیں میں
فلک پر ذوقؔ تیرِ آہ گر مارا تو کیا مارا

(۲)

ستم کو ہم کرم سمجھے جفا کو ہم وفا سمجھے   اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اس بت کو خدا سمجھے
وہ ہم سے خاکساروں کو جب اپنا خاکِ پا سمجھے   ہم اپنی خاکساری اپنے حق میں کیمیا سمجھے
رواں ہوتا ہے اس بستاں سرا سے کاروانِ گل   چٹکنے کو صبا غنچے کی آوازِ درا سمجھے
حسابِ ملانہ پوچھے مجھ سے میرے دل کے زخموں کا   حسابِ دوستاں دردل اگر وہ دلربا سمجھے
کرے آہِ رسا میری جو سیرِ عالمِ بالا   فلک کو بھی یونہی اک آبلہ سا زیرِ پا سمجھے
مجھے آتا ہے رشک اس رندِ مے آشام پر ساقی   نہ جو دع ما کدر جانے نہ جو خذ ما صفا سمجھے
نہ آیا خاک بھی رستہ میں نقشِ عمرِ رفتہ کا   مگر سمجھے تو داغِ معصیت کو نقشِ پا سمجھے
کشادِ کارِ ہم نے پنجۂ تقدیر کو سونپا   خرد کے تیز ناخن ناخنِ انگشتِ پا سمجھے

سمجھ ہی میں نہیں آتی ہے کوئی بات ذوقؔ اسکی
کوئی جانے تو کیا جانے کوئی سمجھے تو کیا سمجھے

(۳)

اس سنگِ آستاں پہ جبینِ نیاز ہے   وہ اپنی جا نماز ہے اور یہ نماز ہے
دروازہ میکدے کا نہ کر بند محتسب   ظالم خدا سے ڈر کہ درِ توبہ باز ہے

خانہ خرابیاں دلِ ہمسایۂ غم کی دیکھ ۔۔۔ وہ ہی دوا خراب ہے جو خانہ ساز ہے
مدحِ خالِ روئے بتاں ہوں مجھے خدا ۔۔۔ بخشے تو کیا عجب کہ وہ نکتہ نواز ہے

اے ذوقؔ اپنا سب پہ کھلے کیونکر رازِ عشق
ہر نالہ اک کلیدِ درِ گنجِ راز ہے

(۴)

نہیں ثبات بلندیٔ عزّ و شاں کے لئے ۔۔۔ کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کے لئے
نہ چھوڑ تو کسی عالم میں راستی کہ یہ شے ۔۔۔ عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کے لئے
تپش سے عشق کے یہ حال ہے مرا گویا ۔۔۔ بجائے مغز ہے سیماب استخواں کے لئے
الٰہی کان میں کیا اُس صنم نے پھونک دیا ۔۔۔ کہ ہاتھ رکھتے ہیں کانوں پہ سب اذاں کے لئے
نہیں ہے خانہ بدوشوں کو حاجتِ ساماں ۔۔۔ اثاثہ چاہیئے کیا خانۂ کماں کے لئے
اگر امید نہ ہمسایہ ہو تو خانۂ یاس ۔۔۔ بہشت ہے ہمیں آرامِ جاوداں کے لئے
مثال نے ہے مرا جب تلک کہ دم میں دم ۔۔۔ فغاں ہے میرے لئے اور میں فغاں کے لئے
بلند ہووے اگر میرا کوئی شعلۂ آہ ۔۔۔ تو ایک اور ہو خورشید آسماں کے لئے
چلے ہیں دیر کو مدت میں خانقاہ سے ہم ۔۔۔ شکستِ توبہ لئے ارمغاں مغاں کے لئے
بیانِ دردِ محبت جو ہو تو کیونکر ہو ۔۔۔ زبان دل کے لئے ہے نہ دل زباں کے لئے

بنایا آدمی کو ذوقؔ ایک جزوِ ضعیف
اور اُس ضعیف سے کل کام دو جہاں کیلئے

---※---

نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب

تشبیب قصیدہ ۲

صبحدم دروازۂ خاور کھلا — مہرِ عالمتاب کا منظر کھلا

خسروِ انجم کے آیا صرف میں — شب جو تھا گنجینۂ گوہر کھلا

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ — دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا

سطحِ گردوں پہ پڑا تھا رات کو — موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا

صبح آیا جانبِ مشرق نظر — اک نگارِ آتشیں رخ سر کھلا

تھی نظر بندی کیا جب ردِ سحر — بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا

لا کے ساقی نے صبوحی کے لئے — رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا

بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ — کعبۂ امن و اماں کا در کھلا

تاجِ زریں مہرِ تاباں سے سوا — خسروِ آفاق کے منہ پر کھلا

شاہِ روشن دل بہادر شہ کہ ہے — رازِ ہستی اس پہ سرتاسر کھلا

وہ کہ جس کے صورتِ تکوین سے — مقصدِ نہ چرخ و ہفت اختر کھلا

روشناسوں کی جہاں فہرست ہے — واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھلا

لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک — میری حدِ وسع سے باہر کھلا

تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید — کس نے کھولا کب کھلا کیونکر کھلا

بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب — اب علوِ پایۂ منبر کھلا

شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ
اب مآلِ سعیِ اسکندر کھلا

تم کرو صاحبقرانی جب تلک
ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا

معذرت

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

اُستادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون اور ریختہ، ہاں اس سے مدعا
جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا زرہِ امتثالِ امر
دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالبؔ خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

تعلّی

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر | کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے
پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار | رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے
نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا | کیونکر کہوں لو نام نہ ان کا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا
غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

غزلیات

(۱)

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا | ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں | وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی | گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا
کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجے | ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

(۲)

درد منت کشِ دوا نہ ہوا | میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں | تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
ہے خبر گرم ان کے آنے کی | آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
جان بھی دی ہوئی اسی کی تھی | حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

(۳)

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا
روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالبؔ
چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

(۴)

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

اتنا ہی مجکو اپنی حقیقت سے بعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

آرایشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

غالبؔ ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتراب میں

(۵)

منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ کے ظہور کی

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا
گویا ابھی سنی نہیں آواز صور کی

آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج
اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

کیا فرض ہی کہ سب کو ملے ایک سا جواب   آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی
گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر   کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

(۶)

حُسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے   اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا   ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے
بے طلب دیں تو مزا اُس سے سوا ملتا ہی   وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے
اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہی منہ پر رونق   وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے   کام اچھا ہی وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے
ہم سخن تیشہ نے فرہاد کو شیریں سے کیا   جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہی

(۷)

نکتہ چیں ہی غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے   کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے
میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل   اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بنائے نہ بنے
غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر   کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے
کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے   پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے
عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب   کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

(۸)

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دل کی دوا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی

کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

(۹)

کبھی نیکی بھی اسکے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

ادھر وہ بدگمانی ہے ادھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالبؔ
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

مرزا سلامت علی دبیر

رباعیات

(۱) قطرہ دریائے آبرو ہوتا ہے
حاصل یہیں تقدیر آرزو ہوتا ہے

جھلکتا ہی جو روسیہ بھی تو مثل نگیں
اُٹھتے اُٹھتے سفید رو ہوتا ہے

(۲)

کم مایۂ سُبک پیش جہاں ہوتا ہے
میزان سے بدیہی یہ عیاں ہوتا ہے
خوردوں سے تواضع ہی بزرگی کی دلیل
جھکتا ہی وہ پلّہ جو گراں ہوتا ہے

(۳)

جو قصر کرے حرص کو قیصر وہ ہے
تکیہ ہی جسے حق پہ تونگر وہ ہے
آئینہ سکندر نے بنایا تو کیا
دل جس کا ہی آئینہ سکندر وہ ہے

(۴)

رحمت کا تری اُمیدوار آیا ہوں
مُنہ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہوں
چلنے نہ دیا بارگنہ نے پیدل
اِس واسطے کاندھوں پہ سوار آیا ہوں

(۵)

گھر اپنا اُجاڑ کر بسایا تجھ کو
ڈھانپا جو کفن سے مُنہ دکھایا تجھ کو
اے قبر کہاں کہاں نہ کی تیری تلاش
جب خاک میں مل گئے تو پایا تجھ کو

(۶)

جو روضہ میں باریاب ہو جاتا ہے
وہ اوج میں لاجواب ہو جاتا ہے
جلتا ہی جو شب کو قبر حیدر پہ چراغ
وہ صبح کو آفتاب ہو جاتا ہے

(۷)

خورشید سر شام کہاں جاتا ہے
روشن ہی دبیر یہ جہاں جاتا ہے
مغرب ہی کی جانب ہی مزار حیدر
یہ شمع جلانے کو وہاں جاتا ہے

(۸)

ادنیٰ سے جو سر جھکائے اعلیٰ وہ ہے
جو خلق سے بہرہ ور ہی در یادہ ہے
کیا خوب دلیل ہے یہ خوبی کی دبیر
سمجھے جو بُرا آپ کو اچھا وہ ہے

(۹)

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے
بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا
جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

(۱۰)

بندوں پہ کرم حضرتِ باری کا ہے
مقدور کسے شکر گزاری کا ہے
دی ہے جو خدا نے سرفرازی مجکو
ثمرہ یہ نہال خاکساری کا ہے

مناظرہ قدرت

صبح کا سماں

(۱)

جب سرنگوں ہوا علم کہکشانِ شب
خورشید کے نشاں نے مٹایا نشانِ شب
تیر شہاب سے ہوئی خالی کمانِ شب
تانی نہ پھر شعاعِ قمر نے سنانِ شب
آئی جو صبح زیورِ جنگی سنوار کے
شب نے زرہ ستاروں کی رکھدی اُتار کے

(۲)

شمشیرِ مشرقی جو چڑھی چرخ پر شتاب
پھر تیغ مغربی نے دکھائی نہ آب و تاب
تھا بسکہ گرم خنجرِ بیضائے آفتاب
باقی رہا نہ چشمۂ نیلوفری میں آب

محتاج ماہتاب ہوا آب و تاب کا
باغِ جہاں میں پھول کھلا آفتاب کا

(۳)

نکلا جو صید شب کو خدیو جہانِ صبح ناوک شعاع مہر تھی گر دوں کمانِ صبح
سلطان شرق دوش پہ رکھے نشانِ صبح سبد نیر ابلق فلکی زیر رانِ صبح
عالم تھا محو، عالم نیّر فروز کا
تارِ شعاع دام تھا عنقائے روز کا

رات کا سماں

(۱)

جس وقت پڑا اسکہ زر شب سیم قمر پر پھر کوئی نہ راغب ہوا خورشید کے زر پر
مریخ کا خنجر جو چلا ترک سحر پر بن بن کے شفق خون چڑھا چرخ کے سر پر
کیوان علم - ایوان فلک اور چاند نگیں تھا
آفاق سلیماں کی طرح زیر نگیں تھا

(۲)

شب تھی کہ سیہ بختی کفار ہر اک سو چشم سیہ قہر تھی، یا ظلم کا گیسو
کجر و صفتِ نقش نگیں تھے جو وہ بدخو آخر کو ہوئے شب کی سیاہی سے سیہ رو
روشن ہی سیہ کار وہ سب فوج جفا تھی
معدوم ہوئے نام سیاہی جو سوا تھی

(۳)

وہ شب کا اندھیرا وہ بیاباں کی سیاہی — گرمی کی وہ پیاس اور وہ پانی کی مناہی
آباد وہ گھر اور وہ اک بار تباہی — یہ حادثہ اور آلِ نبیؐ، شانِ الٰہی!
گر فرش پہ سو جاتے تھے روتے ہوئے بچے
پھر پیاس سے چونک اُٹھتے تھے سوتے ہوئے بچے

گرمی کا سماں

(۱)

تنہا کھڑے ہیں رن میں امامِ فلک جناب — گرمی دکھا رہا ہے قیامت کی آفتاب
بے آگ مُرغِ قبلہ نما ہوتے ہیں کباب — خطِ غبار سے ہے لپی ابر کی سحاب
چھالا ہے آفتاب کا گردوں کے پاؤں میں
خود چھپ رہی ہے دھوپ درختوں کی چھاؤں میں

(۲)

مٹی خراب چرخ پہ ہے برجِ آب کی — رنگت ہے برجِ موت میں ماہی کباب کی
دریا میں آنکھ بیٹھ گئی ہے حباب کی — حدّت ہے موج موج میں تیرِ شہاب کی
فوّارے کو نہ حوض میں گرمی سے کل پڑی
پانی کی بھی زبان دہن سے نکل پڑی

(۳)

مثلِ تنور گرم تھا پانی میں ہر حباب — ہوتی تھیں سیخ موج پہ مرغابیاں کباب
گلخن صدف تھے۔ دانہ بریاں دُرِ خوش آب — آتش سے اپنی لعلِ بدخشاں تھا آب آب

یہ دھوپ تھی کہ دانے کا بچنا محال تھا
دانہ بچا بھی جلنے سے تو خال خال تھا

گرمی کی شدّت میں لوگوں کی حالت

(۱)

دو دو قدم پہ ہوتے ہیں اطفال بےحواس
اِک پانی پانی کہتا ہے اور ایک پیاس پیاس
یوں قافلہ ہے گردِ علمدارِ حق شناس
جس طرح پیاسے حشر میں کوثر کے آس پاس
عباسؑ شانِ ساقیِ کوثر دکھاتے ہیں
اک دم میں ساری فوج کو پانی پلاتے ہیں

فوجوں کی ابتری اور رَل چل

(۱)

یکسر صفتِ بختِ سیہ ڈھالیں تھیں بیکار
تھی تن میں زرہ نامۂ عصیاں سے گراں بار
تیزش نہ رہی تیغوں میں عاری ہوئے کفار
اور خوف سے خاموش تھے گویا لبِ سوفار
دہشت سے جوان بھاگتے تھے تیر کی مانند
تھا نیزوں کو رعشہ قدمِ پیر کی مانند

(۲)

بیکار ہر اِک دستِ ہنر تھا دمِ پیکار
شانوں کی طرح خشک ہوئے پنجۂ کفار
تھا شل رکابوں کے تھی قالبِ اسوار
اور سہم سے تھے ناوکِ خود رفتہ کماندار

دہشت سے سپر کرتے تھے شمشیر سے پہلے
ہاتھوں سے کماں چھوٹتی تھی تیر سے پہلے

(۳)

ترکش میں عدو ڈھونڈھتے تھے نیزوں کو ہر بار
زہ کرتے تھے نیزوں کو کمانوں میں ستمگار
مانند سپر روکتے تھے چہرے پہ تلوار
تیغوں کی جگہ میانوں کا اپنے تھے لیے وار
اک نہر زرہ پوشوں کے خوں کی جو بہی تھی
موجوں کی طرح آپ زرہ کانپ رہی تھی

تلوار کی تعریف

(۱)

جس مورچے میں لیلیٰ تیغ دو سر گئی
چنگے بھلوں کو سایے سے دیوانہ کر گئی
ہر صف میں خاک اڑا کے ادھر سے ادھر گئی
پر یہ نہا نہا کے لہو میں نکھر گئی
عالم نہ پوچھو قطرہ فشانی کے حسن کا
جوبن ٹپک رہا تھا جوانی کے حسن کا

(۲)

آگے کبھی بڑھی۔ کبھی پیچھے کو پھر پڑی
سر پر جو لڑکھڑائی تو شانوں پہ گر پڑی
تجویز جو لعینوں نے کی وہ مفر پڑی
افتاد ان سے پوچھئے یہ جن کے سر پڑی
اٹھی۔ گری۔ بلند ہوئی۔ پست ہو گئی
پی پی کے میکشوں کا لہو مست ہو گئی

تلوار کی کاٹ

(۱)

جس صف پہ گری صاف صفائی نظر آئی   جس غول پہ چمکی تو ہوا غل کدھر آئی
جھپٹی جو پرے پر تو ہوئیں یہ بھر آئی   اِک اِک کو خبر بھی نہ رہی اپنی پرائی
لہرا کے جو بیٹھی۔ تو جگر کاٹ کے اُٹھی
ناگن کی طرح شبنم خوں چاٹ کے اُٹھی

ایضاً

(۱)

چھل بل تھی چھلاوہ تھی طلسمات تھی اسرار   چالاک سبکسار۔ طرحدار۔ نمودار
نیزہ کہیں خنجر تھا کہیں اور کہیں تلوار   بجلی تھی کسی جا تو کہیں نور کہیں نار
سیماب تھی سیلاب تھی۔ طوفاں تھی ہوا تھی
شعلہ تھی۔ شرارہ تھی۔ قیامت تھی بلا تھی

رزمیہ

(۱)

یہ جان لو جس وقت کھچے گی مری تلوار   تیغوں میں نہ دم ہونگے نہ سر ہونگے نہ سردار

اک حملے میں کروں گا پرے فوج کے بیکار — جز گرد نہ پیدل نظر آئیں گے نہ اسوار
سر کوبیٔ افواجِ بداعمال کروں گا
چیونٹی کی طرح مورچے پامال کروں گا

(۲)

انسان تو کیا جن بھی نہیں ہم سے کڑے ہیں — سر کے نہیں جن جا پہ قدم رن میں گڑے ہیں
نام اپنی دلیری کے دلیروں میں بڑے ہیں — اس ضرب کے سکے عرب تاں میں پڑے ہیں
کس کس پہ چلی تیغ ظفرناک ہماری
ہر شہر میں ہر ملک میں ہے دھاک ہماری

(۳)

کمزور ہیں رستم سے پہلوان مرے آگے — مجبور ہیں سہراب و نریمان مرے آگے
نابود ہے فرعون کا سامان مرے آگے — رکھتے نہیں کچھ جان نبی جان مرے آگے
بیہوش ہو جس صاحبِ شمشیر کو ٹوکوں
روباہ بنے ڈر کے اگر شیر کو ٹوکوں

گھوڑے کی تعریف

(۱)

اللہ رے نزاکت فرسِ غنچہ دہن کی — آتی ہیں نظر صاف رگیں گل سے بدن کی
سیرت ہے اگر شیر کی صورت ہے ہرن کی — رانوں میں ٹھہرتا نہیں بو نوگھ کے رن کی

دھن ہے کہ گزر جائیے حدِ چرخِ بریں سے
ہر جست میں یہ قصد کہ اُڑ جاؤں زمیں سے

(۲)

چلنے میں یہ شمشیر ہے پلّہ میں یہ ہے تیر
لڑنے میں یہ تقدیر بگڑنے میں یہ تدبیر
جانے میں رسولوں کی دُعا آنے میں تاثیر
چھپنے میں یہ ہی خواب عیاں ہونے میں تعبیر
مضمون ہیں بہت پر کوئی دلچسپ نہیں ہے
اسرار ہے اعجاز ہے یہ اسپ نہیں ہے

میر ببر علی انیس

رُباعیات

(۱)

فرصت کوئی ساعت نہ زمانے سے ملی
بیگانے سے راحت نہ یگانے سے ملی
حقا کہ پلک نواز ہے ذات تیری
جنت اُنھیں اشکوں کے بہانے سے ملی

(۲)

پتلی کی طرح نظر سے مستور ہے تو
آنکھیں جسے ڈھونڈھتی ہیں وہ نور ہے تو
ہے قرب رگِ جاں سے اور اس پر یہ بعد
اللہ اللہ کس قدر دور ہے تو

(۳)

گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں
یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں

ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے　　حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

(۴)

آغوشِ لحد میں جبکہ سونا ہوگا　　جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا
تنہائی میں آہ کون ہوگا انیس　　ہم ہوویںگے اور قبر کا کونا ہوگا

(۵)

جو شے ہے فنا اُسے بقا سمجھا ہے　　جو چیز ہے کم اُسے سوا سمجھا ہے
ہے بحرِ جہاں میں عمر مانند حباب　　غافل اس زندگی کو کیا سمجھا ہے

(۶)

ہاں جوشِ غمِ سیدِ عالی ہو جائے　　چہروں پہ ان اشکوں سے بحالی ہو جائے
یوں لختِ جگر چشم سے ٹپکیں باہم　　ہر شاخِ مژہ پھولوں کی ڈالی ہو جائے

(۷)

مر مر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے　　رخ سب سے پھیر کے منہ دکھایا ہے تجھے
کیونکر نہ لپٹ کے تجھ سے سوؤں اے قبر　　میں نے بھی تو جان دیکے پایا ہے تجھے

(۸)

پرساں کوئی کب جوہرِ ذاتی کا ہے　　ہر گل کو گلہ کم التفاتی کا ہے
شبنم سے جو وجہ گریہ پوچھی تو کہا　　رونا فقط اپنی بے ثباتی کا ہے

(۹)

ماں باپ سے بھی سوا ہے شفقت تیری　　افزوں ہے تیرے غضب سے رحمت تیری
جنت انعام کر نہ دوزخ میں جلا　　وہ رحم ترا ہے یہ عدالت تیری

(۱۰)

ادبار کا کھٹکا ہے چشمِ جاہ میں ہے جاگو جاگو کہ خوف اس راہ میں ہے
اُٹھو اُٹھو یہ خوابِ غفلت کب تک دیکھو دیکھو اجل کمینگاہ میں ہے

سراپا

(۱)

کہتا ہے کوئی چشم کو نرگس کوئی آہو اُس کے تو بصارت نہیں اُسکے نہیں بو
چہرے کو کہا کرگلِ مہتاب ہے یہ رو اس میں نہ یہ سبزہ نہ یہ سُرخی نہ یہ خوشبو
بے بو ہے وہ اک پھول یہاں باغ لگا ہے
ہر چیز میں بس ایک نہ اک داغ لگا ہے

(۲)

مضمونِ دہن کے شعراء رہتے ہیں جویا پوچھے کوئی کہ تم سے زبانوں کو بھی دھویا
غنچہ جو کہا لطفِ سخن اور بھی کھویا اسرارِ الہٰی سے بھی واقف ہوئے گویا
ہیں عقدہ کشا منہ سے جو بولیں تو کھلے گا
اس عقدے کو یہ آپ ہی کھولیں تو کھلے گا

(۳)

دانتوں کو گہر مرثیہ گو کہتے ہیں سارے بتلاؤ گہر خوب ہیں یا عرش کے تارے
یہ درِ نجف وہ ہیں علی رض کو جو ہیں پیارے تاروں کو بھی صدقے فلک ان پہ سے اتارے
کیا وصف کریں اُن کا سوا اصل علی کے
گوہر نہیں قطرے ہیں یہ سب نورِ خدا کے

لب کو جو کہا لعل یہ مضمون ہے بے رنگ (۴) اِس مدح کے قابل نہیں ہے یہ دہن تنگ
بولو لب جان بخش کا ہوتا ہے یہی ڈھنگ اعجاز مسیحا کا دکھائے تو کوئی سنگ
قدرت نہیں اُن ہونٹوں کے اوصاف کی ہم میں
یہ وہ ہیں کہ مُردہ کو جِلا دیتے ہیں دم میں

تلوار کی تعریف

(۱)

وہ غیظ وہ نعرہ وہ چمکتی ہوئی تلوار گویا تھا مجسم غضبِ حضرتِ قہار
اتنا تو پکارے کہ خبردار خبردار ڈھالیں نہ اُٹھی تھیں کہ گری برقِ شرربار
گرمی سے ہوا میں شرر اُڑتے نظر آئے
جھونکا تھا غضب کا کہ سر اُڑتے نظر آئے

(۲)

اُٹھ کر کبھی ٹھہری کبھی لچکی کبھی چمکی سر گر گئے گردن جدھر اُس تیغ نے خم کی
سیدھی صفِ دشمن کو ملی راہ عدم کی سیفی تھی کہ گویا دمِ شمشیر پہ دم کی
دم بھر میں صفیں صاف تھیں بیدادگروں کی
تھی مینہ کی طرح خاک پہ بوچھار سروں کی

(۳)

پیری کبھی گہ خون میں نہا کر نکل آئی ٹھہری کبھی غوطہ کبھی کھا کر نکل آئی
کاٹی جو زرہ موج میں جا کر نکل آئی منجدھار سے دو ہاتھ لگا کر نکل آئی
کیا ڈر اُسے طوفان کا جو چالاک ہو ایسا جب باڑھ پہ دریا ہو تو پیراک ہو ایسا

(۴)

غصہ میں گئی اور غضبناک پھر آئی   افلاک پہ چمکی تو سوئے خاک پھر آئی
بیخوف سروں سے گئی بیباک پھر آئی   غل ہوتا تھا بھاگو وہ سفاک پھر آئی
خالق کا غضب خلق میں کہتے ہیں اسی کو
یہ مرگ مفاجات نہ چھوڑے گی کسی کو

(۵)

سرکش تھے جو اس فوج ستمگر میں ستمگار   اک وار میں کرتی تھی دو لخت ان کو وہ تلوار
جل جل کے وہ اخگر کی طرح ہوتے تھے فی النار   ترکیب عناصر میں خلل پڑتا تھا ہر بار
دو چار ہوا سامنے جو خیرہ سر آیا
ہر مصرع قد اس کا رباعی نظر آیا

ایضاً

(۱)

کیں صفیں صاف مگر منہ کی صفائی نہ گئی   کج ادائی کو نہ چھوڑا وہ لڑائی نہ گئی
کاٹ چھانٹ اور وہ لگاوٹ وہ رکھائی نہ گئی   سیکڑوں خون کیے اور کہیں آئی نہ گئی
شور تھا برق پئے جلوہ گری نکلی ہے
جان لینے کو اجل بن کے پری نکلی ہے

(۲)

جنگ میں تیغ کو دعوی تھا کہ یکتا ہوں میں   سر اٹھایا تھا یہ گھوڑے نے کہ عنقا ہوں میں
چرخ کہتا تھا کہ یارب تہ و بالا ہوں میں   برق کہتی تھی کہ تلوار ہی یا ہوں میں

کس میں ہے یہ جو تڑپ زیر فلک میری ہے
تیغ کرتی تھی اشارہ یہ چمک میری ہے

ایضاً

(۱)

آفت تھی قیامت تھی چھلاوہ تھی بلا تھی   بجلی تھی کٹاری تھی قرولی تھی قضا تھی
روکے کوئی کیا باڑھ نہ تھی سیل فنا تھی   پشتہ تھا وہ ظالم کہ موجس کی غذا تھی
بجلی کو بھی تڑپا دیا تھا جلوہ گری نے
تاب اس کی نہ تھی مانگ نکالی تھی پری نے

ایضاً

بسمل ہوا جس کو چمک اس کی نظر آئی   بجلی سی جو چمکی تو کلیجوں میں در آئی
چورنگ کیا اس کو جسے آٹھ کر آئی   اٹکھیلیاں کرتی ادھر آئی ادھر آئی
حوروں میں یہ گرمی نہ لگاوٹ یہ پری میں
بے دم کیا لاکھوں کو اسی عشوہ گری میں

(۲)

فولاد کی ڈھالوں پہ وہ تلوار نہ ٹھہری   اک دم بھی میان صف کفار نہ ٹھہری
سر سیکڑوں کاٹے کبھی نہار نہ ٹھہری   خون اتنے کیے اور گنہگار نہ ٹھہری
مجرم رہی سرکش رہی بیباک رہی وہ
دھبا نہ لگا خون سے بھی پاک رہی وہ

ایضاً

نے ڈھال پہ نے سر پہ نہ گردن پہ رکی وہ   سینے پہ نہ بکتر پہ نہ جوشن پہ رکی وہ

نے سنگ نہ اشجار نہ آہن پہ رُکی وہ　　نے زین پہ نہ پاکھر پہ نہ توسن پہ رُکی وہ

یہ چاشنیٔ خون عدو بھا گئی اس کو
بجلی کی طرح جس پہ گری کھا گئی اس کو

سینے پہ در آئی تو نئی چال سے نکلی　　(۲) پہونچے کو قلم کرتی ہوئی ڈھال سے نکلی
ڈوبی جو زرہ میں تو عجب حال سے نکلی　　مچھلی سی تڑپتی ہوئی اک جال سے نکلی

چار آئینہ کو آٹھ کیا کاٹ نے اس کے
بتلا دی ہر اک کشتیٔ تن گھاٹ نے اس کے

ایضاً

پہونچی جو چمک کر کسی ظالم کی سپر تک　　بجلی سی سپر سے وہ گئی کاسۂ سر تک
اللہ ری صفائی نہ ہوئی اس کو خبر تک　　یہ سر سے گئی سینے پہ سینے سے کمر تک

کاٹی کمر اس طرح سے دو کرکے زرہ کو
جس طرح کوئی کھول دے ناخن سے گرہ کو

میر مہدی حسین مجروح

(تشبیب قصیدہ)

خاک میں گو جگر و دل مگر اے ضبط فغاں　　دیکھنا آتش خس پوش سے اُٹھے نہ دھواں
ہمسری اس دہن تنگ سے کس طرح کرے　　غنچہ ظاہر میں تو خوشبو ہے یہ وہ بات کہاں
میں جو کہتا ہوں تجھے قتل ہے میرا منظور　　کس صفائی سے وہ بیساختہ کہتا ہے کہ ہاں
پردہ ہی یار کا بہتر ہے کہ جوں شبنم دھر　　وہ اگر سامنے آیا تو یہ بے تاب کہاں

جہد لازم ہے ہر اِک کام میں گر غور کرو — نہ تو مشکل کوئی مشکل ہے نہ آساں آساں
یاد رہتی ہے فقط نام سے دیکھ عنقا کو — نام رہنے کے لیے اسنے مٹایا ہے نشاں

خوش دلی بہم اسباب کا ہونا معلوم
دل کہاں وقت کہاں عمر کہاں یار کہاں

تشبیب قصیدہ

کچھ نئے رنگ سے اس فصل میں ہے جوشِ بہار — باغباں کی نہیں کچھ سعی گلوں کو درکار
اس قدر باغ میں ہے غنچہ و گل کی کثرت — کہ ہوا بادِ صبا کا بھی گزرنا دشوار
سبز عالم کو کیا ابر و ہوائے ایسا — آشیاں بننے کو بلبل کے نہیں ہیں خس و خار
ابر نے محو کیے جزو کدورت یاں تک — ہو گیا صاف اگر تھا کہیں آنکھوں میں غبار

معتدل فیضِ ہوا سے ہے یہ طبعِ عالم
کوئی نرگس کی صفت میں نہیں لکھتا بیمار

غزلیات

غیروں کو بھلا سمجھے اور مجھ کو بُرا جانا (۱) سمجھے بھی تو کیا سمجھے جانا بھی تو کیا جانا
کچھ عرض تمنا میں شکوہ نہ ستم کا تھا — میں نے تو کہا کیا تھا اور آپ نے کیا جانا
اِک عمر کا دکھ پائے سوتے ہیں فراغت سے — اے غلغلۂ محشر ہم کو نہ جگا جانا

مجروح ہوئے مائل کس آفت دوراں پر
اے حضرتِ دل تم نے بھی دل نہ لگا جانا

شجر پہ برق کا کھٹکا زمیں پہ سیل کا ڈر (۲) ہم آشیانہ بنائیں بھلا کہاں صیاد
نہ سوجھتی ہے رہائی نہ موت آتی ہے — نہ مہرباں ہے قسمت نہ مہرباں صیاد

تمام عمر رہا قید اب رہا کیا ہوں
مجھے تو یاد نہیں اپنا آشیاں صیاد
کبھی نہ دانہ پہ گرتے نہ دام میں پھنستے
کمیں میں اپنی نہ ہوتا اگر نہاں صیاد

(۳)

حرف تم اپنی نزاکت پہ نہ لانا ہرگز
ہاتھ بیداد ستم سے نہ اٹھانا ہرگز
تم بھی چوری کو یقیں ہے نہ کہوگے اچھا
اب ہمیں دیکھ کے آنکھیں نہ چرانا ہرگز
ذکر بربادیٔ دہلی کا سنا کر ہمدم
نیشتر زخم کہن پر نہ لگانا ہرگز
میں ہوں اک مجمع احباب کا بچھڑا گلچیں
مجھ کو گلدستۂ رنگیں نہ دکھانا ہرگز
دار فانی میں نہ کر فکر قیام اے ناداں
گزرِ سیل ہے یاں گھر نہ بنانا ہرگز
جن کے ایوان تھے ہم پلۂ قصر قیصر
اُن کی ملتا نہیں قبروں کا ٹھکانا ہرگز
قصر حالی کے حوالی میں ذرا تم مجروح
اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد نہ بنانا ہرگز

(۴)

دل کی بے چینیاں گئیں نہ کہیں
اک کھٹک سی رہی کہیں نہ کہیں
اتنا مردود ہوں کہ ڈر ہے مجھے
قبر سے پھینک دے زمیں نہ کہیں
میں تو سمجھا ہوں عشق غیر غلط
اُن کو ہو جائے پر یقیں نہ کہیں
اُس کا ملنا تو ہے بہت دشوار
گم ہوں اِس راہ میں ہمیں نہ کہیں
بزم مے کب ہیں چھوڑنے والے
ہوں گے مجروح یاں کہیں نہ کہیں

(۵)

میں آہ ہوں تو خونِ جگر میں تپیدہ ہوں — میں زخم ہوں تو سودۂ الماس دیدہ ہوں

طوفانِ جہل نے مرا جوہر مٹا دیا — میں اک کتاب خوب ہوں پر آب دیدہ ہوں

کیا کیا نہ بعد مرگ کے آسائشیں ہیں — میں قبر میں مسافرِ منزل رسیدہ ہوں

دیکھے رقیب سامنے آنا نہ تو مرے — میں دستِ روزگار میں تیغ کشیدہ ہوں

اس خاکداں سے طبع کو ہوتا نہیں لگاؤ
کس جوہرِ لطیف سے میں آفریدہ ہوں

(۶)

سدا عروج پہ مانندِ حسنِ یار ہوں میں — خزاں کو دخل نہیں جس میں وہ بہار ہوں میں

مفید ہونے میں گو پند پختہ کار ہوں میں — مگر مزاج میں عالم کے ناگوار ہوں میں

شب فراق کی بے چینیاں معاذ اللہ — کہ ایک آن میں مرتا ہزار بار ہوں میں

فروغ بخشِ نظر ہوں نہ زیب کاشانہ — فضائے دہر میں شمع سر مزار ہوں میں

نظر جو چھپ کے بھی ڈالی ہے چشم مشکوں پہ — نگاہِ ناز یہ کہتی ہے ہوشیار ہوں میں

ہے اُس کے دیدۂ خونبار کا یہی ایما
کہ لالہ رُو ہو اگر تم تو لالہ کار ہوں میں

(۷)

یہ جو چپکے سے آئے بیٹھے ہیں — لاکھ فتنے اُٹھائے بیٹھے ہیں

وہ نہیں ہیں تو درد کو اُن کے — سینہ سے ہم لگائے بیٹھے ہیں

یہ بھی کچھ جی میں آ گئی ہوگی — کیا وہ میرے بٹھائے بیٹھے ہیں

لااُبالی خرام ہے مجروح — ق — وضع کیسی بنائے بیٹھے ہیں

کل تقدس مآب مسجد تھے — آج رندوں میں آئے بیٹھے ہیں

(۸)

غم کے چھٹ جانے کی حکمت ہی سہی — جان دنیا اُسے رشوت ہی سہی
کچھ تو ہے تلخیٔ غم کی تدبیر — لبِ شیریں کی حکایت ہی سہی
کوئی لے جائے مجھے قاتل تک — غلبۂ شوقِ شہادت ہی سہی

ہاں شبِ غم تو بسر ہو مجروح
صبح کو روزِ قیامت ہی سہی

(۹)

یہ جواب لطفِ زبانی اور ہے — کچھ مری اُلفت بڑھانی اور ہے
جانشیں ہیں اُس کے پیچیدہ ستم — طرزِ جورِ آسمانی اور ہے
ہوگئے نابود - پر باقی ابھی — اِک نشانِ بے نشانی اور ہے
کیا مزہ جب اور واقف ہوگئے — لذّتِ دردِ نہانی اور ہے

یوں تو ہیں مجروح سب شاعر فصیح
میر کی پرجوش بیانی اور ہے

(۱۰)

وہ کہاں جلوۂ جاں بخشِ بتانِ دہلی — کیوں کہ جنّت پہ کیا جائے گمانِ دہلی
ان کا بے وجہ نہیں ٹوٹ کے ہونا برباد — ڈھونڈھتے ہیں اپنے مکینوں کو مکانِ دہلی
مہر - زرِ خاک کو کرتا ہے - یہ سچ ہے لیکن — اس سے کچھ بڑھ کے ہیں صاحب نظرانِ دہلی
وہ ستم دیکھ چکے تھے کہ رہے آسودہ — فتنہ و حشر ہیں آفت زدگانِ دہلی

کربت و غربت و تنہائی شبہائے دراز
اور مجروح دل افگار - بیانِ دہلی

منشی امیر احمد امیر مینائی مرحوم

غزلیات

(۱)

کچھ ٹھکانہ ہے ناتوانی کا | نہ اُٹھا بوجھ زندگانی کا
مرگ جس کو جہاں میں کہتے ہیں | نام ہے میری زندگانی کا
مثلِ شبنم ہماری قسمت میں | ایک دانہ ہے وہ بھی پانی کا
بہرِ نامِ سکندر آئینہ | چشمہ ہے آبِ زندگانی کا
نہ اُٹھا مفلسی میں دستِ سوال | ہے یہ احسان ناتوانی کا
منتظر حشر میں ہے دامنِ تر | مہرِ محشر کی مہربانی کا
زیست کا اعتبار کیا ہے امیرؔ | آدمی بلبلہ ہے پانی کا

(۲)

عمر برق و شرار ہے دنیا | کتنی بے اعتبار ہے دنیا
نشۂ عیش یاں نصیب کسے | کہ سراپا خمار ہے دنیا
آنے جانے پہ سانس کے ہے مدار | سخت ناپائدار ہے دنیا
ایک جھونکے میں ہے اِدھر سے اُدھر | چار دن کی بہار ہے دنیا

بدتر اس کو سمجھ خزاں سے امیرؔ
دیکھنے کو بہار ہے دنیا

(۳)

جی ہی لیگا غمِ جاناں میرا
مجھ کو کھا جائیگا مہماں میرا

ملک الموت جسے کہتے ہیں
زندگی بھر ہے نگہباں میرا

چار آنسو جو ندامت سے بہے
دھو گیا نامۂ عصیاں میرا

ضعف سے ہوں صفتِ تارِ نظر
کیا کرے گی صفِ مژگاں میرا

کیا دورنگی ہے زمانے کی امیر
ہیں حزیں، زخم ہے خنداں میرا

(۴)

موقوف جرم ہی پہ کرم کا ظہور تھا
بندے اگر قصور نہ کرتے قصور تھا

اے برقِ حسنِ یار یہ اچھا ظہور تھا
دیدار کو کلیم سے جلنے کو طور تھا

بانٹا تمام خلق کو اللہ نے وہی
جو کچھ بچا ہوا تری خلقت سے نور تھا

عجز و نیاز ادھر تو اُدھر تھا غرور و ناز
جتنے تھے ہم قریب وہ اُتنا ہی دور تھا

میرے عمل تو قابلِ دوزخ ہی تھے مگر
کرتا جو وہ نہ رحم تو رحمت سے دور تھا

کیا بات اے امیر جو بہ شِ نشاطِ شباب کی
غم آتے آتے دل میں ہمارے سرور تھا

(۵)

اللہ رے لاغری کہ تری جلوہ گاہ میں
پس پس گیا ہوں دب کے میں گردِ نگاہ میں

تیرے جلال میں بھی مزہ ہے جمال کا
چشمِ کرم چھپی ہے غضب کی نگاہ میں

قالب کو بھی قیام نہیں روح کی طرح
منزل چلی ہے ساتھ مسافر کی راہ میں

ہم ہیں سیاہ کار تو رحمت ہے پردہ پوش
مے پیتے ہیں تو سایۂ ابرِ سیاہ میں

سودا و میر دونوں تھے کامل مگر امیر
ہے فرق واہ واہ میں اور آہ آہ میں

(۶)

کہتا ہے کون آہ میں ابھی اثر نہیں
ہاں دل دُکھے کسی کا یہ مدِ نظر نہیں

ہم بیقرار ہوتے ہیں کب سے خاک پہ
آسودگانِ خاک تمھیں کچھ خبر نہیں

محفل میں شمع، باغ میں شبنم، فلک پہ ابر
کس کی ہے آنکھ جو مرے ماتم میں تر نہیں

افسردگی وہی ہے ہماری پسِ فنا
سنگِ مزار میں بھی ہمارے شرر نہیں

دیتا ہے طرفہ میکدہ بے خودی امیر
سب مست ہیں کسی کو کسی کی خبر نہیں

(۷)

حسرت نہیں وطن کی تباہی میں رہ گئی
کچھ گرد تھی کہ دامنِ راہی میں رہ گئی

صد شکر عفو میرے گنہ حشر میں ہوئے
حرمت گدا کی مجلسِ شاہی میں رہ گئی

ڈوبے ہوئے نصیب نہ اُچھلے کسی طرح
کشتی اُبھر اُبھر کے تباہی میں رہ گئی

اللہ رے انقلاب محل ہے نہ قصر ہے
تربت فقط عمارتِ شاہی میں رہ گئی

صد شکر حق نے میری تواضع قبول کی
اچھی تھی شے خزانۂ شاہی میں رہ گئی

تھی زار کوئے یار میں کیا جانی اپنی خاک
اتنی تھی کم کہ اُڑ کے ہوا ہی میں رہ گئی

پردے سے اُسکی ذات کو کیا کام تھا امیر
چھپ کر صفاتِ نامتناہی میں رہ گئی

(۸)

دل میں جو داغ ہیں ندامت کے
پھول ہیں سب یہ باغِ جنت کے

سوکھے جب پھول میری تربت کے
دوڑے سقّے سحابِ رحمت کے

دل مرا اور آرزو تیری
جان صدقے ہوا ایسی حسرت کے

تیری صورت بنا کے بیٹھ رہے
کارکن کارگاہِ صنعت کے

اِس کا نقشہ کھچے تو لے نقاش — رنگ بھرنا میری طبیعت کے
کیوں نہ ہو رنگ آنسوؤں کا سیاہ — ہیں عزادار دل کی حسرت کے
جتنے تکیے میں سو رہے ہیں امیر — یار ہیں سب ہماری صحبت کے

(۹)

دکھلا کے اِک جھلک جو وہ روپوش ہو گئے — کیا کیا خیال خواب فراموش ہو گئے
میں ہوں وہ عندلیب ہوا جب ترانہ سنج — جتنے کھلے تھے گل ہمہ تن گوش ہو گئے
سب ذوق شوق ساتھ جوانی کے چل بسے — دو چار دن وہ ولولے وہ جوش ہو گئے
کب تک بغل میں پالے ہوئے دل کو رو دیئے — خالی یونہیں ہزاروں کے آغوش ہو گئے
افسردہ داغ دل ہوئے پیری میں کیا امیر — گویا چراغ صبح کہ خاموش ہو گئے

(۱۰)

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے — زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے
نہ گل ہیں نہ غنچے نہ بوٹے نہ پتے — ہوئے باغ نذر خزاں کیسے کیسے
ستاروں کی دیکھو بہار آنکھ اٹھا کر — کھلاتا ہے پھول آسماں کیسے کیسے
خزاں لوٹ ہی لیگئی باغ سارا — تڑپتے رہے باغباں کیسے کیسے
بنا کر دکھائے مرے دردِ دل نے — تہِ آسماں، آسماں کیسے کیسے
رہ عشق میں پھرتے ہیں مارے مارے — تباہی زدہ کارواں کیسے کیسے
بنے تھے تار اشکوں کے غربت میں کیا کیا — ملے خاک میں کارواں کیسے کیسے
جگر ہیں تڑپ دل میں درد آنکھوں میں دم — ملے ہیں ہمیں میہماں کیسے کیسے
امیر اب مدینے کو تو بھی رواں ہو — چلے جاتے ہیں کارواں کیسے کیسے

فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ دہلوی مرحوم

غزلیات

(۱)

جلوہ اس کا نظر نہیں آتا — نہیں آتا نظر نہیں آتا
آنکھ کھلتے ہی خوابِ غفلت سے — ہائے کیا کیا نظر نہیں آتا
ہم تو کہنے کو حالِ دل کہہ دیں — سُننے والا نظر نہیں آتا
ڈھونڈھتی ہیں جسے مری آنکھیں — وہ تماشا نظر نہیں آتا
تو نے جس دن سے کی مسیحائی — کوئی اچھا نظر نہیں آتا
لے چلے مجھکو رہ روانِ عدم — یاں ٹھکانا نظر نہیں آتا
ہمیں اے داغ کو رباطن ہیں — ورنہ وہ کیا نظر نہیں آتا

(۲)

شب فراق جو دستِ دُعا بلند ہوا — ندائیں آئیں کہ بابِ قبول بند ہوا
تمھاری لُطف و عنایت کا واہ کیا کہنا — کہ جس کا درد کیا وہی دردمند ہوا
دفورِ عجز پہ سو سو غرور مجکو ہوئے — بڑا ہی ناز ہوا جب نیاز مند ہوا
وہ دل ہے جو ترے تلووں تلے ہوا پامال — وہ سر ہے جو ترے نیزے پہ سربلند ہوا

علاج نشۂ الفت کا داغ ہو نہ سکا
گھڑی گھڑی میں دو بالا ہوا دوچند ہوا

(٣)

بشر نے خاک پایا لعل پایا یا گہر پایا — مزاج اچھا اگر پایا تو سب کچھ اُس نے بھر پایا
نفس کے آنے جانے پر بشر کی زندگی ٹھہری — یہ پوچھو تو مسافر تو نے کیا لطفِ سفر پایا
جراحت کا مزا ہو چارہ گر ناسور ہو جائے — بندھا جس زخم کا انگور اُس نے کیا ثمر پایا
نہ کھایا تھا کبھی خونِ جگر ہم نے مگر کھایا — نہ پایا تھا کبھی آزار اُلفت میں مگر پایا
رئیسِ مصطفیٰ آباد کے نوکر ہوئے جب سے — کہیں کیا داغ ہم آرام ہم نے کس قدر پایا

(٤)

ہم نے اُن کے سامنے اوّل تو خنجر رکھ دیا — پھر کلیجہ رکھ دیا دل رکھ دیا سر رکھ دیا
قطرۂ خونِ جگر سے کی تواضع عشق کی — سامنے مہمان کے جو کچھ تھا میسّر رکھ دیا
منصفی ہو تو غضب نامنصفی ہو تو ستم — اُس نے میرا فیصلہ موقوف مجھ پر رکھ دیا
کہتے ہیں بوئے وفا آتی ہے اِن پھولوں میں آج — دل جو ہم نے لالہ و گل میں ملا کر رکھ دیا
زندگی میں پاس سے دم بھر نہ ہوتے تھے جُدا — قبر میں تنہا مجھے یاروں نے کیونکر رکھ دیا
دیکھیے اب ٹھوکریں کھاتی ہے کس کس کی نگاہ — روزنِ دیوار میں ظالم نے پتھر رکھ دیا
داغ کی شامت جو آئی اضطرابِ شوق میں — حالِ دل کمبخت نے سب اُن کے منہ پر رکھ دیا

(٥)

یاں امتحانِ برقِ تجلّی ضرور تھا — کیا میں نہ تھا اِس آگ میں جلنے کو طور تھا
کیوں نا اُمیدِ عفو ہوں کیا یہ سُنیگا وہ — اِس کا نہ بخشنا تری رحمت سے دور تھا
ہو خوش نما خراشِ دل اے پنجۂ جنوں — مرجاؤں میں تو یہ نہ کہیں بے شعور تھا
کیوں تو نے چشمِ لطف سے دیکھا غضب کیا — قربان اُس نگاہ کے جس میں غرور تھا

پاسِ ادب سے رہ گئی فریاد کچھ ادھر — میں کیا کہوں کہ عرش بریں کتنی دور تھا
دیکھا سلف سے آج تک انصاف عشق کا — تقصیر وار تھا وہی جو بے قصور تھا
اے داغ صدمۂ غم ہجراں بجا درست — یہ سب سہی مگر تمہیں جینا ضرور تھا

(۶)

سوز و گداز عشق کا لذت چشیدہ ہوں — مانند آبلہ ہمہ تن آب دیدہ ہوں
سرو سہی ہوں اور نہ شاخ خمیدہ ہوں — تسلیم و راستی کے لئے آفریدہ ہوں
نازک مزاجیوں نے مجھے کچھ سا کر دیا — لے ہجر میں اپنے سے آپ ہی کشیدہ ہوں
اے آرزوئے تازہ نہ کر مجھ سے چھیڑ چھاڑ — میں پائے شوق و دست تمنا بریدہ ہوں
اے داغ جس کے واسطے روز جزا بنا — وہ کون ہے وہ میں ہی تو آفت رسیدہ ہوں

(۷)

الٰہی کیا کریں ضبط محبت ہم تو مرتے ہیں — کہ نالے تیر بن بن کر کلیجے میں اترتے ہیں
نہ کرنا منفعل اے ناخن غم تیغ قاتل سے — کہ رنگ گریہ کہتا ہے جگر کے زخم بھرتے ہیں
نہ پوچھو کچھ مصیبت دردمندان محبت کی — خدا پہ خوب روشن ہے کہ جس طرح کرتے ہیں
ہم اس غفلت کے صدقے کوئی دم چھٹتے تو ہیں غم سے — کہ جس دم ہوش آتا ہے تو پھر دل فکر کرتے ہیں
کبھی یہ دل تماشاگاہ تھا عیش و مسرت کا — اب اس میں حسرت و یاس و تمنا سیر کرتے ہیں
کبھی جھکتا ہوں شیشے پر کبھی گرتا ہوں ساغر پر — مری بیہوشیوں سے ہوش ساقی کے بکھرتے ہیں
نہ پوچھو داغ ہم سے انتظار یار کی صورت — یہ آنکھیں جانتی ہیں خوب جو نقشے گزرتے ہیں

(۸)

آنکھیں بچھائیں ہم تو عدو کی بھی راہ میں — پر کیا کریں کہ تو ہے ہماری نگاہ میں

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں
آتی ہے بات بات مجھے یاد بار بار
کہتا ہوں دوڑ دوڑ کے قاصد سے راہ میں
کیسا نظارہ کس کا اشارہ کہاں کی بات
سب کچھ ہے اور کچھ نہیں نیچی نگاہ میں
مشتاق اِس عدا کے بہت دردمند تھے
اے داغؔ تم تو بیٹھ گئے ایک آہ میں

(۹)

تیری صورت کو دیکھتا ہوں میں
اُس کی قدرت کو دیکھتا ہوں میں
وہ مصیبت سُنی نہیں جاتی
جس مصیبت کو دیکھتا ہوں میں
دیکھنے آئے ہیں جو میری نبض
اُن کی صورت کو دیکھتا ہوں میں
موت مجھ کو دکھائی دیتی ہے
جب طبیعت کو دیکھتا ہوں میں
دور بیٹھا ہوا سرِ محفل
رنگِ صحبت کو دیکھتا ہوں میں
حشر میں داغؔ کوئی دوست نہیں
ساری خلقت کو دیکھتا ہوں میں

(۱۰)

اشکِ خوں رنگ لائے جاتا ہے
داغؔ اپنی جمائے جاتا ہے
کتنا باوضع ہے خیال اُس کا
بیکسی میں بھی آئے جاتا ہے
نا اُمیدی مٹائے جاتی ہے
شوق نقشہ جمائے جاتا ہے
غم نے اُس کے گھلا دیا دیکھو
مجھ کو مہمان کھائے جاتا ہے
اُس کا آنا تو درکنار اے داغؔ
دل بھی قابو سے ہائے جاتا ہے

(۱۱)

دشمنوں سے دوستی غیروں سے یاری چاہیئے
خاک کے پتلے بنے تو خاکساری چاہیئے

وعدہ تو کر لو زباں سے پھر وفا کرنا نہ تم — نا اُمیدوں کے لئے اُمیدواری چاہیئے

اے فلک شکلیں ہی کچھ ہو جائیں ہم انجام کار — اِس مرقع میں کوئی صورت ہماری چاہیئے

دل پہ گر قابو نہیں اے داغ تو ہو جائے شکر — عاشقوں کیواسطے بے اختیاری چاہیئے

(۱۲)

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے — دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے

ہم نکمے ہوئے زمانے کے — کام ایسا سکھا دیا تو نے

کچھ تعلق رہا نہ دُنیا سے — شغل ایسا بتا دیا تو نے

کس خوشی کی خبر سُنا کے مجھے — غم کا پُتلا بنا دیا تو نے

لاکھ دینے کا ایک دینا ہے — دلِ بے مدعا دیا تو نے

کیا بتاؤں کہ کیا لیا میں نے — کیا کہوں میں کہ کیا دیا تو نے

بے طلب جو ملا ملا مجھ کو — بے غرض جو دیا دیا تو نے

جس قدر میں نے تجھ سے خواہش کی — اُس سے مجھ کو سوا دیا تو نے

مٹ گئے دِل سے نقشِ باطل سب — نقشہ اپنا جما دیا تو نے

مجھ گنہگار کو جو بخش دیا — تو جہنم کو کیا دیا تو نے

داغ کو کون دینے والا تھا
جو دیا اے خدا دیا تو نے

*

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد مرحوم

(معرفت الٰہی)

آؤ آزاد بیٹھے کیا ہو خموش ۔۔۔ فصل گل آئی ہے بجوش و خروش
کیا پڑے کنج غم میں ہو بیکار ۔۔۔ گل و گلشن کی چل کے دیکھو بہار
لطف صحبت بہم غنیمت ہے ۔۔۔ میاں آزاد دم غنیمت ہے
چل کے دیکھو ذرا چمن کی سیر ۔۔۔ گل و گلزار و یاسمن کی سیر
گرچہ بہر عوام کالانعام ۔۔۔ لطف گلگشت ہو گیا بدنام
پر کرو دل میں تم جو اپنے غور ۔۔۔ ہے ہر اک امر کا علیحدہ طور
نیک و بد پہ اگر نظر ہے شرط ۔۔۔ قصد کا اپنے بھی اثر ہے شرط
سینکڑوں چیزیں اس جہاں میں ہیں ۔۔۔ کہ بری خلق کے گمان میں ہیں
گل و سنبل سے تا خس و خاشاک ۔۔۔ خاک سے تا بہ گلشن افلاک
رکھتے جو لوگ ہیں نظر عالی ۔۔۔ نہیں عبرت سے کوئی رشتے خالی
ہر ورق ہے شجر پہ بہر حساب ۔۔۔ بلکہ دشت موعظت کی کتاب
گوش عبرت نہیں تو کھولتا ہے ۔۔۔ ورنہ ہر برگ یاں کا بولتا ہے
ہر زباں برگ ۔ گوش دل گل ہے ۔۔۔ تو ہی مدہوش نشۂ مُل ہے
ایک دن دل جو میرا گھبرایا ۔۔۔ کلبۂ غم سے میں نکل آیا
دل تھا پژمردہ غنچہ وار مرا ۔۔۔ ہوا گلزار میں گزارا مرا

پھرتے پھرتے جو دل میں کچھ آیا — پاس کے اک جا درخت کا سایا
بیٹھا میں بر کنار آب رواں — کہ ہی نہر رواں حباب رواں
کی جو یکبار آنکھ اٹھا کے نظر — برگ اک ٹوٹ کر ز شاخِ شجر
اُترا اوپر سے جوں پیام سروش — اور ہوا میری زینتِ آغوش
گرچہ گویا نہ تھی زبانِ مقال — پر وہ کہتا تھا۔ فی لسان الحال
کہ اگر تجھ کو چشم بینا ہے — تو یہ قدرت کی لوحِ مینا ہے
نہیں مجھ میں ہے یہ رگ و ریشہ — دیکھ ان کو بہ چشم اندیشہ
صانعِ غیب کا ہے کارِ بدیع — کلکِ صنعت کا ہے نگارِ بدیع
روئے ہستی پہ تھا نہ نام مرا — تھا رگِ شاخ میں مقام مرا
فیضِ آب اور باد کی نرمی — اُس کی نرمی و مہر کی گرمی
مادرِ خاک سے ہوئے دوچار — روح جنبش میں آگئی یکبار
مُنہ کو گردِ عدم سے صاف کیا — سینۂ شاخ کو شگاف کیا
سبز کونپل تھا جب نکالا سر — پردہ کونپل تھی غیرتِ گلِ تر
کھائی میں نے جو اس چمن کی ہوا — دیا شاخ و شجر کو برگ و نوا
میرا یمنِ قدم یہ آیا راس — ہو گیا ہر درخت خضر لباس
زرد برگِ شجر ہوا مجھ سے — گل کا آباد گھر ہوا مجھ سے
بار مجھ میں نہ زینہار آتا — پہلے برگ آتا پیچھے بار آتا
تاجِ سر میں بنے نہال ہوا — مجھ سے سارا چمن نہال ہوا
سب کے سر پہ تھا نخل کا سایا — میرا سایا تھا نخل پہ چھایا

جس سے سایے جہان کو راحت تھی ہر مسافر کو اس سے راحت تھی
شاخ گل تھی ہری بھری مجھ سے زیب و زینت چمن کی تھی مجھ سے
تھے رفاقت سے میری سرو آزاد مجھ سے زیبا تھا طرۂ شمشاد
چشم نرگس چمن کا جو بن تھی برگ گویا زبان سوسن تھی
ساری ذات و صفات ہی مجھ میں گل میں جو کچھ ہی بات ہے مجھ میں
کون سی بات مجھ سے چھوٹی ہے مجھ میں اکسیر تک کی بوٹی ہے
مرہم زخم جان و خاطر ریش برگ سبز است تحفۂ درویش
ہر خزاں کو بہار لازم ہے ہست کو نیستی ملازم ہے

"اولوالعزمی کے لئے کوئی شے سدّ راہ نہیں"

ہے سامنے کھلا ہوا میداں چلے چلو باغ مراد ہے ثمر افشاں چلے چلو
دریا ہو بیچ میں کہ بیاباں چلے چلو ہمت یہ کہہ رہی ہے کھڑی ہاں چلے چلو
چلنا ہی مصلحت ہے مری جاں چلے چلو

ہیں کوہ و دشت جیسے کہ پھولا پھلا چمن دامن میں ہیں بھرے ہوئے نسرین و نسترن
نہریں ادھر ادھر ہیں امید و نگی موج زن اس دشت میں نہ دوڑ سکیں گے گر ہرن
کبک دری کی طرح خراماں چلے چلو

آؤ کہ کھیلے اپنے نشان ننگ و نام نے باندھی کمر ہے کس کے ہر اک شادکام نے
کیوں اس طرح کمر کو لگے تھک کے تھامنے دیوار باغ وہ نظر آتی ہے سامنے
سرو سہی کے سر ہیں نمایاں چلے چلو

یارو چلو چلو نہ کرو انتظار تم کرتے ہو کیا امید بمین و یسار تم

میدان عزم و بزم کے ہو شہسوار تم　　بڑھ جاؤ گے گرو سکے اگر مار مار تم
چلا رہی ہے ہمت مرداں چلے چلو

ہمت کے شہسوار جو گھوڑے اٹھائینگے　　دشمن فلک بھی ہونگے تو سر کو جھکائینگے
طوفان بلبلوں کی طرح بیٹھ جائیں گے　　نیکی کے زور اٹھکے بدی کو دبائینگے
بیٹھو نہ تم مگر کسی عنواں چلے چلو

آئینہ دل کا گرد سفر سے اُجال دو　　پوچھے کوئی ارادہ کدھر ہی تو ٹال دو
شیطان جو شبہ ڈالے تو دل سے نکال دو　　ہو خوف کا خیال تو بزدل پہ ٹال دو
اور آپ بن کے شیر نیستاں چلے چلو

آگے بڑھو کہ اب نہیں تاب قرار ہے　　کرنا ہے جبکہ کام تو کیا انتظار ہے
جو کچھ کہ معرکہ تھا لیا تم نے مار ہے　　ہو تم بھی خوش کہ آئی خوشی کی بہار ہے
فتح و ظفر نے لے لیا میداں چلے چلو

رکھو رفاہ عام پہ اپنا مدار تم　　اور ہو کبھی صلہ کے نہ اُمیدوار تم
عزت خدا جو دیوے تو پھر کیوں ہو خوار تم　　دو رُخ کو آب فخر سے رنگ بہار تم
گلشن میں ہو کے باد بہاراں چلے چلو

آؤ سپید کا فیصل حساب ہے　　چمکا یا چہرہ صبح نے باآب و تاب ہے
ظلمت پہ نور ہونے لگا فتحیاب ہے　　اور شب کے پیچھے تیغ بکف آفتاب ہے
تم بھی ہو آفتاب درخشاں چلے چلو

نیکی بدی کے دیر سے باہم تھے معرکے　　اب خاتموں پہ آگئے ہیں اُنکے فیصلے
قسمت کا یہ نوشتہ نہیں جو نہ مٹ سکے　　وہ گئے بنجا طلب فتح کہ میدان لے لئے
ہو کرنا سے جنگ کی الحان چلے چلو

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالیؔ مرحوم

رباعیات

(۱)

اے عقل کی فہم کی رسائی سے دور — اور [illegible] چھل، تو نظر سے مستور
یہ حسرت وہ دل میں قائم رکھیو — بس [illegible] حسرت میں یہی ہے اک نور

(۲)

کانٹا ہے ہر اک جگر میں اٹکا تیرا — حلقہ ہے ہر اک گوش میں لٹکا تیرا
مانا نہیں جس نے تجھکو۔ جانا ہے ضرور — بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا تیرا

(۳)

ہستی سے ہے تیری رنگ و بو سب کے لیے — طاعت میں ہے تیری آبرو سب کے لیے
ہیں تیرے سوا سارے سہارے کمزور — سب اپنے لیے ہیں اور تو سب کے لیے

(۴)

زہاد کو تو نے محوِ تمجید کیا — عشاق کو مستِ لذتِ دید کیا
طاعت میں رہا نہ حق کی ساجھی کوئی — توحید کو تو نے آکے توحید کیا

(۵)

کی طاعت نفس میں بہت عمر بسر — انجام کی رکھی نہ جوانی میں خبر
کیفیتِ شب اُٹھا چکے اب حالیؔ — مجلس کرو برخاست ہوا وقت سحر

(۶)

پیری نہیں منزلِ فنا ہے گویا
اب کوچ کا وقت آ لگا ہے گویا
یوں جسم سے ہو گئی حرارت کافور
اِک راکھ کا ڈھیر رہ گیا ہے گویا

(۷)

رکھتے نہیں وہ مدح و ثنا کی پروا
جو کر کے خیلِ خلق سے سُنتے ہیں بُرا
ان گالیوں کا ہے جن کو چسکا حالی
آتا نہیں ان کو کچھ دُعاؤں میں مزا

(۸)

جیسا نظر آتا ہوں نہ ایسا ہوں میں
اور جیسا سمجھتا ہوں نہ ویسا ہوں میں
اپنے سے بھی عیب ہوں چھپاتا اپنے
بس مجھکو ہی معلوم ہے جیسا ہوں میں

(۹)

ہو عیب کی خو یا کہ ہُنر کی عادت
مشکل سے بدلتی ہے بشر کی عادت
چھٹتے ہی چھٹے گا اُس گلی میں جانا
عادت اور وہ بھی عمر بھر کی عادت

"دولت اور وقت کا مناظرہ"

ایک دِن وقت نے دولت سے کہا
سچ بتا تجھ میں ہے فوقیت کیا
تو ہے سرمایۂ عزت یا میں
تو ہے انسان کی دولت یا میں
ہے زمانہ میں بڑی بات تری
دیکھیں ہم بھی تو کرامات تری
وقت سے ہنسکے یہ دولت نے کہا
تجھ کو اے وقت نہیں عقل ذرا
ہے عجب جس کو خدائی مانے
اُس کی تو خوبیوں میں شک جانے

سبز ہے گلشنِ دُنیا مجھ سے
لیتے ہیں توشۂ عقبیٰ مجھ سے

نام اقبال ہے آنے کا مرے
لقب ادبار ہے جانے کا مرے

مجھ سے پاتے ہیں ہنر نشو و نما
علم بھی ایک طفیلی ہے مرا

لاکھ رکھتا ہو کوئی فضل و کمال
لاکھ رکھتا ہو کوئی حسن و جمال

خوبیاں لاکھ کسی میں ہوں مگر
میں نہیں ہوں۔ تو نہیں کچھ قدرِ بشر

چند روز آ گئی ہیں جس کے کام
زندہ تا حشر رہا اس کا نام

جس سے مجھ کو نہ سروکار رہا
وہ سدا خوار و نگوں سار رہا

مُنہ ذرا جس کو لگا لیتی ہوں
اُس کی میں شان بڑھا دیتی ہوں

چاہتے ہیں مجھے سب خُرد و کلاں
پھرتے ہیں دُھن میں مری پیر و جواں

گر نہ ہوں میں تو کوئی کام نہ ہو
کسی آغاز کا انجام نہ ہو

کوئی حاجت نہ ہو دُنیا کی روا
درمیاں گر نہ قدم ہو میرا

ہیں رُکائی سے مری سب لرزاں
میرے اغماض سے ڈرتا ہے جہاں

جس سے دُنیا میں نہ میں راہ کروں
ہو اگر شیر تو روباہ کروں

الغرض ہے وہ مری شان عظیم
کرتے آئے ہیں جسے سب تسلیم

جڑ سمجھتے ہیں خوشی کی مجھ کو
میری عظمت نہیں باور تجھ کو

تو بتا فخر ہے تجھ میں وہ کیا
جس نے مجھ سے تجھے گمراہ کیا

وقت نے سن کے کہا اے دولت
شک نہیں اس میں ذرا اے دولت

ساری تو خوبیوں کی جڑ ہے۔ مگر
اپنی جڑ کی نہیں کچھ تجھ کو خبر

تو جو اپنے پہ ہے نازاں اتنی
اپنی ہستی سے ہے غافل کتنی

کیجیے فرض مجھے گر چشمہ
تو ہوں اُس چشمہ کا میں سرچشمہ

میں ہوں یا تو ہے اساس مکاں؟
بہلے دریا ہے کہ مچھلی ناداں

تو جو کھیتی ہے تو قصبہ میں ہوں
تو جو موتی ہے تو دریا میں ہوں

ہے قرابہ ترا اگر عطر آگیں
میں ہوں اُس عطر کی واللہ زمیں

ہے عبث مجھ کو تفوق کا خیال
تو ہے گر مال تو میں راس المال

جن کے قبضے میں ہوں میں اے دولت
تجھ پہ رکھتے ہیں وہ دست قدرت

لاکھ بار انساں سے گر بھاگے تو
بڑھ کے جا سکتی نہیں آگے تو

اُن کی مٹھی میں ہو تو اے دولت
طائر رشتہ بپا کی صورت

نہ کہ میں جس کا بدل ہے مفقود
جس کا نایاب ہے عالم میں وجود

کھو کے مجھ کو کوئی پاتا نہیں پھر
جا کے میں ہاتھ سے آتا نہیں پھر

ایک پل میری اگر دیجیے گنوا
لیجیے ہاتھ اُس سے ہمیشہ کو اُٹھا

تو اگر اپنی لٹا دے ثروت
پل وہ ملتی نہیں پھر اے دولت

ہیں اسی واسطے جو اہل تمیز
میری ایک ایک پل اُن کو ہے عزیز

میرے جو لوگ کہ ہیں قدرشناس
ہے مرا جاگتے سوتے اُنھیں پاس

جانتے ہیں حکمائے عرفا
مجھ کو سرمایۂ دین و دنیا

دل میں جن کے مری کچھ قدر نہیں
اُن کی قسمت میں نہ دنیا ہے نہ دیں

نہ کوئی کام ہو اُن سے انجام
نہ ارادہ ہو کوئی اُن کا تمام

نہ اُنھیں دین کی دولت ہاتھ آئے
اور نہ دنیا کبھی اُن سے نبھائے

نہ ادا صوم ہو اُن سے نہ صلوٰۃ
نہ ہو قدرت میں حج اُن کی نہ زکوٰۃ

نہ مدد اُن سے کچھ اپنی کی جائے | نہ خبر اُن سے کسی کی لی جائے
گن نہیں مجھ میں بہت اے دولت | ہے مگر تنگ مجال فرصت
بس زیادہ نہیں مہلت مجھ کو | بحث کی اب نہیں طاقت مجھ کو
اس میں ہے میرا سراسر نقصان | کہ ہے انمول بہت ایک اک آن

غزلیات

(۱)

کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا | باقی ہے جو ابد تک وہ ہے جلال تیرا
ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ | ہر دل پہ چھا رہا ہے رعب جمال تیرا
گو حکم تیرے لاکھوں یاں ٹالتے رہے ہیں | لیکن ٹلا نہ ہرگز دل سے خیال تیرا
پھندے سے تیرے کیونکر جائے نکل کے کوئی | پھیلا ہوا ہے ہر سو عالم میں جال تیرا
اُن کی نظر میں شوکت جچتی نہیں کسی کی | آنکھوں میں بس رہا ہے جن کے جلال تیرا
دل ہو کہ جان تجھ سے کیونکر عزیز رکھیے | دل ہے سو چیز تیری جاں ہے سو مال تیرا
بیگانگی میں حالی۔ یہ رنگ آشنائی | سُن سُن کے سر دھنیں گے قال اہل حال تیرا

(۲)

رنج اور رنج بھی تنہائی کا | وقت پہونچا مری رسوائی کا
عمر شاید نہ کرے آج وفا | کاٹنا ہے شب تنہائی کا
ایک دن راہ پہ جا پہونچے ہم | شوق تھا بادیہ پیمائی کا
سات پردوں میں نہیں ٹھہرتی آنکھ | حوصلہ کیا ہے تماشائی کا

دنیا پہ نظر ہے جب تک — ہم کو دعویٰ نہیں بینائی کا
کچھ تو ہے قدر تماشائی کی — ہے جو یہ شوق خود آرائی کا
یہی انجام تھا اے فصل خزاں! — گل و بلبل کی شناسائی کا
مرد اسے جذبۂ توفیق کہ یاں — ہو چکا کام توانائی کا
ہوں گے حالی سے بہت آوارہ — گھر ابھی دور ہے رسوائی کا

(۳)

واں اگر جائیں تو لے کر جائیں کیا — منہ اُسے ہم جا کے یہ دکھلائیں کیا
دل میں باقی ہو وہی حرص گناہ — پھر کئے سے اپنے ہم پچھتائیں کیا
آؤ اس کو لیں حبیب جا کر منا — اس کی بے پروائیوں پر جائیں کیا
جانتا دنیا کو ہے اک کھیل تو — کھیل قدرت کے تجھے دکھلائیں کیا
عمر کی منزل تو جوں توں کٹ گئی — مرحلے اب دیکھئے پیش آئیں کیا
دل کو سب باتوں کی ہے ناصح خبر — سمجھے سمجھائے کو بس سمجھائیں کیا
ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن — راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

(۴)

جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ جانا ہرگز — دوستو! دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز
داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل — ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز
صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی — کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز
موجزن دل میں ہیں یاں خون کے دریا اے چشم — دیکھنا ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز
مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو — اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی انھیں بھول گئے
ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانا ہرگز

جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں اک ایسا گھرانا ہرگز

ہم کو گر تو نے رُلایا تو رلایا اے چرخ
ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز

یار خود روئیں گے کیا اُن پہ جہاں روتا ہے
اُن کی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز

بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دورِ زماں
نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز

یاں سے رخصت ہو سویرے کہیں اے عیش و نشاط
نہیں اس دور میں یاں تیرا ٹھکانا ہرگز

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شبانا ہرگز

بزم ماتم تو نہیں، بزم سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رُلانا ہرگز

(۵)

خوبیاں اپنے میں گو بے انتہا پاتے ہیں ہم
پر ہر اک خوبی میں داغ اک عیب کا پاتے ہیں ہم

خوف کا کوئی نشاں ظاہر نہیں افعال میں
گو کہ دل میں متصل خوفِ خدا پاتے ہیں ہم

کرتے ہیں طاعت تو کچھ خواہاں نمائش کے نہیں
پر گنہ چھپ چھپ کے کرنے میں مزا پاتے ہیں ہم

دل میں دردِ عشق نے مدت سے کر رکھا ہے گھر
پر اسے آلودۂ حرص و ہوا پاتے ہیں ہم

ہو کے نادم جرم سے پھر جرم کرتے ہیں وہی
جرم سے گو آپ کو نادم سدا پاتے ہیں ہم

ہیں فدا اُن دوستوں پر جن میں ہو صدق و صفا
پر بہت کم آپ میں صدق و صفا پاتے ہیں ہم

گو کسی کو آپ سے ہونے نہیں دیتے خفا
اک جہاں سے آپ کو لیکن خفا پاتے ہیں ہم

ہو اگر مقصد میں ناکامی تو کر سکتے ہیں صبر
دردِ خودکامی کو لیکن بے دوا پاتے ہیں ہم

ہے ردائے نیکنامی دوش پر اپنے مگر
داغِ رسوائی کے کچھ زیرِ ردا پاتے ہیں ہم

راہ کے طالب ہیں پر بے راہ پڑتے ہیں قدم
دیکھیے کیا ڈھونڈتے ہیں اور کیا پاتے ہیں ہم

نو رکے ہم نے گلے دیکھے ہیں اے حالی مگر — رنگ کچھ تیری الاپوں میں نیا پاتے ہیں ہم

(۶)

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ — مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ
تکلف علامت ہے بیگانگی کی — نہ ڈالو تکلف کی عادت زیادہ
کرو دوستو پہلے آپ اپنی عزت — جو چاہو کریں لوگ عزت زیادہ
کرو علم سے اکتساب شرافت — نجابت سے ہے یہ شرافت زیادہ
فراغت سے دنیا میں دم بھر نہ بیٹھو — اگر چاہتے ہو فراغت زیادہ
جہاں رام ہوتا ہے میٹھی زباں سے — نہیں لگتی کچھ اس میں دولت زیادہ
مصیبت کا اک اک سے احوال کہنا — مصیبت سے ہے یہ مصیبت زیادہ
کہیں دوست تم سے نہ ہو جائیں بدظن — جتاؤ نہ اپنی محبت زیادہ
جو چاہو فقیری میں عزت سے رہنا — نہ رکھو امیروں سے ملت زیادہ
وہ افلاس اپنا چھپاتے ہیں گویا — جو دولت سے کرتے ہیں نفرت زیادہ
ہے الفت بھی وحشت بھی دنیا سے لازم — پہ الفت زیادہ نہ وحشت زیادہ
فرشتہ سے بہتر ہے انسان بننا — مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ
غزل میں وہ رنگت نہیں تیری حالی — الاپیں نہ بس آپ ۔ ہر پت زیادہ

(۷)

بری اور بھلی سب گذر جائیگی — یہ کشتی یونہی پار اتر جائے گی
ملے گا نہ گلچیں کو گل کا پتا — ہر اک پنکھڑی یوں بکھر جائیگی
رہیں گے نہ ملاح یہ دن سدا — کوئی دن میں گنگا اتر جائے گی
نہ پوری ہوئی ہیں امیدیں نہ ہوں — یونہیں عمر ساری گزر جائے گی
سنیں گے نہ حالی کی کب تک صدا — یہی ایک دن کام کر جائے گی

شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی مرحوم

غزل

تیر قاتل کا یہ احساں رہ گیا
جائے دل سینہ میں پنہاں رہ گیا

کی ذرا دست جنوں نے کوتہی
چاک آکر تا بہ داماں رہ گیا

قتل ہو کر بھی سبکدوشی کہاں
تیغ کا گردن پہ احساں رہ گیا

دوسروں پر کیا کھلے راز دہن
جبکہ خود صانع سے پنہاں رہ گیا

جذبۂ دل کا ذرا دیکھو اثر
تیر نکلا بھی تو پیکاں رہ گیا

جامۂ ہستی بھی اب تن پر نہیں
دیکھ وحشی تیرا عریاں رہ گیا

ضعف مرنے بھی نہیں دیتا مجھے
میں اجل سے بھی تو پنہاں رہ گیا

اے جنوں! تجھ سے سمجھ لوں گا۔ اگر
ایک بھی تار گریباں رہ گیا

لوگ پہنچے منزل مقصود تک
میں جرس کی طرح نالاں رہ گیا

ہم تو پہنچے بزم جاناں تک مگر
شکوۂ بیداد درباں رہ گیا

یاد رکھنا۔ دوستو اس بزم میں
آکے شبلی بھی غزلخواں رہ گیا

غزلیات

(۱)

دلفشانی نے تری تیروں کو دروں کردیا
دل کو دشمن کر دیا آنکھوں کو بینا کردیا

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا

محبوبِ صانع کا نشاں رکھا ہے یہ
ورنہ کیا تھا جس نے دنیا میں دو پیدا کرد

سے اک دل کو خوش کرنے پہ وہ قادر نہیں
ایک کُن سے دو جہاں کو جس نے پیدا کردیا

لے سب باہر نکلتے ۔ وہم و خرد و ہوش و تمیز
خانۂ دل میں تم آؤ ہم نے پردا کردیا

ہو طلب کامل تو بس نعمت اسی کا نام ہے
بھوک نے نانِ جویں کو من و سلویٰ کردیا

دین سے اتنی الگ ۔ حدِ فنا سے یوں قریب
اس قدر دلچسپ پھر کیوں رنگ دنیا کردیا

بے غرض ہو کر مزے سے زندگی کٹنے لگی
ترکِ خواہش نے ہمارا بوجھ ہلکا کردیا

س نے یہ سب کچھ کیا اکبر میں تم سے کیا کہوں
اس نے مجھکو کیا کیا دل کو مرے کیا کردیا

(۲)

شناور ہوں جو ہر موج کو ساحل سمجھا
وہ مسافر ہوں جو ہر گام کو منزل سمجھا

دیکھیں مجھے اور میں نہ کروں یادِ خدا
موت ہے آپ نے ایسا مجھے غافل سمجھا

سلام کی تفریق نہیں فطرت میں
یہ وہ نکتہ ہے جسے میں بھی بمشکل سمجھا

ی دنیا میں مرے جوشِ جنوں کی تکریم
تیرے دیوانے کو عاقل نے بھی کامل سمجھا

نہ کیا یار نے اکبر کے جنوں کو تسلیم
مل گئی آنکھ تو کچھ سوچ کے عاقل سمجھا

(۳)

نورِ عرفاں عقل کے پردے میں پنہاں ہو گیا
ہوش میں آنا حجابِ روئے جاناں ہو گیا

اُن کی صورت دیکھ کر آنے لگی یادِ خدا
نورِ رخ اُن کا چراغِ راہِ عرفاں ہو گیا

ترکِ دنیا سے ہوئی جمعیتِ خاطر نصیب
حال میرا گو کہ ظاہر میں پریشاں ہو گیا

باعثِ تسکیں نہ تھا باغِ جہاں کا کوئی رنگ
جس روش پر میں چلا آخر پریشاں ہو گیا

صورتِ ظاہر میں دل اک قطرۂ خوں تھا فقط
آ گیا جب جوش میں معنی کا طوفاں ہو گیا

کر دیا اہلِ بصیرت فیضِ ساقی نے مجھے
ساغرِ مے آفتابِ اوجِ عرفاں ہو گیا

کی ترقی چشمِ بد دور ایسی اپنے رنگ میں
اکبر اب مسند نشینِ بزمِ رنداں ہو گیا

(۴)

بہار آئی ہے اک آئینۂ معنی نشاں ہو کر
چمن میں بوئے گل پھیلی ہے تیری داستاں ہو کر

ہوئے خسروِ اقلیمِ دل شیریں زباں ہو کر
جہانگیری کری گی یہ ادا نورِ جہاں ہو کر

زمیں کی طرح جس نے عاجزی و خاکساری کی
خدا کی رحمتوں نے اس کو ڈھانکا آسماں ہو کر

مجالِ گفتگو کس کو فنا کا جب پیام آیا
ہوئی خاموش آخر شمع بھی آتش زباں ہو کر

جو راہِ معرفت میں کاروانِ دل قدم رکھے
تو ساری کائنات اڑ جائے گردِ کارواں ہو کر

نگینِ بے بہا تھا دل ضرورت تھی حفاظت کی
ترا نقشِ تصور اس میں بیٹھا پاسباں ہو کر

اسی سے آشکارا ہے بلندی تیرے ایواں کی
پڑا ہے آسماں بھی تیرے در پر آستاں ہو کر

کیا اچھا جنھوں نے دار پر منصور کو کھینچا
کہ خود منصور کو مشکل تھا جینا رازداں ہو کر

ضعیفی زور پر آئی ہوئے بے دست و پا اکبر
کیا بچوں سے بد تر ہم کو پیری نے جواں ہو کر

(۵)

سانس لیتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں — یہ نہ سمجھیں کہ آہ کرتا ہوں
بحرِ ہستی میں ہوں مثالِ حباب — مٹ ہی جاتا ہوں جب ابھرتا ہوں
اتنی آزادی بھی غنیمت ہے — سانس لیتا ہوں بات کرتا ہوں
یہ بڑا عیب مجھ میں ہے اکبر — دلمیں جو آئے کہہ گزرتا ہوں

(۶)

عیادت کو آئے شفا ہو گئی — علالت ہماری دوا ہو گئی
مری روح تن سے جدا ہو گئی — کسی نے نہ جانا کہ کیا ہو گئی
طبیعت کی گرمی بھی کیا چیز ہے — طبیعت مری کیا سے کیا ہو گئی
انھیں نے عطا کی تھی جانِ حزیں — ہوا خوب انھیں پر فدا ہو گئی
کتابِ حقیقت کرے کون ختم — کہ ہر اک خبر مبتدا ہو گئی
پھنسی جسمِ خاکی میں روحِ لطیف — اسیرِ کمند ہوا ہو گئی
دوا کیا کہ وقت دعا بھی نہیں — تری حالت اکبر یہ کیا ہو گئی

(۷)

سیرِ غربت کوئی جلسہ جو دکھا دیتی ہی — یادِ احبابِ وطن مجھ کو رلا دیتی ہی
بیخودی پردۂ کثرت جو اٹھا دیتی ہی — ہر طرف جلوۂ توحید دکھا دیتی ہی
پوچھتا ہوں میں جو عبرت سی مآلِ ہستی — راستہ گورِ غریباں کا بتا دیتی ہی
نظر آتا جو نہیں نزع میں بالیں پہ کوئی — بیکسی ان کے تغافل کو دعا دیتی ہی
موت سے کوئی نہ گھبرائے اگر یہ سمجھے — کہ یہ دنیا کے بکھیڑوں سی چھڑا دیتی ہی

بدسلوکی تری لاتی ہے خرابی مجھ پر | مری تنقید یہ کو الزام لگا دیتی ہے
فکرِ اکبر عمل مضمون کا دکھا کر جلوہ | محفلِ شعر میں رنگ اپنا جما دیتی ہے

(۸)

فلک جو روز نیا داغ اک کھلاتا ہے | ہمارے حوصلۂ دل کو آزماتا ہے
وہ بات ہوں کہ جو لاتی ہے جوش میں دل کو | وہ حال ہوں کہ جسے سُن کے وجد آتا ہے
وہ دو ہی ہاتھ ہیں سمجھے کہ آرزو نکلی | دہانِ زخم اسی پر تو مسکراتا ہے
خدا پناہ میں رکھے کشاکشِ غم سے | اسی سے تارِ نفس جلد ٹوٹ جاتا ہے
فنا کا خوف کچھ اہلِ حیات ہی کو نہیں | ہوا سے شمع کا شعلہ بھی کانپ جاتا ہے
مقامِ شکر ہے غافل مصیبتِ دنیا | اسی بہانے سے اللہ یاد آتا ہے
خدا کے واسطے یادِ خدا کرلے اکبر | بتوں کی عشق میں جان اپنی کیوں گنواتا ہے

(۹)

عقل ہے ایماں نہ دل ہے جان ہے | لیجئے سب آپ پر قربان ہے
خوبیٔ مذہب دمِ آخر کھلی | نزع میں مونس فقط ایمان ہے
بل کے یاروں سے ہوا شوقِ گناہ | آدمی کا آدمی شیطان ہے
کیا مجھے کرتے ہو زندوں میں شمار | سانس لیتا ہوں بس اتنی جان ہے
دل جسے سمجھا ہے سامانِ وقار | غور سے دیکھو تو اک طوفان ہے

(۱۰)

ملک میں مجھکو ذلیل و خوار رہنے دیجئے | آپ اپنی عزتِ دربار رہنے دیجئے
چشم بد دور آپکی نظریں ہیں خود موجِ شراب | بس مجھے بے مے پیئے سرشار رہنے دیجئے
کیجئے اپنی نگاہِ فتنہ افزا کا علاج | نرگسِ بیمار کو بیمار رہنے دیجئے

کس بلاغت سے کہا اُس نے کہ کھینچے حالِ شوق
مدعا کو قابلِ اظہار رہنے دیجئے

کیجئے ثابت خوش اخلاقی سے اپنی خوبیاں
بے نمودِ جبہ و دستار رہنے دیجئے

کھل گیا مجھ پر بہت ہیں آپ میرے خیر خواہ
خیر چندہ لیجئے طومار رہنے دیجئے

مل کے باہم کیجئے اغیار سے بحث و جدال
بے نتیجہ باہمی تکرار رہنے دیجئے

ہم کنار اس بحرِ خوبی سے نہ ہونگے اکبر آپ
ایسے نصیبے سمندر پار رہنے دیجئے

(۱۱۱)

گل کو خنداں بلبلوں کو نوحہ گر دیکھا کئے
باغِ عالم کی دو رنگی عمر بھر دیکھا کئے

دیکھئے اب کیا دکھائے قسمت بعد مرگ
رنج و اندوہ و الم تو عمر بھر دیکھا کئے

خوابِ غفلت سے نہ چونکے اہلِ عالم ہے غضب
گو بہت نیرنگیٔ شام و سحر دیکھا کئے

حسرت و حرمان و اندوہ و غم و رنج و الم
جو دکھایا آسماں نے عمر بھر دیکھا کئے



پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی

جلوۂ صبح

جب رنگِ شب آئینۂ ہستی سے ہوا دور
ہنگامِ سحر کون و مکاں ہوگئے پُرنور
تبدیل ہوئی صورتِ کوہِ شبِ دیجور
چمکا وہ تجلیٔ سحر سے صفتِ طور
بجلی کی طرح چرخ پہ نورِ سحر آیا
آنکھوں کو نہ پھر خرمنِ انجم نظر آیا

تھی نور میں تفریح تو نور ارض و سما میں
سرگرمی بشر میں تھی لبِ شریادِ خدا میں
تھی تازگی خنکی میں تو خنکی تھی ہوا میں
شادابی تھی نکہت میں تو نکہت تھی ضیا میں
خورشیدِ منور کا دم جلوہ گری تھا
نورِ رُخِ مہتاب چراغِ سحری تھا

دریائے فلک میں تھا عجب نور کا عالم
چکّر میں تھا گرداب صفتِ نیّرِ اعظم
اُٹھتی تھیں شعاعوں کی جو موجیں وہ شرر دم
سیارے حبابوں کی طرح مٹتے تھے پیہم
تھی شورشِ طوفانِ سحر غرب سے تا شرق
آخر کو سفینہ مہِ گردوں کا ہوا غرق

والشمس تھا کندہ شہِ خاور کی نگیں پر
واللیل کا باقی تھا نشاں بھی نہ کہیں پر
تھی مہر کی پھیلی جو ضیا چرخِ بریں پر
آنے لگا رہ رہ کے وہی نور زمیں پر
ذروں کا ستارہ بھی چمکتا نظر آیا
پیمانۂ خورشید چھلکتا نظر آیا

وہ صبح کا عالم وہ چمن زار کا عالم مُرغانِ ہوا نغمہ زنی کرتے تھے باہم
ہنگامِ سحر بادِ سحر چلتی تھی پیہم آرام میں سبزہ تھا تہِ چادرِ شبنم
ہر سمت بندھی نعرۂ بلبل کی ہوا تھی
غنچوں کی نسیمِ سحری عقدہ کشا تھی

جو نخل تھا گلشن میں برومند کھڑا تھا دامانِ سحر میں گُلِ خورشید پڑا تھا
کیا خوب مقدر چمنستان کا لڑا تھا ہر گل پہ گہر قطرۂ شبنم کا جڑا تھا
بلبل کہیں طاؤس کہیں گھوم رہے تھے
مستوں کی طرح نخل چمن جھوم رہے تھے

مرغانِ چمن عالمِ مستی میں سحر دم وصفِ چمن آرائے جہاں کرتے تھے باہم
شاخیں تھیں کہیں گردنِ تسلیم صفت خم تسبیحِ خُدا میں ہمہ تن محو تھی شبنم
غنچوں کو بھی تھی وردِ زباں حمد خدا کی
آتی تھی چٹکنے میں صدا صلِ علیٰ کی

تھا پیشِ نظر وادیِ ایمن کا تماشا ہر شاخِ شجر میں شجرِ طور کا نقشا
تھا آتشِ گل میں اثرِ برقِ تجلّی مدہوش تھے مُرغانِ ہوا صورتِ موسیٰ
شکلِ یدِ بیضا تھی ہر اک شاخ نظر میں
اعجاز کا گل تھا کفِ گلچین سحر میں

رونق پہ دمِ صبح تھا خمخانۂ عالم تھم تھم کے ہوا چلتی تھی سردی بھی تھی کم کم
پیمانۂ مہتاب تھا لبریز سحر دم تھا جامِ صبوحی کا لئے نیّرِ اعظم
گردوں پہ شفق کی بھی عجب جلوہ گری تھی
مینائے فلک میں مئے گلرنگ بھری تھی

بہارستان کشمیر کی یاد

ہاں نورِ ازل جلوۂ گفتار دکھا دے — ہاں شمعِ زباں مطلعِ انوار دکھا دے
ہاں طبعِ رواں قلزمِ ذخار دکھا دے — ہاں رنگِ سخن گلشنِ بے خار دکھا دے
گلزارِ معانی کا مہکتا نظر آئے
طوطی چمنستاں میں چہکتا نظر آئے

ہو حسنِ بیاں میں چمنستاں کا تجمّل — ہر نکتۂ رنگیں نظر آئے صفتِ گل
ہر معنیٔ پیچیدہ بنے طرۂ سنبل — عاشق ہوں سخن پر جو سنیں صورتِ بلبل
جو شعر ہو طوبیٰ کا وہ ثانی نظر آئے
کوثر کی طبیعت میں روانی نظر آئے

ہاں طبعِ رسا خاطرِ احباب ہے منظور — بس شرم کا برقعِ رخِ معنی سے ہٹا دے
دکھلا دے سرِ بزم تجلّیٔ سرِ طور — غش صورتِ موسیٰ ہوں جو حسن پائیں مذکور
منکر جو ہیں فرعون صفت اعجازِ سخن کے
ہوں آج وہ قائل مرے اندازِ سخن کے

ہاں طعنہ و تشنیع کی پروا نہیں مجھ کو — تحسین و ستائش کی تمنا نہیں مجھ کو
نیرنگیٔ افلاک کا شکوہ نہیں مجھ کو — کچھ فکر ہو شہرت کی یہ سودا نہیں مجھ کو
ڈوبا ہوا ہوں مثلِ سخن رنگِ سخن میں
گل ہو کے میں رہتا ہوں لطافت کے چمن میں

اس وقت کا اب ہوش بھی پورا نہیں رہتا — سرمست مجھے رکھتی ہے جب سے مئے اشعار

لیکن نہ رہا مجھ کو تعلق سے سروکار | ہے میری خموشی پہ فدا عالمِ گفتار
اس مے نے کچھ ایسا مجھے مدہوش کیا ہے
خود اپنے تئیں میں نے فراموش کیا ہے

عالم سے جدا ہے مری تقریر کا عالم | ہر بینیوں پہ حیرت سے ہے تصویر کا عالم
رنگیں سخنی سے ہے یہ تحریر کا عالم | ہر صفحے پہ ہے گلشن کشمیر کا عالم
کیفیت گلزار سمائی ہے نظر میں
اس خطۂ دلکش کا ہے سودا مرے سر میں

پانی میں ہے چشموں کے اثر آبِ بقا کا | ہر نخل پہ عالم خضر سبز قبا کا
جو پھول ہے گلشن میں وہ ہے نور خدا کا | سائے میں شجر کے ہے اثر ظلِ ہما کا
مبداء کرمِ عام کی ہر جوئے رواں ہے
سرچشمۂ فیضِ چمن آرائے جہاں ہے

وہ موج ہوا کا حرکت ابر کو دینا | چشموں سے پہاڑوں کے وہ اڑتا ہوا چھینا
گاتے ہوئے ملاحوں کا وہ کشتیاں کھینا | ڈل کا وہ سرِ شام ادھر کروٹیں لینا
وہ عکس چراغوں کا جھلکتا نظر آنا
پانی کا ستارہ بھی چمکتا نظر آنا

ہر لالہ کہسار ہے شکلِ گلِ راحت | داغ اس کے ہیں خالِ رُخِ حورائے مسرت
کیا سبزہ خوش رنگ ہے سرمایۂ عشرت | دل کے لئے ٹھنڈک ہے جگر کے لئے فرحت
ایسا نہیں قدرت نے کیا فرش کہیں پر
اس رنگ کا سبزہ ہی نہیں شے زمیں پر

وہ صبح کو کہسار کے پھولوں کا مہکنا
وہ جھاڑیوں کی آڑ میں چڑیوں کا چہکنا
گردوں پہ شفق کو وہ یہ لالے کا لہکنا
مستوں کی طرح ابر کے ٹکڑوں کا بہکنا

ہر پھول کی جنبش سے عیاں ناز پری کا
چلنا وہ دبے پاؤں نسیم سحری کا

وہ طائر کہسار لب چشمہ کہسار
وہ سرد ہوا وہ کرم ابر گہربار
وہ میوۂ خوش رنگ وہ سرسبز چمن زار
اک آن میں صحت ہو جو برسوں کا ہو بیمار

یہ باغ وطن رشک گلزار جناں ہے
سرمایۂ ناز چمن آرائے جہاں ہے

ہے خطۂ سرسبز میں اک نور کا عالم
ہر شاخ و شجر پر شجر طور کا عالم
پہروین پہ ہے خوشۂ انگور کا عالم
ہر خار پہ بھی ہے مژۂ حور کا عالم

نکلے نہ صدا ایسی مغنی کے گلو سے
آتی ہے جو آواز ترنم لب جو سے

میووں سے گرانبار وہ اشجار کے ڈالے
بکھرے ہوئے وہ دامن کہسار پہ لالے
اڑتے ہوئے بالائے ہوا برف کے چھالے
دیکھے جو کوئی دور سے ہیں روئی کے گالے

وہ ابر کے لکوں کا تماشہ شجروں میں
جھرنوں کی صدائیں وہ پہاڑوں کے دروں میں

چھوٹے ہوئے اس باغ کو گذرا ہے زمانا
تازہ ہے مگر اس کی محبت کا فسانا
عالم نے شرف جن کی بزرگی کا ہے مانا
اٹھے تھے اسی خاک سے وہ عالم و دانا
ان جن کا ہے پیوند اب اس پاک زمیں کا
رگ رگ میں ہماری ہے رواں خون انھیں کا

ہاں میں بھی ہوں بلبل اسی شاداب چمن کا | ہے چشمۂ فردوس یہ عالم ہے دہن کا
کس طرح نہ سرسبز ہو گلزار سخن کا | ہے رنگ طبیعت میں چمن زار وطن کا

تازے ہیں مضامین بھی طبیعت بھی ہری ہے
ہاں گلشن قومی کی ہوا سر میں بھری ہے

سیر دیرہ دون

یہیں بہار کا پہلے پہل ہوا تھا شگون | عجیب خطۂ دلکش ہے شہر دیرہ دون
نگاہِ شوق نے کیا کہیے کیا سماں دیکھا | نئی زمین نیا رنگ آسماں دیکھا
سنا جو کرتے تھے وہ باغ جاں فزا ہے یہی | اگر پہاڑ میں جنت تو راستہ ہے یہی
ازل میں بھی جو فضا اس کا یادگار ہے یہ | نشیب کوہ میں گہوارۂ بہار ہے یہ
کیا نہیں اسے غارت بشر کی صنعت نے | یہ سبزہ زار سجایا ہے دستِ قدرت نے
سپرد ابر کے ہے انتظام پانی کا | ہوائے سرد کو ہے حکم باغبانی کا
تمام شہر ہے گرد و غبار سے خالی | جدھر نگاہ اٹھی اس طرف ہے ہریالی
لباس پہنے ہیں کل خشت و سنگ سبزہ کا | بجائے خاک کے اڑتا ہے رنگ سبزہ کا
اثر خزاں کا ہو کیا تازگی کے مسکن میں | پہاڑ اس کو چھپائے ہیں اپنے دامن میں
گھنے درخت ہری جھاڑیاں زمیں شاداب | لطیف و سرد ہوا پاک و صاف چشمۂ آب
کمی کبھی نہیں شادابیوں کے ساماں میں | ٹھہر گئی ہے بہار آ کے اس گلستاں میں
طلسم حسن کا ہے بیچ میں یہ گلدستہ | کھڑے ہیں کوہ و شجر پہلوؤں پہ صف بستہ
یہاں جو آ کے مسافر مقام کرتے ہیں | یہ سنتری اٹھیں پہلے سلام کرتے ہیں

جو دُور جا کے بستی سے اور ہی ہے سماں — یہ سوچتا ہے پہاڑوں کو دیکھ کر انساں
بشر پہ رعب یہ قدرت کا چھا گیا کیسا — یہ بل زمین کی تیوری میں آ گیا کیسا
بلندیوں سے جو ہو مائل نشیب نظر — فریب دیتا ہے ندی کا پیچ و خم اکثر
نگہ کو دُور سے پانی جو ہے نظر آتا — سپید ناگ چلا جا رہا ہے بل کھاتا
قریب ہوتا ہے آخر یہ دور کا عالم — نگاہ دیکھتی ہے پھر سرور کا عالم
فضائے کوہ میں ایسی ہوا سمائی ہے — بشر کی روح کو راحت کی نیند آتی ہے
بس ایک عالمِ ہو چار سمت طاری ہے — نہ شور و شر ہے نہ دُنیا کی آہ و زاری ہے
اثر دکھاتا ہے قدرت کا نغمۂ دلگیر — شجر شجر سے ٹپکتی ہے راگ کی تاثیر
یہ راگ وہ ہے جو مضراب کا اسیر نہیں — یہ صرف کان کے پردوں میں گوشہ گیر نہیں
وہی سُنے گا اُسے دل گداز ہے جس کا — ہے دل میں سوز تو رگ رگ میں ساز ہے اُس کا
یہ راگ مجھ میں سمایا سرور سے ہو کر — ہوس تھی رُوح کو مل جائے اس میں سے ہو کر
حریمِ خاص میں قدرت کی باریابی تھی — نگاہِ شوق میں اک شان بے حجابی تھی
نشست سنگ نہ تھی سایۂ شجر کے تلے — رواں تھا چشمۂ آبِ خنک نظر کے تلے
شریکِ حال تھی وضعِ قدیم قدرت کی — عیاں تھی سنگ و شجر سے کشش محبت کی
شرابِ اُنس حقیقی سے تھا ہر اک سرشار — شجر تھا کوہ تھا چشمہ تھا یا دشت غبار
درخت و کوہ ہیں کیا ذات پاکِ انساں کیا — طیور کیا ہیں ہوا کیا ہے ابر باراں کیا
یہ موجِ ہستیٔ بیدار کے عناصر ہیں — سب ایک قافلۂ شوق کے مسافر ہیں
یہ دل کے ٹکڑے ہیں قدرت کے انہیں نیرنگ — سب ایک گود کے پالے ہیں کوئی غیر نہیں
اُنھیں سے نغمۂ قدرت ہے اوج ہستی میں — سب ایک ساز کے پردے ہیں بزمِ ہستی میں

جدا کسی سے بھی ہستی کا اُسکے راز نہیں
کچھ آبشار میں اور ہم میں امتیاز نہیں

ہے جسم خاک یہاں اس کا جسم پانی ہے
جو روح ہم میں ہے اُسمیں وہی روانی ہے

اسی خیال میں طبع لطیف تھی سرشار
کچھ ایسی بے خبری تھی کہ ہوش تھا اس پہ نثار

دل اپنے رنگ میں بے تاب تھا اس ارمان سے
کہ اس فضا میں ہو آزاد روح زندان سے

اجل جو آئے تو اس کوہسار کے نیچے
بنے مزار کسی آبشار کے نیچے

غرض کہ روح کی آنکھوں سے یہاں دیکھا
ازل کے دن جو چھٹا تھا وہ آشیاں دیکھا

نیا سرور میسر ہوا سفر کر کے
مگر نہ سیر چمن کر سکے نظر بھر کے

مذہب

سودائے محبت میں اُنھیں کے نہیں خامی
خودبینی سے خالی نہیں مذہب کے بھی حامی

عرفاں کی خبر لاتی ہو گو طبع گرامی
ہے نفس کی منظور حقیقت میں غلامی

کچھ قوم کی پروا ہے نہ فکر کہ دمہ ہے
ہو جائے نجات اپنی تمنا ہے تو یہ ہے

عالم کے دکھانے کے لئے خاک نشیں ہیں
دعویٰ ہے کہ ہم مالک فردوس بریں ہیں

دنیا کی ترقی پہ سدا چیں بہ جبیں ہیں
گویا کہ یہی رازِ الٰہی کے امیں ہیں

جو اور ہیں وہ معرفت حق سے جدا ہیں
بس ایک یہی بندۂ مقبول خدا ہیں

انساں کی محبت کو سمجھتے ہیں یہ آزار
ہمدردیٔ قومی سے اُنھیں آئے نہ کیوں عار

رہتے ہیں سدا فکر میں عقبےٰ کی گرفتار
دنیا کے فرائض سے نہیں ان کو سروکار

یوں جادۂ تسلیم و رضا مِل نہیں سکتا
اُن میں وہ خودی ہے کہ خدا مِل نہیں سکتا

قوم[1] کے سورماؤں کی الوداع

ساحلِ ہند سے جرّار وطن جاتے ہیں
کچھ نئی شان سے جانبازِ زَمَن جاتے ہیں
رن میں باندھے ہوئے شمشیر و کفن جاتے ہیں
تیغ زن برق فگن قلعہ شکن جاتے ہیں

سامنے اِن کے ظفر برہنہ پا چلتی ہے
ان کی تلوار کے سایہ میں قضا چلتی ہے

انکی رگ رگ میں ہیں پیوستہ شجاعت کے چلن
رن کا میدان ہے اُن کیلئے ماں کا دامن
عرصۂ جنگ کی موت اُن کو ہے اِک شب کی دُلہن
مر کے تلوار سے حاصل ہو تو خلعت ہے کفن

جوش ان میں جو ہے اس جوش کا اب دور نہیں
ساٹھ پشتوں کے سپاہی ہیں کوئی اور نہیں

ہاں دلیرانِ وطن دھاک بٹھا کر آنا
طنطنہ جرمنِ خود بیں کا مٹا کر آنا
قیصری تخت[2] کی بنیاد ہلا کر آنا
ندیاں خون کی برلن میں بہا کر آنا

یہی گنگا ہو سپاہی کے نہانے کے لئے
ناؤ تلوار کی ہے پار لگانے کے لئے

---

[1] یہ نظم اس زمانے میں تصنیف کی گئی تھی جبکہ ہندوستانی سپاہیوں کی فوج دولت برطانیہ کی جانب سے یورپ کی جنگ عظیم میں حصہ لینے کے لئے روانہ کی گئی تھی ۱۲

[2] جرمن کا دار السلطنت ۱۲

جاں نثار آج تمھارا سا زمانہ میں نہیں — ہاں دکھا دو کہ ہو تاج شہ لندن کے نگیں
دوست کیا چیز ہیں دشمن ہو فقط تو تحسیں — آسماں حمد کرے بول اٹھے رن کی زمیں
یوں تو لڑنے کو بہت شہ کے نمک خوار رہے
اور ہی شان سے لیکن یہ وفادار رہے

جس گھڑی معرکہ جنگ میں ہو تیغ علم — سورما لڑتے ہیں اس طرح پکارے عالم
دل ہو ارجن[53] کا جگر بھیم[54] کا انگد[55] کا قدم — موت کے وقت نظر میں ہو شبیہ بھیشم[56]
جس کا قابو نہ ہو تھا موت کی تدبیروں پر
سایۂ تیغ میں آرام کیا تیروں پر

ہو وہ یورش کہ ہو شیرازۂ اعدا برہم — اک امنڈتے ہوئے دریا کا ہو پیدا عالم
جو کسی سے نہ جھکا وہ سر مغرور ہو خم — پہلے ہر رن میں جو پہونچے وہ تمھارا ہو قدم
واگرو[57] کے بڑھو خون کے مخبر کھل جائیں
پھر ہری سنگھ[58] کی تلوار کے جوہر کھل جائیں

تم کو اعزاز ملا ہے یہ وطن کا اعزاز — دیکھنا اب ہے شجاعت کا تمھاری انداز

---

۵۳ ارجن پانڈوؤں میں ایک مشہور بہادر تیر انداز تھے ۵۴ بھیم ارجن کے بھائی اور بہادری میں مشہور رہے ہیں ۵۵ انگد رام چندر جی کے ایلچی بنکر راون کے دربار میں گئے تھے وہاں قوت کی آزمائش پر ان کا پاؤں کوئی ہٹا نہ سکا ۵۶ بھیشم پتامہ جنگ مہابھارت میں کوروؤں کے سپہ سالار تھے دوران جنگ میں ان کو تیر لگا تھا - یہ اپنی ثابت قدمی اور اطمینان کے لئے مشہور رہے ہیں -

۵۷ سکھوں کا نعرہ ۵۸ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا سپہ سالار ۱۲

خاکِ یورپ پہ دلیری سے ہوا اپنی ممتاز — تیغِ ہندی کی اصالت پہ زمانہ کو ہو ناز

قوم کا اوج بڑھے نام وطن زندہ ہو
روح پرتاب[1] کی جنت میں نہ شرمندہ ہو

یا ظفر یاب اٹھیں دیکھ کے دل ہو بشاش — آئے یا سوئے وطن خون میں ڈوبی ہوئی لاش
سر جدا تن سے ہو یا ہو تنِ بسمل صد پاش — گوشۂ امن و اماں کی نہ ہو ہم کو تلاش

موت معراج ہے اس دشت کے راہی کیلئے
آنچ تلوار کی جنت ہے سپاہی کے لئے

گو کہ دنیا سے مٹے شوکتِ قیصر کا سراغ — شعلۂ تیغ سے مرجھائے نہ تہذیب کا باغ
گل نہ ہو دل کے شوالے میں حمیت کا چراغ — بیگناہوں کے لہو کا نہ ہو تلوار میں داغ

راستہ ہے یہی قوموں کی تباہی کے لئے
خونِ معصوم کا دوزخ ہے سپاہی کے لئے

مادرِ قوم کا ہے اپنے سپوتوں سے پیام — خطۂ ہند کا اس جنگ میں روشن ہے نام
تیغِ خونریز نے جس شان سے چھوڑا ہے نیام — اپنے مسکن میں اسی شان سے پائے آرام

شاعرِ گوشہ نشیں شکرِ خدا کرتا ہے
جنگ ہو تم کو مبارک یہ دعا کرتا ہے

---

[1] مہارانا پرتاب سنگھ ۱۲

خاکِ ہند

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیض قدرت تیرے لیے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حسنِ ازل عیاں ہے
اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عز و شاں ہے
ہر صبح ہے یہ خدمت خورشیدِ پرضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی

اس خاکِ دلنشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری
چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری
چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری
شمعِ ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیٔ کہن میں

گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو
سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جامِ الفت بخشا اس انجمن کو
سینچا لہو سے اپنے رانا[۵] نے اس چمن کو
سب سوربیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا ان کی ہڈیاں ہیں

دیوار و در سے اب تک ان کا اثر عیاں ہے
اپنی رگوں میں اب تک ان کا لہو رواں ہے
اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے
فردوسِ گوش اب تک کیفیتِ اذاں ہے
کشمیر سے عیاں ہے جنت کا رنگ اب تک
شوکت سے بہہ رہا ہے دریائے گنگ اب تک

---

۵ رانا پرتاپ فرماں روائے اودے پور

اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں   کرتے ہیں رقص اب تک طاؤس جنگلوں میں
اب تک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں   پستی سی آ گئی ہے پر دل کے حوصلوں میں

گل شمع انجمن ہے گو انجمن وہی ہے
حب وطن نہیں ہے خاک وطن وہی ہے

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا   دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خواب گراں ہمارا   اک لاش بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا

علم و کمال و ایماں برباد ہو رہے ہیں
عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

اے صور حب قومی اس خواب سے جگا دے   بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے   اٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے

حب وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مبارک   رنگیں طبیعتوں کو رنگ سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک   ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک

غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

ہے جوئے شیر ہم کو نور سحر وطن کا   آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا
ہے رشک مہر ذرہ اس منزل کہن کا   تلتا ہے برگ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا
گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو   مر کر بھی چاہتے ہیں خاک وطن کفن کو

قومی ترانہ

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا
اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اتر جانا

عزیزانِ وطن کو غنچہ و برگ و ثمر جانا
خدا کو باغباں اور قوم کو ہم نے شجر جانا

کرشمہ یہ بھی ہے اے بیخبر افلاس قومی کا
تلاشِ رزق میں اہلِ ہنر کا در بدر جانا

اجل کی نیند میں بھی خوابِ ہستی گر نظر آیا
تو پھر بیکار ہی تنگ آ کے اس دنیا سے مر جانا

چمن زارِ محبت میں اسی نے باغبانی کی
کہ جس نے اپنی محنت ہی کو محنت کا ثمر جانا

سدھارے منزلِ ہستی سے کس بے اعتنائی سے
تنِ خاکی کو شاید روح نے گردِ سفر جانا

غزلیات

(۱)

اگر دردِ محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا
نہ مرنے کا ستم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا

رلایا اہلِ محفل کو نگاہِ یاس نے میری
قیامت تھی جو اک قطرہ ان آنکھوں سے جدا ہوتا

خدا کو بھول کر انساں کے دل کا یہ عالم ہے
یہ آئینہ اگر صورت نما ہوتا تو کیا ہوتا

اگر دم بھر بھی مٹ جاتی خلش خارِ تمنا کی
دلِ حسرت طلب کو اپنی ہستی سے گلا ہوتا

ہوس جینے کی ہے یوں عمر کے بیکار کٹنے پر
جو ہم سے زندگی کا حق ادا ہوتا تو کیا ہوتا

زباں کے زور پہ ہنگامہ آرائی سے کیا حاصل
وطن میں ایک دل ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا

(۲)

نہ کوئی دوست دشمن ہو شریکِ دردِ غم میرا
سلامت میری گردن پر رہے بارِ الم میرا

بہار آئی ترقی پر ہی سودا دم بہ دم میرا
بڑھا جاتا ہے خود زنجیر کی جانب قدم میرا

لکھا یہ داورِ محشر نے میری فردِ عصیاں پر
یہ وہ بندہ ہی جس پہ ناز کرتا ہے کرم میرا

کشاکش ہی اُمید و یاس کی یہ زندگی کیا ہی
الٰہی ایسی ہستی سے تو اچھا تھا عدم میرا

اگر کون و مکاں کی شعبدہ تھا اسکی قدرت کا
تو اِس دنیا میں آخر کس لئے آیا قدم میرا

نکلتی تھیں راستہ روکے ہوئے لاکھوں تمنائیں
شہیدِ یاس ہوں نکلا ہی کس مشکل سے دم میرا

رہی ہی ایک ترکِ آرزو کی آرزو باقی
اِسی پر ختم ہے افسانۂ درد و الم میرا

ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

ترانہ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اُس کی وہ گلستاں ہمارا

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہی دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

گودی میں کھیلتی ہیں اُسکی ہزاروں ندیاں
گلشن ہی جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجکو
اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہی ہندوستاں ہمارا

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہی باقی نام و نشاں ہمارا

کچھ بات ہی کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہی دشمن دورِ زماں ہمارا

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

ستارا

قمر کا خوف کہ ہے خطرۂ سحر تجھکو — مآلِ حسن کی کیا مل گئی خبر تجھکو؟
متاعِ نور کے لٹ جانیکا ہے ڈر تجھکو — ہے کیا ہراسِ فنا صورتِ شرر تجھکو؟
زمیں سے دور دیا آسماں نے گھر تجھکو — مثالِ ماہ اُڑھائی قبائے زر تجھکو؟

غضب ہے پھر تری ننھی سی جان ڈرتی ہے
تمام رات تری کانپتے گذرتی ہے

چمکنے والے مسافر! عجب یہ بستی ہے — جو اوج ایک کا ہے دوسرے کی پستی ہے
اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر — فنا کی نیند مے زندگی کی مستی ہے
وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل — عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

(وارِ نگار دہلی)

پیغامِ اقبال

ہمنشیں افسانۂ بیداریٔ جمہور چھیڑ — قصۂ خواب آورِ اسکندر و جم کب تلک
توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام — دُوریٔ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک
آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا — آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک
باغباں چارہ فرا سے یہ کہتی ہے بہار — زخمِ گل کیواسطے تدبیرِ مرہم کب تلک
ہمتِ عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول — غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

(۱۹۰۲ء ور سرگلستان لاہوری)

جلیل القدر جناب حافظ جلیل حسن جلیل مانک پوری

حمد

(۱)

ہے لاکھ لاکھ شکر خدائے جلیل کا
جس نے دُرِ سخن سے بھرا سینہ جلیل کا

اللہ تک پہونچ کا ذریعہ یقین ہے
حجت کو دخل ہے نہ گذر ہے دلیل کا

خود فرشِ خاک پر ہے نظر عرشِ پاک پر
اللہ رے حوصلہ ترے عبدِ ذلیل کا

کس کی مجال ہے ترے اوصاف لکھ سکے
یاں ہے قلم شکستہ پرِ جبرئیل کا

یارب قبولِ عام ملے اس کلام کو
دل کی جگہ بغل میں ہو دیوان جلیل کا

غزلیات

(۱)

پردہ نہ تھا وہ صرف نظر کا قصور تھا
دیکھا تو ذرے ذرے میں اُن کا ظہور تھا

پردہ اُٹھانے کو جو کہا تھی مری خطا
آنکھوں میں پھر رہے تھے یہ کس کا قصور تھا

آئینہ اُن کے سامنے رکھ لوں تو یہ کہوں
انصاف سے کہو کہ مرا کیا قصور تھا

روزِ ازل پیا تھا جو جامِ مئے الست
آنکھوں میں مرتے مرتے اُسی کا سرور تھا

اس کے کرم نے بھر دئے جنت میں بے حساب
سو تھے قصور وار تو اک بے قصور تھا

رحمت نے کی وہ آؤ بھگت حشر میں جلیل
مجکو ہوا گمان کہ میں بے قصور تھا

(۲)

ترا کہا جو دلِ ناصبور میں نے کیا
بڑی خطا ہوئی مجھ سے قصور میں نے کیا

نجات کے لئے نقرہ یہ سوچ رکھا ہے
غفور جان کے تجھ کو قصور میں نے کیا

سزائیں دو مجھے لعنت کی یا معاف کرو
قصور وار ہوں بیشک قصور میں نے کیا

وہ قتل عام کو نکلے ہیں کیا تماشا ہے
ہر ایک سوچ میں ہے کیا قصور میں نے کیا

جلیل جب سے مجھے خو پڑی صبوحی کی
وظیفہ سحری یا غفور میں نے کیا

(۳)

میں وہ مظلوم ہوں نئے ستائے ہے آسماں مجکو
وہیں گردن جھکا لی خوف سے دیکھا جہاں مجکو

یہ ممکن ہے ملے دولت یہ ممکن ہے ملے راحت
بتا تو اے جوانی پھر ملے گی تو کہاں مجکو

کدھر ڈھونڈوں میں راہ عافیت بچکر کدھر جاؤں
بلا میں چار سو گھیرے کھڑا ہے آسماں مجکو

چلا جاتا نہیں لیکن بھلا ہو جوشش گریہ کا
لئے جاتا ہے اپنے ساتھ ساتھ اشک رواں مجکو

برنگ بوئے گل تقدیر میں برباد ہونا تھا
نکلکر آشیاں سے پھر نہ سوجھا آشیاں مجکو

چمن میں رہ کے ساری عمر مشق گلفشانی کی
قفس میں آتے آتے آگئی طرز فغاں مجکو

جلیل آزاد ہوں میں بوئے گل کی طرح گلشن میں
نہ ہے صیاد کی پروا نہ خوف باغباں مجکو

(۴)

چاہیئے دنیا نہ عقبےٰ چاہیئے
جو تجھے چاہے اسے کیا چاہیئے

زندگی کیا جو بسر ہو چین سے
دل میں تھوڑی سی تمنا چاہیئے

مجکو اے وسعت وہ فرش زمیں
بیٹھ رہنے کو ٹھکانا چاہیئے

رات بھر میں شمع محفل جل بجھی
چاہیئے اس کو تو ایسا چاہیئے

وہ بہت دیرآشنا ہے اے جلیل
آشنائی کو زمانا چاہیئے

(۵)

مرنے والے خوب چھوٹے گردشِ ایّام سے
سو رہے ہیں پاؤں پھیلائے ہوئے آرام سے

ہم مسافر تھے اگر قاتل کی مرضی دیکھتے
تیغ کے سایہ میں دم بھر بیٹھتے آرام سے

آفتیں ساری جبھی تک تھیں کہ تھی تم سے امید
اب ہماری بھی گزرتی ہے بڑے آرام سے

بے نشاں تجکو سمجھ کر صبر آجاتا مجھے
پر یہ مشکل ہے کہ میں واقف ہوں تیرے نام سے

کیا خدا کی شان ہے جن کا وظیفہ تھا جلیلؔ
آج وہ کہتے ہیں ہم واقف نہیں اس نام سے

(۶)

قابلِ دربارِ غم ہم ہو چکے
رو چکے منہ آنسوؤں سے دھو چکے

صبحِ محشر چار سو ہے یہ پکار
رات گزری سونے والے سو چکے

اب ہے آنکھ گردشِ چشم اور ہم
جام جم کے دور دورے ہو چکے

دل میں کیا ہے جس کا لالچ ہو جلیلؔ
دیتے ہو دے ڈالو جھگڑا تو چکے

(۷)

کرم کے جو کرم کا ظہور ہوتا ہے
خطا سے پہلے ہی عفوِ قصور ہوتا ہے

وہ چھپ کے آئے ہیں اس طرح شب کے پردے میں
کہ جیسے آنکھ کی پتلی میں نور ہوتا ہے

ہزار صلح ہو لیکن جہاں ملے دو دل
نیاز و ناز میں جھگڑا ضرور ہوتا ہے

جزا سزا کا تجھے اختیار ہے یارب
غفور جان کے تجکو قصور ہوتا ہے

جلیلؔ شانِ کرم جس نے دیکھ لی اک بار
وہ جان و دل سے فدائے حضور ہوتا ہے

مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی

حمد

(۱)

لاؤں کہاں سے حوصلہ آرزوئے سپاس کا — جبکہ صفات یار میں دخل نہ ہو قیاس کا
عشق میں تیرے دل ہوا ایک جہان بیخودی — جان خزینہ بن گئی حیرت بے قیاس کا
رونق پیرہن ہوئی خوبی جسم نازنیں — اور بھی شوخ ہو گیا رنگ تری لباس کا
لطف و عطائے یار کی عام ہیں بسکہ شہرتیں — قلب گناہگار میں نام نہیں ہراس کا
طے نہ کسی سے ہو سکا تیرے سوا معاملہ — جان امیدوار کا حسرت محو یاس کا

غزلیات

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا — کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا
پڑھ کے تیرا خط مرے دل کی عجب حالت ہوئی — اضطراب شوق نے اک حشر برپا کر دیا
ہم رہے یاں تک تری خدمت میں سرگرم نیاز — تجھ کو آخر آشنائے ناز بیجا کر دیا
عشق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے مرتبے — مہر ذروں کو کیا قطروں کو دریا کر دیا
کیوں نہ ہوں تیری محبت سے منور جان و دل — شمع جب روشن ہوئی گھر میں اجالا کر دیا
تیری محفل سے اٹھاتا غیر مجھ کو کیا مجال — دیکھتا تھا میں کہ تو نے بھی اشارہ کر دیا

سب غلط کہتے تھے لطف یار کو وجہ سکون
درد دل اس نے تو حسرت اور دونا کر دیا

(۲)

سرگرمِ ناز آپ کی شانِ جفا سے کیا
باقی ستم کا اور ابھی حوصلا ہے کیا

مجھ کو خبر نہیں کہ مرا مرتبا ہے کیا
یہ تیرے التفات نے آخر کیا ہے کیا

گر چشمِ آرزو کی ہیں کیفیتیں یہی
میں بھول جاؤں گا کہ مرا مدعا ہی کیا

چل بھی دیے وہ چھین کے صبر و قرارِ دل
ہم سوچتے ہی رہ گئے یہ ماجرا ہے کیا

میری خطا پہ آپ کو لازم نہیں نظر
یہ دیکھیے مناسبِ شانِ عطا ہے کیا

ہم کیا کریں اگر نہ تیری آرزو کریں
دنیا میں اور بھی کوئی تیرے سوا ہے کیا

حسرت جفائے یار کو سمجھا جو تو وفا
آئینِ اشتیاق میں یہ بھی روا ہے کیا

(۳)

مٹتا ہے مٹائے سے اب شوق کہیں تیرا
ہے پیشِ نظر ہر دم حسنِ نمکیں تیرا

اے قصرِ امارت کی ویرانی و بربادی
کس گوشۂ عبرت میں سوتا ہے مکیں تیرا

آنکھوں کے تبسم نے سب کھول دیا پردہ
ہم پر نہ چلا جادو اے چینِ جبیں تیرا

جز کثرتِ محرومی جز غایتِ دلگیری
مونس نہ ہوا کوئی اے جانِ حزیں تیرا

ہم خوب سمجھتے ہیں حسرت سے تیری باتیں
اقرار ہے در پردہ انکار نہیں تیرا

(۴)

اثرِ عشق سے نکلیں جو تمھارے آنسو
دامنِ جان میں وہ لے لیجیے سارے آنسو

جلوۂ حسن سے رنگیں ہیں جو آنکھیں اُن کی
سرخ نکلے ہیں اسی رنگ کے مارے آنسو

عالمِ حسن میں ہیں نور کی لہریں جاری
یا رواں عارضِ جاناں کے کنارے آنسو

گریۂ شوق سے تر ہیں جو تمھاری آنکھیں
بن گئے ہیں فلکِ حسن کے تارے آنسو

ہے محبت سے سروکار ہمیں بھی حسرت
چشمِ جاناں میں یہ کرتے ہیں اشارے آنسو

(۵)

دل کی جو ترک عشق سے حالت بدل گئی
وہ جستجو کی وہ خرمی سب بے خلل گئی

مجھ کو فلک نے تجھ سے چھڑایا تو کیا ہوا
کیا تیری یاد بھی مرے دل سے نکل گئی

آہ اس سے نارسائی جو رہتی تو خوب تھا
کیوں اس حریم عیش میں یوں بے محل گئی

سودا ہی وہ نہیں ہے جو سر سے چلا گیا
حسرت ہی وہ نہیں ہے جو دل سے نکل گئی

اب دل ہے اور فراغ محبت کی راتیں
تشویش زندگانی و فکر اجل گئی

رنگینیوں کی جان ہو وہ پائے نازنیں
میری نگاہ شوق جہاں سر کے بل گئی

حسرت یہ دور جہل ہے دولت کو ہے فروغ
اب ہم سے قدر دانی علم و عمل گئی

(۶)

دل مایوس کو سرچشمۂ صدق و صفا کر دے
گداز غم اگر چاہے تو مجھ کو با خدا کر دے

عطا ہو اس وفا دشمن کو توفیق کرم یارب
نہیں تو پھر مجھی کو بے نیاز مدعا کر دے

اثر ایسا کہاں سے لاؤں یارب نالۂ دل میں
جو اس بے مہر کو بھی راز غم سے آشنا کر دے

گراں گزرے گا حرف آرزو اس طبع نازک پر
نگاہ شوق اس مفہوم رنگیں کو ادا کر دے

غرور حسن کی تاثیر سے ڈر ہے مجھے حسرت
کہیں ایسا نہ ہو یہ عشق کو بھی خود نما کر دے

(۷)

عشق میں جان سے گزر جائیں
اب یہی جی میں ہے کہ مر جائیں

جامہ زیبی نہ پوچھئے ان کی
جو بگڑنے میں بھی سنور جائیں

ان کو مدنظر ہوا پردا
اہل شوق اب کہو کدھر جائیں

شب ہی شب ہے، دن ہی دن ہیں
جو تری یاد میں گزر جائیں

گریۂ شام سے تو کچھ نہ ہوا ۔۔۔ اُن تک اب نالۂ سحر جائیں
شعر دراصل ہیں وہی حسرتؔ ۔۔۔ سنتے ہی دل میں جو اُتر جائیں

(۸)

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے ۔۔۔ وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے
دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد ۔۔۔ ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے
خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد ۔۔۔ جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے
ترے ستم سے میں خوش ہوں کہ غالباً یوں بھی ۔۔۔ مجھے وہ شاملِ اربابِ امتیاز کرے
غمِ جہاں سے جسے ہو فراغ کی خواہش ۔۔۔ وہ اُن کے دردِ محبت سے ساز باز کرے
اُمیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ ۔۔۔ تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے
ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرتؔ ۔۔۔ اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

(۹)

توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہو جائیے ۔۔۔ بندہ پرور جائیے اچھا خفا ہو جائیے
میرے عذرِ جرم پر مطلق نہ کیجئے التفات ۔۔۔ بلکہ پہلے سے بھی بڑھ کر کج ادا ہو جائیے
خاطرِ محروم کو کر دیجئے محوِ الم ۔۔۔ درپئے ایذائے جانِ مبتلا ہو جائیے
میری تحریرِ ندامت کا نہ دیجئے کچھ جواب ۔۔۔ دیکھ لیجئے اور تغافل آشنا ہو جائیے
ایک بھی ارمان نہ رہ جائے دلِ مایوس میں ۔۔۔ یعنی آخر بے نیازِ مدعا ہو جائیے
ہائے ری بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہو مگر ۔۔۔ اس سراپا ناز سے کیونکر خفا ہو جائیے

کشمکش ہائے الم سے اب یہ حسرتؔ جی میں ہے
چھٹ کے ان جھگڑوں سے مہمانِ قضا ہو جائیے

مولانا سیّد علی حیدر نظم طباطبائی

غزلیات

(۱)

نظر آتا ہے ابر آسا گزرنا کوہساروں کا — کہ عالم عالمِ اجسام میں ہے بیقراروں کا
کیا ہے دستگیری کا جو وعدہ اسکی رحمت نے — کلیجہ ہاتھ بھر کا ہوگیا امیدواروں کا
نہ شوخی اے صبا کر۔ وضع میں اب فرق آتا ہے — غبار اونچا نہ ہو جائے کہیں ہم خاکساروں کا
بہت جلدی کی تونے کوس رحلت کے بجانے میں — کہ میں نے اے اجل ماتم نہ دیکھا دوستداروں کا
کھلا دیتی ہے کیا سرمہ نگاہِ شرمگیں تیرا — کہ اُف کرتا نہیں مارا ہوا تیرے اشاروں کا

منجم بھی ہے کیا اے نظم ہم فرقت نصیبونمیں
یہ اس کا جاگنا راتوں کا یہ گننا ستاروں کا

(۲)

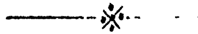
آستیں میں تو چڑھائی ہیں مری تعزیر پر — کچھ بتاؤ تو سہی۔ آخر یہ کس تقصیر پر
جذب رکھتی ہے عجب دکھتے ہوئے دل کی صدا — دوڑتا ہے شورِ محشر نالۂ شبگیر پر
حسنِ صورت پر مصور کے یہ حیرت ہے اسے — ایک خاموشی سی ہے چھائی ہوئی تصویر پر
سعیٔ لاحاصل کے کرجانے میں اک لذت تو ہے — ہنسنے دو تقدیر ہنستی ہے اگر تدبیر پر
خاک کی چٹکی ہے کافی خاکساروں کیلئے — کیا دوا ہر درد کی موقوف ہے اکسیر پر
گو کہ ہم ہیں پیکرِ بیجاں، مگر ہیں تو سہی — کچھ تو آبِ رنگ باقی ہے ابھی تصویر پر

تن کی عریانی ہے خوب آوارگان دشت کو
نظمؔ مجھ کو ناز ہے اس خلعت وجا گیر پہ

(۳)

نفس جبتک ہے آنکھیں دید ووا دید جہاں کر لیں — بندھا ہے تار یہ جبتک تماشا تیلیاں کر لیں
ضعیفی میں نہیں ہم کو شکایت قد کے جھکنے کی — زمیں سے کچھ دنوں فریاد جور آسماں کر لیں
خبر اس کی نہیں تھی دام زیر کاہ پنہاں ہے — ارادہ تھا کہ ہم بھی اس چمن میں آشیاں کر لیں
ہمارے ضبط کی گر پردہ داری دیکھنا چاہے — تو آ اے برق تجھ کو آشیاں میں ہم نہاں کر لیں

خزاں کے خوف میں کھلنے سے بہلے نظمؔ بہتر ہے
تماشائے گل و ریحاں و باغ و بوستاں کر لیں



ہز اکسیلنسی مہاراجہ کرشن پرشاد شاد جی سی آئی ای

غزلیات

(۱)

شخص ہی یا عکس ہی صورت مری آنکھوں میں ہے
کوئی آئینہ ہے یا حیرت مری آنکھوں میں ہے

دیکھ کر حیران ہے کیوں عالم تحیر ہے مجھے
جلوۂ دیدار کی حسرت مری آنکھوں میں ہے

پتلیاں اسواسطے روتی ہیں میری دمبدم
دیکھ لوں پھر اسکو یہ حسرت مری آنکھوں میں ہے

دونوں عالم میں نظر آتی ہے اپنی ہی بہار
کیا بہارِ گلشن قدرت مری آنکھوں میں ہے

کیوں نہ سجدہ میں کروں اب جانب اجمیر شاد
خواجۂ اجمیرؒ کی صورت مری آنکھوں میں ہے

(۲)

دردِ فرقت سے نہو دل کی تسلی نہ سہی
گر نہیں لیتے خبر تم میرے دل کی نہ سہی

کوزہ و جام بنانے کی تو تھی خاک مری
اس کے بھی کام کی گر یہ نہیں مٹی نہ سہی

قابلِ جلوہ گہہ یار تو دل ہے اے قیس
گر نہیں اس میں ابھی جلوۂ لیلی نہ سہی

معرفت علمِ لدنی ہے کہوں کیا تجھ سے
واعظا گر تو سمجھتا نہیں معنی نہ سہی

اس میں بھی شک ہے تمھیں کیا کہ نہیں بندۂ رب
خیر کافر ہی سہی شاد جو صوفی نہ سہی

سوانح عمریاں

مشہور اہلِ قلم کی سوانح عمریاں

اور

اُن کی خصوصیاتِ کمالات پر ایک نظم

شمس العلماء مولوی محمد حسین صاحب آزاد دہلوی

(۱)

پیدائش ۱۸۳۱ء وفات ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد ۱۸۳۱ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے آپ کے والد ماجد مولوی محمد باقر مذہب امامیہ میں اجتہاد کا رتبہ رکھتے تھے۔ ۱۸۵۶ء میں مولوی محمد باقر نے پہلا اُردو اخبار اپنی ادارت میں دہلی سے شائع کیا تھا۔ مولانا آزاد صاحب نے اورینٹل کالج دہلی میں عربی و فارسی کی تکمیل کی اور طالب علمی کے زمانہ میں جواب مضمون لکھنے میں اور طلباء سے اوّل رہتے تھے۔ سخن گوئی کا شوق طالبِ علمی ہی کے زمانے سے تھا

آپ نے فنِ شعر گوئی کی تکمیل کے لئے حضرت ذوق مرحوم کے سامنے زانوئے ادب کیا غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جب مسٹر ٹیلر پرنسپل دہلی کالج کے قتل پہ آپ کے والد مارے گئے تو آپ نے اپنے قدیمی وطن کو خیر آباد کہا اور حیدرآباد دکن چلے گئے کچھ دنوں بعد لاہور آئے اور مولوی رجب علی صاحب میر منشی نے پنڈت من پھول صاحب میر منشی سے جو اسوقت اس عہدہ پر مامور تھے آپ کی سفارش کی اور میجر فلیر صاحب ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم کے دفتر میں پندرہ روپے ماہانہ کی جگہ پر مامور کرا دیا۔ میجر فلیر صاحب کے بعد کرنل ہالرائڈ صاحب ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم کی جگہ پر رونق افروز ہوئے تو انھوں نے پچانوے روپے ماہانہ پر آپ کو سرکاری اخبار کا اسسٹنٹ اڈیٹر مقرر کیا۔ ۱۸۶۹ء میں پنجاب گورنمنٹ کے میر منشی پنڈت من پھول کی رفاقت میں ۱۸۷۰ کابل اور بدخشاں گئے۔ وہاں سے واپس آنے پر سرکاری کالج لاہور کے عربی پروفیسر ہوگئے اور ایک سو ساٹھ روپے ماہانہ آپکے مقرر ہوگئے۔ ۱۸۸۶ء میں آپ ایران گئے ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی پچاس سالہ جوبلی پر آپ کو گورنمنٹ برطانیہ نے شمس العلماء کا خطاب عطا کیا چونکہ آپکی والدہ ایک ایرانی خاتون تھیں اور خاندانِ مغل سے تھیں اس لئے فارسی آپکی مادری زبان تھی اور اس پر پورا پورا عبور تھا۔ بھاشا اور علم مغربی پر بھی کافی دستگاہ تھی۔ ۱۸۸۹ء میں آپ کا دماغ معطل ہوگیا اور کچھ جنون کے آثار نمایاں ہوگئے تھے۔

۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء مطابق ۹ محرم ۱۳۲۸ھ کو آپ نے رحلت کی اور لاہور میں دفن کئے گئے نظم و نثر میں آپ کا طرز جداگانہ ہے کسی خاص رنگ کا پابند نہیں، نثر میں آپ کی کتابیں دو قسموں پر منقسم تھیں، ایک وہ جو آپنے سررشتۂ تعلیم پنجاب کے لئے لکھیں مثلاً اردو کا قاعدہ اردو کی پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی کتاب۔ قصص ہند فارسی کی پہلی۔ دوسری کتاب جامع القواعد وغیرہ۔ دوم جو آپنے شوق سے تصنیف کی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

آبِ حیات، اور دربارِ اکبری، سخندانِ پارس - نیرنگِ خیال - قندِ پارسی، نصیحت کا کرن پھول وغیرہ - آبِ حیات کا طرزِ بیان، سلاستِ زبان، محاورت کی دل آویزی، ظرافت کی چاشنی اور روشن خیالی کا بہترین نمونہ ہے - نیرنگِ خیال میں انگریزی روش کا تتبع کیا ہے - نثر میں آپ کی قادر الکلامی مسلّم ہے - مناظرِ قدرت کا فوٹو اور واردات قلبی کی تصویر آپ کا حصّہ تھی جو نظمیں شبِ قدر، موسمِ زمستاں، صبحِ اُمید اور حُبِّ وطن کے عنوان سے آپ نے کہی ہیں اور جس خوبی سے ایشیائی رنگ کو اپنے رنگ میں رنگا ہے اُس کی جدت کا سہرا آپ ہی کے سر رہا گو آپ کے بعد حضرتِ حالی مرحوم نے اس رنگ کو چار چاند لگا دیئے مگر جو مقبولیت آپ کو ہوئی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں - آپ نے نثر میں وہ کمال دکھایا ہے جو آج تک کسی مُصنّف کو میسّر نہیں ہوا - جس رنگ میں - جس لب و لہجہ میں چاہا اپنا کمال دکھا کر اہلِ فن کو مسخر کر لیا - آبِ حیات اور نیرنگِ خیال نے اہلِ قلم کو محوِ حیرت بنا دیا ہے آپ کے قلم میں فصیح و بلیغ - دقیق و سلیس غرضکہ ہر قسم کی نثر لکھنے کی قوت و قدرت تھی - ایشیائی مذاق اور مبالغہ آمیز خیالات کو قدرتی مناظر اور نیچرل شاعری کے سانچے میں ڈھالنا اور اس طرز کو مقبولِ عام بنانا آپ ہی کا حصّہ تھا - آپ نے زبانِ اُردو پر جس قدر احسانات کئے ہیں اسکی نظیر قطعی ناممکن ہے -

---

آنریبل ڈاکٹر سر سیّد احمد خاں صاحب رح

(۲)

پیدائش ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء   وفات ۲۸ مارچ ۱۸۹۸ء

آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خاں مرحوم ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ علوم مشرقی فارسی و عربی کی تعلیم کے بعد ۲۲ سال کی عمر میں عدالت صدر امینی دہلی کے سرشتہ دار مقرر ہوئے کچھ دنوں بعد کمشنری آگرہ کے نائب منشی کے عہدے پر مامور ہوئے۔

۲۴ دسمبر ۱۸۴۱ء میں مین پوری کے منصف ہوگئے اور وہاں سے بدل کر فتحپور سیکری اور اُس کے بعد دہلی آئے۔

۱۸۴۲ء میں بہادر شاہ نے جواد الدولہ عارف جنگ کا خطاب عطا کیا۔ ۱۸۵۵ء میں مستقل صدر امین بنا کر بجنور بھیجے گئے۔ ۱۸۵۸ء میں مراد آباد کی سب ججی پر ممتاز کئے گئے اور غازی پور۔ علی گڑھ۔ بنارس سب ججی کی خدمات انجام دینے کے لئے بھیجے گئے۔ یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو بنارس چھوڑا اور ولایت کا سفر کیا۔ ۶ اگست ۱۸۶۹ء کو گورنمنٹ انگریزی سے سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب اور تمغہ عطا ہوا۔ ۲۔ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو ہندوستان واپس آئے اور ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی بنیاد ڈالی ۱۸۷۶ء میں نہایت نیک نامی اور عزت کے ساتھ آپ نے پنشن لی اور اپنے آپ کو قومی خدمات کے لئے وقف کر دیا۔ اخبار انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور رسالہ تہذیب الاخلاق

دونوں آپ کی ادارت سے شائع ہوتے تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد اردو زبان میں جو انقلاب پیدا ہوا اور انگریزی لٹریچر کا جو پرتو اس پر پڑا وہ سرسید مرحوم کی جدت طبع اور رسعی بلیغ کا نتیجہ تھا۔ اسی لیئے جدید علم ادب کا سہرا آپ کے سر رہا۔ آپ کے مضامین میں تشبیہات۔ استعارات۔ تمثیلیں۔ تلمیحیں نہایت لطیف و نادر ہیں۔ زبان کا لوچ نہایت مزا دیتا ہے جو کہتے تھے وہ لکھتے تھے اور اس پیرایہ سے نفس مطلب ادا کرتے تھے کہ سبحان اللہ۔

بسا اوقات آپ کا صحیح جذبہ اتنا اثر ڈالتا تھا کہ ہر لفظ نقش ہوجاتا تھا اور جو بات منھ سے نکلتی تھی تاثیر کے ساتھ دست و گریباں ہوکر نکلتی تھی۔ اردو لٹریچر کو جو ہر ثت طرح طرح کی امداد پہونچائی ہے اس لحاظ سے آپ کو فادر آف اردو کہا جاتا ہے اگرچہ آپ کے طرز تحریر کی بعض ہم عصروں نے بھی تقلید کی مگر نقل میں اصل کا جلوہ کہاں مضمون نگاری کی گرم بازاری آپ ہی کی ذات سے ہوئی جو اسپیچ ہوتی تھی وہ اس قدر موثر اور دلچسپ ہوتی تھی کہ پھر کسی سامع کا دل کسی اور طرف مائل نہ ہوتا تھا آپ کی بہت سی تصنیفات و تالیفات ہیں جن میں تفسیر القرآن سب سے زیادہ مشہور ہے یہ تفسیر چھ جلدوں میں ختم ہوئی۔ اس کے علاوہ سلسلۃ الملوک۔ آثار الصنادید۔ اسباب بغاوت ہند اور لیکچروں کا مجموعہ بھی مایۂ ناز ہیں مگر تفسیر اس روانی اور خوبی کے ساتھ لکھی ہے جس کی داد کے لئے الفاظ میسر نہیں آتے۔ سرسید مرحوم نے مدرستہ العلوم علی گڑھ کی بنیاد سے ملک اور قوم کو جو فائدہ پہونچایا ہے اس کے احسانات سے آیندہ نسلیں سبک دوش نہیں ہوسکتیں اور اس نصف صدی میں قوم نے جو ترقی کی ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ حق تو یہ ہے ؎

اے سراپا فیض اے سرسید عالی خیال (حمید) وصف ہوں تجھ سے رقم کیا میری طاقت کیا مجال

آخر عمر میں آپ نے سول ملٹری سروس میں ہندوستانیوں کو معزز عہدے دیئے جانے کی بابت بہت کوشش کی اور اس خیال کو کامیاب دیکھنے کی فکر میں ہر وقت مصروف رہے۔ مگر قوم اور ملک کی بدنصیبی سے اکیاسی برس کی عمر میں سر سید مرحوم نے ۲۸ مارچ ۱۸۹۸ء بمقام علی گڑھ رحلت فرمائی اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ (کالج) کی مسجد کے بیرونی حصہ میں دفن ہوئے اور قوم کی کشتی کو جو کس مپرسی اور ذلت کے سمندر میں غوطے کھا رہی تھی پار کرنے کے لئے مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی ملاحی بطور یادگار چھوڑ گئے۔



شمس العلما مولانا خواجہ الطاف حسین حالی

(۳)

پیدائش ۱۸۳۷ء وفات ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء

آپ کا سلسلۂ نسب خواجہ ملک علی صاحب سے ملتا ہے۔ جو ہرات سے ہندوستان آکر پانی پت ضلع کرنال میں مقیم ہوئے تھے۔ بادشاہِ وقت نے ازراہِ قدردانی پانی پت اور اُس کا ملحقہ علاقہ بطور الطافِ شاہانہ اُن کو مرحمت کیا اور منصب قضات پر مامور فرمایا۔ آپ کی ولادت ۱۸۳۷ء کے قریب پانی پت محلہ انصاریہ میں ہوئی۔ آپ نسلاً انصاری اور بطناً سید تھے۔ آپ کو تحصیلِ علم کا فطری شوق تھا۔ میر ممنون دہلوی کے بھتیجے اور داماد سید جعفر علی سے آپ نے فارسی اور مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری سے عربی کی تعلیم پائی۔ ۱۷ سال کی عمر میں ایک خوش حال گھرانے میں شادی ہوئی۔ آپ دہلی تشریف لائے۔ اور وہیں علومِ منطق و فلسفہ اور صرف و نحو وغیرہ کی تحصیل انتہائی درجہ تک پہونچائی ۱۸۵۵ء تک مُطالعہ کا سلسلہ برابر جاری رہا آپ نے ابتداءً نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ سے مشورۂ سخن کیا اور پھر مرزا غالب مرحوم کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد گورنمنٹ پنجاب کے دارالکتب (بک ڈپو) لاہور میں پرانی کتابوں کا لٹریچر موجودہ زمانہ کے مطابق درست کرنے پر مامور ہوئے۔ اس زمانہ میں کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر تعلیمات نے لاہور میں ایک بزمِ مشاعرہ قائم کی تھی جس میں بجائے مصرع طرح کے خاص خاص عنوان پر شعراء کو طبع آزمائی کا موقع دیا جاتا تھا۔ مولانا موصوف نے

اپنی فصاحت و بلاغت کے وہ جوہر دکھائے جس نے اُن کی شہرت کو دوبالا کر دیا۔ چنانچہ برکھارُت، نشاطِ اُمید، مناظرۂ رحم و انصاف، حبِّ وطن وغیرہ اُسی بزم کی یادگار نقوش ہیں۔ بہ سال بعدہٗ "اینگلو عربک اسکول" دہلی کی مدرسی پر مقرر ہو کر آپ لاہور سے واپس آئے۔ اسی اثناء میں نوابِ آسمان جاہ مرحوم علی گڑھ کالج کا معائنہ کرنے کے لئے تشریف لائے۔ اور آپ کو خوش قسمتی سے باریابی کا موقع مل گیا اور ازراہِ قدردانی پچھتر روپے ماہانہ کا امدادی وظیفہ دکن سے مقرر ہو گیا۔ ۱۳۰۹ھ میں "علی گڑھ ڈیپوٹیشن" کے ساتھ آپ حیدرآباد تشریف لے گئے۔ اُسوقت سر آسمان جاہ مدارالمہام تھے۔ آپ نے کئی نظمیں پیش کیں تو آپ کا وظیفہ بجائے پچھتر روپے ماہانہ کے سو روپے ماہانہ ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد آپ نے تریاقِ مسموم اور تعلیم نسواں پر دو کتابیں اور تصنیف کیں جو اسوقت کم یاب ہیں۔ اِن کتابوں کے صلہ میں "تعلیمی دربار دہلی" کے موقع پر لارڈ بریڈک نے چار سو روپیہ انعام عطا کیا اور یہ کتاب احاطۂ پنجاب کے کورس میں داخل ہو گئی۔ آپ نے ایک فرانسیسی کتاب طبقات الارض کے عربی ترجمہ کا مطالعہ کیا اور اپنی مادری زبان میں اس کی مشکلات کو حل کیا۔ اِس کے بعد حیاتِ سعدی۔ مسدس حالی۔ دیوانِ حالی۔ شکوۂ ہند۔ یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید مولینا کی مستقل تصانیف کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ حیاتِ سعدی۔ یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید میں بالترتیب شیخ سعدیؒ، غالبؒ اور سر سید احمد خاں مرحوم کی شرح اور مبسوط لائف ہیں۔ ۱۸۹۳ء میں آپ کا ایک دیوان شائع ہوا جو نصائح و اخلاق سے بھرا ہے۔ عرصہ ہوا کہ آپ کی رباعیات کا ترجمہ یورپ میں بزبان انگریزی ہو چکا ہے۔ حضور نظام میر محبوب علی خاں مرحوم مغفور کی جوبلی چہل سالہ کے موقع پر آپ کو حیدرآباد بلایا گیا۔

اس موقع پر آپ نے اپنی متین اور مؤثر آواز میں اپنی نظم کا پہلا ہی شعر پڑھا تھا کہ حاضرین کی جیر زسنے زمین کو آسمان پر اُٹھا لیا اور مولوی ظفر علی خاں۔ مرزا عزیز مرحوم ، مولوی عبدالحق اور مہاراجہ مدار المہام نے نظامِ دکن سے درخواست کی کہ یہ نظم مدارس نسواں کے نصاب میں داخل کی جائے۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں گورنمنٹ عالیہ نے آپ کو شمس العلما کا خطاب عطا کیا۔ آپ اپنے طرز کے موجد اور نصائح و پند کے یکتا ادیب تھے حقیقت میں قول و فعل کی جو دل پسند مطابقت مولانا حالی کی ذات بابرکات سے پائی جاتی ہے۔ وہ اور کسی میں نہیں۔ مختصر یہ کہ آپ کی تعریف کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔ آخر ۳۱ دسمبر سنہ ۱۹۱۴ء کو آپ نے داغِ مفارقت دیا اور ہمیشہ کے لئے خلدِ بریں کو اپنا مسکن بنایا۔

—— ⁂ ——

شمس العلماء مولانا حافظ نذیر احمد صاحب دہلوی

(۴)

پیدائش ۶ دسمبر ۱۸۳۶ء   وفات ۲۸ اپریل ۱۹۱۲ء

شمس العلماء مولانا حافظ نذیر احمد دہلوی مولوی سعادت علی صاحب کے صاحبزادے تھے۔ ۶۔ دسمبر ۱۸۳۶ء کو نواحِ نگینہ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ سنِ بلوغ کو پہونچتے ہی آپ نے اپنا قدیمی وطن ترک کیا اور دہلی کی مستقل سکونت اختیار کی اپنے والد ماجد سے کتب فارسی کی تعلیم پائی اور عربی کی ابتدائی کتب مولوی نصر اللہ خاں سے پڑھیں اور مولوی عبد الخالق صاحب سے پوری پوری تکمیل کی۔ جنوری ۱۸۴۵ء میں آپ دہلی کالج میں داخل ہوئے اور یہیں سے فارغ التحصیل ہوکر ابتدائً ضلع گجرات کے ایک اسکول میں چالیس روپے ماہوار پر ملازم ہوئے۔ دو سال تک اس خدمت کو قابلیت کے ساتھ انجام دیا۔ ۱۸۵۵ء میں آپ کانپور کے ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے۔ آپ تلنگی زبان بھی اچھی جانتے تھے۔ آخر عمر میں آپ نے دہلی رہ کر سنسکرت زبان پر پورا پورا عبور حاصل کیا۔ حسب ایما گورنمنٹ عالیہ آپ نے انکم ٹیکس اور تعزیرات ہند کا نہایت سلیس اردو زبان میں ترجمہ کیا۔ جس کے صلہ میں آپ ۱۸۶۱ء میں تحصیلداری کے عہدے پر فائز ہوئے کچھ عرصہ کے بعد آپ نے ضابطۂ فوجداری اور قانونِ شہادت کا انگریزی سے اردو ترجمہ اپنی ٹکسالی زبان میں کیا جو گورنمنٹ کی نگاہ میں خصوصًا اور قانون

داں طبقہ میں عموماً مقبول ہوا۔ اس نمایاں خدمت کے صلہ میں ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر مامور ہوئے اور اس عہدہ جلیلہ کے فرائض کو اپنی ذہانت سے بخوبی انجام دیتے رہے۔ ۱۸۷۸ء میں نواب عماد الملک مولوی سید حسن بلگرامی کی تحریک سے سر سالار جنگ مدار المہام نے آپ کو حیدر آباد بلا کر ایک ہزار روپے ماہوار مشاہرہ کی جگہ پر ممتاز فرمایا۔ آپ نے فرائض منصبی کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا آخر کچھ عرصہ کے بعد اس عہدہ سے پنشن پائی اور تا زیست دہلی ہی میں مقیم رہے۔ آپ نے اُردو میں وہی مرتبہ حاصل کیا جو فارسی میں ابو الفضل۔ فیضی نے حاصل کیا تھا۔ آج تک ایسی صاف ستھری نثر دہلی اور لکھنؤ کے معاصرین کو لکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی کے بعد آپ نے اُردو ناول نویسی کو مہذب مگر پُر مذاق رنگ میں لکھ کر اہل قلم کو دکھا دیا کہ اگر حسن و عشق کے مضامین چھوڑ کر کوئی مقبولِ عام تصنیف ہو سکتی ہے تو وہ مولانا موصوف کی نثر ہے۔ اُن کی کتب عشق و حسن کی روایات سے بالکل خالی ہیں مگر اخلاقی جذبات اور دلپذیر نصائح کے موجزن دریا ہیں جو اہلِ ہند کے دلوں کو تر و تازہ کرتے ہیں۔ آپ کی مقبول کتاب مرآۃ العروس ایک عرصہ تک گورنمنٹ انگریزی کے ایماء سے مدارس میں جاری رہی اور فی زمانہ کوئی مہذب گھر اس سے خالی نہیں۔ اس تصنیف کے صلہ میں آپ کو ایک ہزار روپے گورنمنٹ نے عطا فرمائے۔ بنات النعش میں تعلیم نسواں کے مطالب کو صاف و شستہ زبان میں بطور مکالمہ کے حل فرمایا۔ توبۃ النصوح آپ کی اخلاقی کتاب ہے جو قابل دیکھنے اور عمل کرنے کے ہے۔ ان دو آخر الذکر کتابوں پر گورنمنٹ نے بڑا انعام عطا کیا ہے۔ منتخب الحکایات۔ ابن الوقت۔ رویائے صادقہ۔ الحقوق و الفرائض

موعظ حسنہ۔ ترجمۃ القرآن اور بہت سی بے بہا تصانیف ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر نہایت مرغوب و کارآمد اور قابل صد ستائش ہیں۔ آپ کی طبیعت میں مہذب مذاق تھا۔ جو دلوں کو اپنی طرف کھینچتا تھا۔ کلام مجید کا ترجمہ بھی ایسا سلیس کیا ہو کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ آپ کی زبان بہت صاف ہے اور آپ کی طرز ادا سے دہلی کا رنگ جھلکتا ہو۔ مولٰنا موصوف نے ایسی یادگاریں چھوڑی ہیں جو ملک و قوم دونوں کے لئے مایۂ ناز ہیں۔ آخر آپ نے مرضِ فالج میں ۸ ہر اپریل ۱۹۱۲ء کو جمعہ کے دن صبح کے وقت اِس جہانِ فانی سے بمقام دہلی انتقال فرمایا۔



شمس العلماء مولانا شبلی نعمانیؒ

(۵)

پیدائش ۱۸۵۷ء وفات ۱۹۱۴ء

آپ ۱۸۵۷ء میں ضلع اعظم گڑھ کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ منطق۔ فلسفہ ادب۔ مولانا محمد فاروق صاحب چڑیا کوٹی مشہور ادیب سے فقہ مولوی ارشاد حسین صاحب سے۔ تفسیر اور قدرے علم ادب مولوی فیض الحسن صاحب سے اور حدیث شریف مولوی حافظ احمد علی صاحب محدث سہارن پوری سے صرف ۱۸ برس کے قلیل زمانہ میں حاصل کیے۔ حصولِ تعلیم کے کچھ دنوں بعد آپ دیوانی عدالت کے امین رہے اس ملازمت سے دل برداشتہ ہو کر علی گڑھ چلے آئے۔ اور سمیع اللہ خاں صاحب کی سفارش سے سرسید مرحوم نے آپ کو کالج کی پروفیسری پر فائز کیا۔ سولہ سال تک کالج کی خدمت نہایت خوبی سے انجام دی اور علمی دنیا میں ایسی شہرت وعظمت حاصل کی جو فی زمانہ قابلِ رشک ہے۔ دورانِ پروفیسری میں آرنالڈ پروفیسر سے آپ نے فرنچ زبان سیکھی اور اسی زمانہ میں آپ بلادِ اسلامیہ قسطنطنیہ مصر وغیرہ کتاب الفاروق کا مواد بہم پہونچانے کے لئے تشریف لے گئے اور وہاں کے مشہور مدارس کے حالات اپنے سفرنامہ مصر و روم میں قلم بند کئے۔ ۱۸۹۲ء میں آپ کو شمس العلماء کا خطاب گورنمنٹ سے عطا ہوا اُس وقت آپ کی عمر ۳۵ سال کی تھی۔ عرصہ تک الٰہ آباد یونیورسٹی کے فیلو رہے۔

سرسید کی رحلت کے بعد ۱۸۹۸ء میں آپ کالج سے سبکدوش ہوکر حیدرآباد سلسلۂ آصفیہ میں دو سو روپیہ ماہوار وظیفہ پر مصنفین کے شعبہ پر مامور ہوئے

کچھ عرصہ بعد تین سو روپے ماہوار مقرر ہوگئے ایک عرصہ کے بعد آب و دانہ کی کشش وطن سے لکھنؤ کھینچ لائی اور وہاں قیام پذیر ہو کر ندوۃ العلماء کی دینی خدمات میں مصروف ہوئے۔ آخری عمر میں تمام سلسلوں سے قطع تعلق کر کے سیرۃ نبوی کی تالیف و تصنیف میں مشغول ہوئے۔ افسوس ہے کہ زندگی نے وفا نہ کی اور سیرت ناتمام رہ گئی ورنہ دنیا میں اس کی مثال نہ ملتی۔ ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ کو مرض اسہال میں مبتلا ہو کر اپنے قدیمی وطن میں رحلت فرمائی قدرت نے آپ کو ابتدا ہی سے ذہین و متین اور سلیم الطبع بنایا تھا۔ تاریخ و فلسفہ سے آپ کو بڑی محبت تھی۔ علوم مشرقی میں کامل استعداد بہم پہنچائی تھی طرزِ بیان آپ کا اگرچہ نہایت سادہ تھا مگر دلایل قومی اور تحریر فلسفیانہ اور محققانہ تھی جس میں تاریخی واقعات ہوتے تھے۔ عربی نظم و نثر کے ادیب مانے جاتے تھے فارسی خوب لکھتے تھے۔ اردو میں ایسا پاکیزہ اور دلکش بیان تھا کہ بقول سرسید اہلِ دہلی اس پہ رشک کرتے تھے۔

ہر چند کہ تصنیفات آپ کی کثیر ہیں مگر ہم آپکی مشہور کتب پر اکتفا کرتے ہیں جو زیادہ مشہور اور متعدد مرتبہ چھپ چھپ کر مقبول خلایق ہو چکی ہیں سفر نامہ مصر و روم و شام الفاروق۔ الغزالی۔ النعمان۔ المامون۔ الکلام۔ التجزیہ۔ تاریخ الاسلام سوانح مولانا روم۔ اورنگ زیب۔ موازنۂ انیس و دبیر۔ شعر العجم پانچ جلدوں پر منقسم ہی آپ کی آخر اور بہترین تصنیف سیرۃ النبی ہے جس کو ناتمام چھوڑا جس قدر لکھی گئی ہے وہ قابلِ دید اور خراجِ تحسین سے برتر و بالا ہو اس کو چار جلد میں تمام کرنے کا ارادہ تھا جو پورا نہ کر سکے اب اس کی تکمیل مولوی سلیمان ندوی کر رہے ہیں جو ایک ممتاز اور متبحر عالم ہیں۔

شمس العلماء خان بہادر مولوی محمد ذکاء اللہ صاحب دہلوی

(۶)

پیدائش ۱۸۳۲ء ۔ وفات ، نومبر ۱۹۱۰ء

آپ ۱۸۳۲ء میں دہلی کوچہ بلاقی بیگم میں پیدا ہوئے بارہ برس کی عمر میں دہلی کالج کے ورنیکلر ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہوکر ۶ سال تک تعلیم پاتے رہے اس اثناء میں آپ نے کئی وظائف اور ہائی پروفیشنی کے دو تمغے بھی حاصل کیے۔ ۱۸۵۱ء میں دہلی کالج میں ریاضی کے مدرس مقرر ہوئے۔ آگرہ کالج میں بھی کچھ عرصہ معلم رہے اور ہفت سالہ درس و تدریس کے مشغلہ کے بعد ۱۸۵۵ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کا عہدہ حاصل کیا۔ ۱۱ سال تک اس خدمت کو انجام دیا۔ ۱۸۶۹ء میں نارمل اسکول دہلی کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے اور تین سال تک اس پر مامور رہ کر اورینٹل کالج کے پرنسپل مقرر کیے گئے چند دنوں کے بعد میور سنٹرل کالج الہ آباد میں ورنیکلر سائنس اینڈ لٹریچر کے پروفیسر بنائے گئے۔ یہاں انٹرنس سے لیکر ایم۔ اے کلاس تک عربی۔ فارسی کا درس دیتے رہے اور ۱۵ سال کی ملازمت کے بعد ۱۸۸۷ء میں اپنی خوشی سے پنشن لیکر خانہ نشین ہوگئے ۴۶ سال تک آپ نے صوبہ پنجاب و اضلاع مغربی و شمالی کے سررشتۂ تعلیم میں اپنی خدمات باحسن الوجود انجام دیں۔ ۷ نومبر ۱۹۱۰ء کو اسی برس کی عمر میں اس جہانِ ناپائدار سے رحلت کی۔

۱۹ برس کی عمر سے مرحوم کو تراجم، تالیف، تصنیف اور مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوا جو آخر وقت تک جاری رہا۔ علوم ریاضیہ و طبیعیات میں آپ کو خاص دستگاہ حاصل

تھی۔ علم حساب، الجبریات والکلیات، وعلم مثلث مستوی وکروی علم ہندسہ اقلیدس علم مساحت، علم ہندسہ بالجبر، تراشہائے مخروطی علم جبر ومقابلہ علم حساب وغیرہ آپ کا مجموعۂ تصانیف ۲۰ کی تعداد تک پہونچتا ہے۔ یہ کتب کافی مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ نیچرل سائنس یعنی علوم طبعیات میں ۱۴ علم جغرافیہ میں ۳ علم التاریخ میں ایک مکمل تاریخ ہندوستان کی ہے جس کی دس جلدیں ہیں۔ ایک مکمل تاریخ عہد انگلشیہ کی ہے جو پانچ جلدوں پر منقسم ہے۔ عہد ہنود کی تاریخ صرف ایک جلد میں ختم کی ہے۔ علم اخلاق و اردو علم ادب میں ۲۲ کتابیں لکھی ہیں۔ غرضیکہ مطبوعہ کتب کی تعداد ۱۶۰ ہے ان کتابوں کی ضخامت ساٹھ ہزار صفحات سے زائد ہوگی کتب ریاضی کے صلہ میں پندرہ سو روپے انعام از رفاقت بہادر اور شمس العلماء کے دو خطاب گورنمنٹ عالیہ سے عطا ہوئے لارڈ نارتھ بروک کے عہد میں گورنمنٹ نے یہ طے کیا کہ: "اگر مولانا صاحب مثل ریاضی کے دیگر علوم میں بھی اپنی تصانیف کا سلسلہ جاری رکھیں تو ان کو انعامات وخطابات عطا کئے جائیں" آپ نے اردو زبان پر بڑا احسان کیا ہے اردو کی تاریخ میں مولانا کا نام سنہری حرفوں میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ طرز تحریر نہایت سادہ اور صاف ہے۔

مولوی عبدالحلیم صاحب شرر عباسی لکھنوی

پیدائش ۱۸۶۰ء (۷) وفات دسمبر ۱۹۲۶ء

آپ ۱۸۶۰ء میں دارالسلطنت لکھنؤ میں پیدا ہوئے آپ کے والد ماجد حکیم تفضل حسین خاں صاحب عربی و فارسی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے ۔ اور واجد علی شاہ کے یہاں ایک ممتاز خدمت پر مامور تھے ۔ آٹھ سال کی عمر میں آپ کو اپنے ہمراہ کلکتہ لے گئے اور حافظ الٰہی بخش صاحب سے قرآن مجید ختم کرایا اور کچھ ابتدائی کتابیں پڑھائیں ۔ ملا باقر صاحب سے صرف و نحو سیکھا اور مولوی سید علی حیدر صاحب طباطبائی سے منطق و فلسفہ کی تعلیم حاصل کی اور اسی زمانہ میں علم مغربی کی بھی تعلیم پائی ۔ حکیم محمد مسیح صاحب سے طب پڑھی اور چندے مطب بھی کیا اس کے بعد مولوی محمد یحییٰ صاحب اور مولوی عبدالباری صاحب سے متوسطات معقول پڑھیں ۱۸۶۸ء میں آپ لکھنؤ آئے اور مولانا عبدالحی صاحب سے کتب درسیہ کی تکمیل کی اور مفتی میر عباس صاحب سے عربی علم ادب پڑھا ۔ ۱۸۷۹ء میں آپ دہلی آئے اور مولوی نذیر حسین صاحب سے صحاح ستہ اور موطا امام مالک اور تفسیر جلالین تمام کرکے لکھنؤ آئے اور نظم طباطبائی صاحب سے شاعری میں شرف تلمذ حاصل کیا ۱۸۸۱ء میں آپ اودھ اخبار کے اسسٹنٹ اڈیٹر مقرر ہوئے اور اپنی ادارت سے ایک ہفتہ وار رسالہ محشر نکالا ۔ اودھ اخبار سے قطع تعلق کرکے آپ نے ایک ناول لکھا جو مقبول عام ہوا ۔ جنوری ۱۸۸۷ء میں آپ نے دلگداز جاری کیا جو آپ کے مرتے دم تک جاری رہا ۔ ۱۸۹۱ء میں آپ دکن تشریف لے گئے ۔ نواب وقار الامراء بہادر معین المہام مال نے اپنی ریاست سے دو سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر کیا ۔ آپ نے

دکن ہی کے قیام میں تاریخ سندھ لکھی جس پر پانچ ہزار روپے نواب وقار الامرا بہادر نے ازراہِ قدر دانی عطا کیے۔ ۱۸۹۲ء میں آپ نواب وقار الامراء کے صاحبزادے نواب ولی الدین خاں بہادر کے ہمراہ انگلستان تشریف لے گئے اور انگلستان ڈیڑھ سال مقیم رہے۔ اس دوران قیام میں آپ نے فرانسیسی زبان سیکھی اور اس پر اتنا عبور حاصل کیا کہ فرینچ زبان کی کتابوں کا اُردو ترجمہ کیا۔ انگلستان کی واپسی کے چھ ماہ بعد آپ دکن سے پھر لکھنؤ آئے اور آتے ہی ادبی خدمات میں مصروف ہو گئے۔ ۱۹۰۸ء میں آپ پھر دکن تشریف لے گئے اور وہاں اسسٹنٹ ڈائرکٹر تعلیمات کے عہدہ پر مامور کیے گئے۔ ۱۹۰۹ء میں مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم اور مولوی ظفر علی خاں صاحب بی۔ اے۔ کے ہمراہ آپ بھی اپنی خدمات سے نیک نامی کے ساتھ سبکدوش ہوئے اور پھر لکھنؤ چلے آئے۔ نثر میں شاعرانہ تخیل کا اظہار کرنا تاریخی اور عاشقانہ خیالات کو پُر درد پیرایہ میں تحریر کرنا آپ کا فطری حصہ تھا۔ اُردو ناول نویسی کے آغاز کا سہرا بھی آپ ہی کے سر رہا۔ قدرتی مناظر کا فوٹو اس ادا سے دکھایا ہے کہ سبحان اللہ آپ نے انگریزی فرانسیسی، عربی کی تواریخ اور افسانوں کا اُردو ترجمہ اپنی زبان میں اس طرح ادا کیا ہے جو اپنی آپ ہی مثال ہے۔ آپ کی کثیر التعداد تصانیف آپ کی یادگار ہیں۔ جن میں تاریخ سندھ۔ مصرِ قدیم۔ فلورا فلورنڈا۔ ماہ ملک۔ ایامِ عرب۔ فردوسِ بریں بہت زیادہ قابلِ قدر ہیں۔ دسمبر ۱۹۲۶ء کو قوم اور ملک سے رخصت ہو کر ملکِ بقا کی طرف تشریف لے گئے۔ اپنے سلسلہ کی فاتحہ خوانی کے لئے لکھنؤ میں ایک تربت بطور یادگار چھوڑی۔

※

مولانا سید احمد حسن صاحب شوکت مرحوم

(۸)

پیدائش وسط ۱۸۳۹ء   وفات ۳۱ دسمبر ۱۹۲۲ء

مولانا سید احمد حسن صاحب شوکت مرحوم و مغفور وسط ۱۸۳۹ء میں بمقام رام پور ضلع سہارن پور پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب شیخ انصار و سادات سے ملتا ہے آپ نے اپنے والد بزرگوار مولانا نیاز حسن صاحب سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور انھیں سے قرآن مجید حفظ کیا۔ آپ نے صغر سنی ہی کے زمانہ میں وطن کو خیرباد کہہ کر محکمۂ پولیس میں ملازمت اختیار کی ذہانت۔ جدت خدائے تعالےٰ نے آپ کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی تحصیل علم اور فن سخن کا شوق بچپن ہی سے قدرت نے ودیعت کیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد محکمۂ پولیس کی ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کی اور تحصیل علم کا سلسلہ از سر نو جاری کیا اپنے ماموں مولانا عبد الحق صاحب صاحب سہارن پوری سے فارسی کی تکمیل کی اور پھر مولانا مولوی ابو القاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی مدرسہ دار العلوم دیوبند کے خرمن کمال سے عربی کی خوشہ چینی کی اسکے بعد دہلی پہونچے اور مولانا عبد الحی صاحب سے عربی کی تکمیل کی اور وہیں فارغ التحصیل ہوئے۔ اردو۔ فارسی۔ عربی السنۂ ثلاثہ میں قدرت شعر گوئی حاصل تھی اور فن سخن میں فیضان ازل سے تلمذ حاصل تھا درحقیقت جو صاحب کمال "الشعراء تلامیذ الرحمٰن" کے مصداق اپنی طبیعت میں خود جوہر فن رکھتے ہیں وہ دوسروں کے مشورہ سے عموماً مستغنی اور بے نیاز ہوئے ہیں تعلیم سے فارغ ہوکر آپ نے کچھ عرصہ میرٹھ قیام کیا اور پھر بسلسلۂ تدریس دہلی تشریف لے گئے۔ فیلن صاحب جو انگریزی لٹریچر کے مشہور

الشاعر، پرواز اور اُردو۔ انگریزی کے شاعر مانے گئے ہیں ایک اور دو انگریزی لغت کی ترتیب میں مصروف تھے وہ آپ کے محققانہ مشوروں سے بہت کچھ مستفید ہوئے اور آپ کی وسیع النظری سے لغت مرتب ہو گیا۔ اسکے بعد آپ اخبار کوہ نور لاہور کی اڈیٹری کے لئے منتخب ہوئے اور کچھ عرصہ بعد وہاں سے آودھ اخبار لکھنؤ میں بلا لئے گئے۔

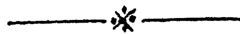
چند سال بعد آپ دوبارہ میرٹھ تشریف لائے اور اپنا ذاتی اخبار شحنۂ ہند اور رسالہ پروانہ جاری کیا اور پھر تا حیات میرٹھ ہی میں توطن اختیار کر کے ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔ آخر ۳۱ دسمبر ۱۹۲۲ء کو ایک ماہ مبتلائے آلام رہ کر ۸۳ سال کی عمر میں انتقال کیا ؏

"خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"

حضرت مولنا کے تبحر علمی کا اندازہ سرسری نظر سے نہیں ہو سکتا۔ آپ کے بلند پایہ و بیش بہا مضامین نظم و نثر و اخلاق، تاریخ، سائنس، ادب، سیاست وغیرہ۔ غرض ہر رنگ میں موجود ہیں، محققانہ تبصرہ و تنقید آپ کا سرمایۂ امتیاز تھا۔ چنانچہ آپ نے خاقانی بیدل، عرفی جیسے جلیل القدر شعرائے فارسی اور متنبی و حماسہ جیسے سخن دانِ عرب کے کلام کی مبسوط و مدلل شرحیں لکھ کر کاملینِ فن سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ نثر کے علاوہ نظم کے بھی آپ ایک مسلم الثبوت اور قادر الکلام اُستاد تسلیم کئے گئے داغ۔ امیر۔ جلال۔ تسلیم وغیرہ کی صف میں آپ کا شمار تھا مگر کلام بہت ادق ہوتا تھا اور زیادہ تر حضرت غالب اور بیدل کے رنگ میں تغزل کا شوق تھا۔ قصیدہ، غزل مرثیہ۔ سلام۔ رباعی۔ قطعہ۔ تاریخ وغیرہ غرض فنِ شعر کی کوئی صنف ایسی نہیں جس میں آپ کے طائرِ فکر کی بلند پروازیوں کا ثبوت نہ ملتا ہو۔ آپ نے طلبا ر الیف۔ اے

بی۔ اے۔ ایم اے۔ کے اصرار سے قصائد متنبی و خاقانی و دیوان غالب و نکات بیدل کی شرح لکھیں جو اس وقت کمیاب ہیں۔ کلیات ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ ادبی مضامین کا ذخیرہ پچاس ہزار صفحات سے زیادہ ہے۔ بھاشا میں آپ کی متعدد نظمیں موجود ہیں جن کے مطالعہ سے حیرت ہوتی ہے۔

غرضیکہ مرحوم نے اپنے دل و دماغ سے کام لے کر اپنی فطرتی طباعی و سخن سنجی کا بہت کچھ ثبوت دیا ہے۔



مولانا سیّد سجّاد حیدر صاحب یلدرم

(۹)

مولانا سید سجاد حیدر صاحب بی۔اے، شرفائے نہٹور ضلع بجنور کی ایک قابلِ قدر ہستی ہیں آپ ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ علوم مشرقی فارسی و عربی کی تکمیل کے بعد آپ نے علوم مغربی کی تعلیم محمڈن کالج علی گڈھ میں پائی اور ۱۹۰۱ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔اے پاس کیا۔ آپ محمڈن کالج کے اُن قابلِ فخر طلباء میں سے ہیں۔ جن پر نہ صرف کالج بلکہ قوم و ملک دونوں کو ناز ہے۔ تین سال تک آپ بغداد شریف میں مقیم رہے۔ بغداد شریف سے واپس آنے پر ڈپٹی کلکٹری کی کرسی نے آپ سے زینت پائی مسلم یونیورسٹی کے مشکلات اور پیچیدگیوں سے متاثر ہو کر آپ نے رخصت حاصل کی اور مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار ہو گئے۔ اور کئی سال تک اس خدمت کو بہت خوش اسلوبی سے انجام دیا اور ۳۱ جنوری ۱۹۲۹ء کو بہت نیک نامی کے ساتھ اس خدمت سے سبکدوشی حاصل کی۔ آپ کے قومی کارنامے اگر ایک طرف آپ کو ملک و قوم کا سچا بہی خواہ ثابت کرتے ہیں تو دوسری طرف آپ کی قلمی خدمات اور دماغی کارگزاریاں آپ کو ادبِ اُردو کا ایک بے لوث، بے غرض اور بے لاگ سرپرست ظاہر کر رہی ہیں۔ آپ نے ممالکِ اسلامیہ خصوصاً ٹرکی کی کئی مرتبہ سیاحت کی اور زبان ٹرکی کے لٹریچر کو اُردو میں منتقل کرنے کی غرض سے آپ ہر وقت منہمک رہتے ہیں، فارسی، عربی، ترکی اور انگریزی زبان پر آپ کی خداداد ذہانت اور مساعی جمیلہ نے آپ کو

اس قابل کیا کہ آج آپ بھی فخر زمانہ کہلانے کے مستحق ہیں۔ آپ کی قابلیت اور علمیت اور اسی کے ساتھ اجتہاد رائے مسلّم ہے۔ قومی سوز و گداز۔ عام ہمدردی۔ بے لوث محبت۔ حقیقی خدمت۔ ایثار نفس۔ علم دوستی۔ صاف گوئی۔ راستبازی قدرت نے آپ میں کوٹ کوٹ کر بھردی ہیں۔ آپ کی انگریزی۔ عربی اور فارسی قابلیت مسلّم ہے آپ کی انگریزی اور اُردو کی زبان دانی کا اقرار تو بہین اہل قلم کو بھی ہے آپ کی تصنیفات سے پتا چلتا ہے کہ آپ کو مختلف ممالک کے قدیم و جدید علوم تاریخ و ادب پر کافی دسترس حاصل ہے اُردو لٹریچر میں جو جدت آپ نے اختیار کی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ قلعۂ معلی کی بیگماتی زبان سُننا چاہو تو آپ کے مضامین اُٹھا کر دیکھو وہی الفاظ، وہی محاورے وہی لب و لہجہ، وہی انداز تقریر، وہی توجدار باتیں، وہی فصاحت، وہی لطافت گویا آپ اپنے کانوں سے کسی خاتون کو گفتگو کرتے ہوئے سُن رہے ہیں، یہی مکالموں کا حال ہے اور یہ ناول نویس کے لئے بہت دشوار گزار منزل ہے فی زمانہ فسانہ نگاری کے جواہرات کو جدید طرز کی دلکش اُردو میں منسلک کرنے کا سہرا آپ ہی کے سر رہا۔ آپ کی موجودہ ادبی خدمات نے دنیائے ادب میں ناموری و عظمت کے وہ جھنڈے گاڑ دیئے ہیں جس کی نظیر نہیں ملتی۔ آپ کو اُردو قصص اور ناولوں میں باعتبار مناسبت الفاظ و محاورہ فصاحت و لطافت وہی درجہ حاصل ہے جو انگریزی زبان میں ڈوان کوئی زوٹ کو حاصل ہے آپ کو شعر گوئی کا شوق ہے۔ لیکن آپ کی علمی عظمت کی کفالت آپ کی دوسری تصانیف سے ہوتی ہے نہ کہ آپ کی چند متفرق نظموں سے، لیکن آپ کے اشعار سے پختگی کلام اور رنگینیٔ خیالات کا کافی ثبوت ملتا ہے اور جو شعر سوز و گداز میں ڈوب کر کہا ہے اور اس سے سننے والوں پر جو اثر پڑتا ہے اس کا مزا اُنکے دل سے

زائل نہیں ہوتا۔ اس وقت آپ کی عمر باون سال کے لگ بھگ ہے۔ مگر کتب بینی کا شوق اس وقت تک آپکی طبیعت ثانیہ بنا ہوا ہے۔ آپ کی تصنیفات و تراجم میں خیالستان، حکایات و احساسات۔ جلال الدین خوارزم شاہ، تالیف بالخیر، زہرا وغیرہ نے وہ شہرت حاصل کی ہے جو فی زمانہ قابلِ رشک ہے، غرضکہ آپ کی ذات ارباب علم و ادب کے لئے سرمایۂ ناز و افتخار ہے۔



خان بہادر سر شیخ عبدالقادر صاحب

(۱۰)

خان بہادر سر شیخ عبدالقادر صاحب کے ، سی ، آئی - ای - ایم - ایل - دبار ایٹ لاء ۱۸۷۴ء میں لدھیانہ میں پیدا ہوئے - آپ کے والد بزرگوار شیخ فتح الدین صاحب مرحوم کسور ضلع لاہور کے ایک معزز خاندان قانون گویاں سے تھے - آپ کی کئی پشتیں شاہان مغلیہ اور گورنمنٹ برطانیہ کے معزز عہدوں پر ممتاز رہی ہیں - آپ کی پیدائش کے وقت آپ کے والد بزرگوار محکمہ مال لدھیانہ کے معزز عہدے پر مامور تھے - آپ اپنے باپ کی اکلوتی اور ہونہار ہستی ہیں - علوم مشرقی کی تعلیم و تربیت کے بعد آپ نے علوم مغربی کی طرف توجہ کی - طالب علمی کے زمانے میں آپ نے بہت سے انعامات اور وظیفے حاصل کئے - اسکول کی تعلیم سے جو وقت بچتا تھا اس میں آپ نے اپنے والد بزرگوار سے فارسی کی پوری پوری تکمیل کی - سولہ برس کی عمر میں آپ کے شفیق باپ کا سایہ آپ کے سر سے اٹھ گیا - چونکہ آپ کا علمی ذوق و شوق فطرتی تھا - اسلئے آپ فورمین کرسچین کالج لاہور میں داخل ہوئے اور مشہور ادیب ڈاکٹر اور جے - سی - ایونگ صاحبان سے تعلیم حاصل کی - اس اثناء میں اردو ماہرین فن کی تصنیفات پر آپنے انگریزی زبان میں بہت کچھ تقریریں کیں جو ادبی دنیا میں بہت مقبول ہوئیں - ۱۸۹۴ء میں آپ نے بی - اے کلاس کا امتحان دیا اور پنجاب یونیورسٹی سے اول درجہ کی کامیابی کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا اور ادبی خدمات کے ذوق و شوق سے مجبور ہو کر ۱۸۹۵ء میں آپ اخبار

آب زرور کے نائب اڈیٹر مقرر ہوگئے اور بلا معاوضہ اس خدمت کو انجام دیتے رہے ۱۸۹۸ء میں اخبار آب زرور کی چیف اڈیٹری کے ممتاز عہدے پر مقرر کئے گئے اور ۱۹۰۴ء تک بڑی مستعدی و خوش اسلوبی سے اس ادبی خدمت کو انجام دیا۔ ۱۸۹۵ء میں ایک ادبی کتاب "دی نیو اسکول آف اُردو لٹریچر" آپ نے پبلک میں پیش کی اور وہ یہاں تک مقبول ہوئی کہ ۱۹۲۱ء میں دو مرتبہ شائع ہوئی۔ ۱۹۰۱ء میں آپ نے اپنی ادارت سے مخزن جاری کیا اور اُردو زبان کی صحیح خدمت کا بار اپنے ذمہ لیا۔ ۱۹۰۴ء میں آپ نے اخبار آب زرور سے قطع تعلق کیا اور بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے انگلستان تشریف لے گئے۔ ۱۹۰۶ء میں آپ انگلستان سے واپس آئے۔ اس دوران سفر میں آپ دادا بھائی نوروزجی اور مسٹر گوکھلے سے برابر تبادلہ خیالات کرتے رہے اور دو مرتبہ فرانس تشریف لے گئے اور فرانسیسی زبان کو سیکھا اور تعطیل کے زمانہ میں پیرس۔ لوئرن۔ میلان۔ وینس۔ قسطنطنیہ۔ بوڈاپسٹ۔ وائنا اور برلن وغیرہ سیاحت تشریف لے گئے اور دارالسلطنت کے حالات و واقعات "مقام خلافت" میں قلم بند کرکے اہل قلم کے سامنے پیش کئے جس پر پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کی طرف سے آپ کو بہت بڑا انعام پیش کیا گیا انگلستان سے واپس آکر دو سال تک دہلی میں بیرسٹری کی۔ اسکے بعد آپ لاہور تشریف لائے اور ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۹ء تک آپ کو پنجاب گورنمنٹ نے سرکاری وکیل کے عہدے پر ممتاز رکھا۔ ۱۹۱۱ء تک آپ نے مخزن کی خدمت کی۔ اور ۱۹۲۰ء تک مخزن کی آنریری اڈیٹری سے مخزن کو زینت بخشی۔ آپ کے دوران اڈیٹری میں انتخاب مخزن شائع ہوا جس کا پہلا، دوسرا حصہ سرکار نظام کے مدارس میں طلبا کو پڑھایا جاتا ہے شمس العلما مولانا نجف عظیم آبادی نے مخزن کے ادبی مضامین کا مجموعہ سول اور ملٹری افسران کی تعلیم کے لئے پیش کیا جو منظور ہوگیا

۱۹۱۷ء میں آپ نے کلکتہ میں اردو کانفرنس کی صدارت کی ۱۹۲۰ء کے آغاز میں آپ نے سرکاری وکیل کے عہدے کو خیرباد کہا اور لاہور ہائی کورٹ میں بیرسٹری کا مشغلہ شروع کیا۔ ۱۹۲۱ء میں آپ عارضی جج ہائیکورٹ کے عہدے پر مقرر کئے گئے اور تین ماہ تک اس خدمت کو انجام دیا۔ ۱۹۲۲ء و ۱۹۲۳ء میں پنجاب یونیورسٹی کی درخواست پر اردو ماہرین فن کی تصنیفات پر مسلسل تقریریں کیں۔ ۱۹۲۳ء کے آخر میں آپ لیجسلیٹو کونسل کے ممبر مقرر ہوئے اور ۱۹۲۵ء میں کونسل کے صدر ڈپٹی ہو گئے اور اس سے قبل یہ عہدہ کسی ہندوستانی کو نہیں ملا۔ صرف آپ ہی کی ذات کو یہ فخر حاصل ہوا اور پھر آپ عارضی وزیر تعلیم بنائے گئے۔ اور ۱۹۲۶ء میں سکریٹری آف اسٹیٹ کے ایماء سے گورنمنٹ آف انڈیا نے لیگ آف نیشن کے ساتویں جلسہ میں ایک نمائندہ کی حیثیت سے آپ کو بھیجا اور دوسری مرتبہ آپ کو یورپ کی سیاحت کا موقع ملا۔ آپ نے میٹرک کولیشن کے اوپر درجوں میں اردو تعلیم دینے کی پوری سعی کی اور پنجاب یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں اردو ایک آپشنل سبجیکٹ ہو گئی اور آپ اسکے ممتحن مقرر کئے گئے۔ ۱۹۲۶ء میں یورپ کی واپسی پر آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی دہلی میں صدارت کی۔ دسمبر ۱۹۲۷ء میں آپ نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی مدراس میں صدارت کی۔ جون ۱۹۲۷ء میں گورنمنٹ برطانیہ نے سرکاری اور قومی خدمات کے صلہ میں آپ کو سر کا معزز خطاب عطا کیا۔

آپ کی علمی، ادبی، اور قومی کارگزاریوں کا تبصرہ جداگانہ مضمون کا محتاج ہے سطور بالا میں آپ کے حالات جو کچھ قلمبند کئے گئے ہیں وہ محض ایک خاکہ ہے۔ آپ کی ذات ہندوستان کے لئے مغتنمات سے ہے اور آپ اعلیٰ درجہ کے ادیب اور مدبر ہیں اگر ہمارے گوش شنوا اور چشم بینا ہوں تو آپ سے بہت سے مفید سبق حاصل ہو سکتے ہیں۔

مولانا شعیب احمد صاحب ندرت

(۱۱)

مولانا شعیب احمد صاحب ندرت ذاتی فضائل و اوصاف سے قطع نظر کرکے نسباً بھی بہت ممتاز درجہ رکھتے ہیں آپ قبلہ مولانا سید احمد حسن صاحب شوکت مرحوم و مغفور کے بیٹے ہیں آپ وسط ۱۸۸۰ء میں بمقام میرٹھ پیدا ہوئے آپ نے اپنے والد مرحوم و مغفور سے فارسی کی تکمیل کی۔ عربی کی ابتدائی تعلیم مدرسہ اسلامیہ میرٹھ میں جناب مولانا قاری محمد اسحٰق صاحب سے حاصل کی اور اسکے بعد تقریباً ڈیڑھ سال مدرسہ حسینیہ دہلی میں جناب مولانا مولوی عبد العلی صاحبؒ سے اکتساب علم میں مصروف رہے وہاں سے واپس آکر مدرسہ قومیہ میرٹھ میں جناب مولانا حاجی محمد عبد المومن صاحبؒ دیوبندی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا اور انھیں سے دستارِ فضیلت حاصل کی۔

ابتدا میں چھ ماہ تک آپ اپنے والد بزرگوار کے مشہور اخبار شحنۂ ہند کے سب اڈیٹر رہے سنہ ۱۹۱۰ء میں ایک ادبی رسالہ (عندلیب) آپکی ادارت میں میرٹھ سے جاری ہوا جو تین چار سال تک جاری رہا۔ اسکے بعد آپ نے ناصر الاخبار میرٹھ کی ادارت کئی سال تک کی۔ اسکے بعد مخزن، تنویر المشرق، شمس بنگالہ، ادیب، العصر وغیرہ ادبی رسائل کے صفحات آپ کے نادر مضامین نظم و نثر سے مزین ہوتے رہے۔ سنہ ۱۹۱۵ء میں رسالۂ نظارہ میرٹھ آپ کی نگرانی سے شائع ہوا اور سنہ ۱۹۱۹ء تک آپ نے نظارہ کی ادبی خدمت مسلسل انجام دی۔ اسکے بعد اپنا ذاتی اخبار آئینہ اگست سنہ ۱۹۲۳ء سے

شائع کیا جواب تک جاری ہے۔

مولانا ندرت میں خداداد قابلیت کا مادہ موجود ہے آپ نے ادبی خدمات ایسی مستعدی سے انجام دی ہیں جس کی نظیر محال کیا معنی ناممکن ہے صحافت میں آپ کا طرز بحیثیت متانت و سنجیدگی ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ آپ نے تجربے، مشاہدے اور معلومات کے تمام درجے بہ سہولت طے کئے ہیں جن پر عبور حاصل کرنا معمولی آدمی کے حیطۂ امکان سے باہر ہے۔ آپ کی بلند نظر اور وسعت خیال کا ثبوت آپ کے کلام کے ملتا ہے۔ آپ کا کلام جذبات سے پُر ہوتا ہے گو اُردو شاعری کو اِس وقت زوال ہے مگر آپ کے مؤثر، دلکش اور پاکیزہ کلام سے ثابت ہوتا ہے کہ اُردو شاعری کو زوال نہیں میں نے زمانۂ عروج کا کلام بھی بخوبی دیکھا ہے۔ اساتذہ کے کلام کے آگے کان پکڑنا ہی مناسب ہے مگر عقیدت کو چھوڑ کر انصاف سے پوچھئے تو مولانا ندرت کا کلام شعرائے متقدمین سے اگر بازی نہیں لے گیا تو کسی طرح کم بھی نہیں ہے۔

مرزا محمد رفیع صاحب سودا

(۱۲)

ولادت ۱۱۲۵ھ وفات ۱۱۹۵ء

آپ کے والد بزرگوار مرزا محمد شفیع صاحب کابل سے بسلسلۂ تجارت ہندوستان آئے۔ یہاں کی دل بستگیوں نے وطن مالوف کو پلٹنے نہ دیا۔ آپ کی ولادت ۱۱۲۵ھ میں عمل میں آئی۔ دہلی میں عربی۔ فارسی علوم کی کامل دستگاہ حاصل کی۔ اول تو سلیمان قلی خاں اور پھر شاہ حاتم کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ سودا نے ایسی مقبولیت عامہ حاصل کی تھی کہ آج اُس کی مثال فصیح الملک داغ مرحوم کے سوا کسی میں نہیں ملتی۔ سودا کی شہرت کا آوازہ اِس قدر بلند ہوا کہ شاہ عالم بادشاہ نے انھیں مشورۂ سخن کی عزت بخشی اور یہ منصب سودا کے لئے ایک زرین تاج تھا۔ مگر سودا معمولی سی بات پر بادشاہ سے ناخوش ہوگئے اور اس رنجش نے یہاں تک طول کھینچا کہ بادشاہ کی اُستادی سے بھی ہاتھ اُٹھالیا۔ اِسکے بعد نواب شجاع الدولہ نے آپ کو لکھنؤ طلب کیا مگر سودا کے دل میں دہلی کی دلچسپیاں جاگزیں تھیں۔ اسلئے لکھنؤ جانا گوارہ نہ کیا۔ گردش زمانہ سے جن اُمراء کی قدردانی کے بھروسہ پر سفر لکھنؤ سے انکار کر دیا تھا وہ پیوند خاک ہوگئے۔ ایسی حالت میں مجبوراً سودا کو لکھنؤ جانا پڑا۔ وہاں نواب شجاع الدولہ نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مگر بدنصیبی سے نواب شجاع الدولہ کی زندگی نے بھی وفا نہ کی اب نواب آصف الدولہ تخت نشین ہوئے۔ اُسی زمانہ میں مرزا فاخر مکیں سے مرزا سودا کی خوب چلی اور مرزا اشرف علی خاں نے اس باہمی چپقلش کو خوب ہوا دی نتیجہ یہ

ہوا کہ مرزا آقا خیر نے شیخ نادرن کو برسرِ پیکار کیا اُن مفسدین نے موقع پاکر ایک دن سودا کے پیٹ پر چھری رکھ دی اور کہا کہ تم نے ہمارے اُستاد کی نسبت سخت کلمات استعمال کئے۔ نواب سعادت علی خاں کی سواری اِدھر سے گزری تو نواب نے یہ حالت دیکھ کر سودا کو اپنے ساتھ لیا اور نواب آصف الدولہ کے پاس لائے اور کہا کہ جس شخص کو والدِ مرحوم لکھنؤ بلانا چاہتے تھے اور وہ نہ آتا تھا۔ آج وہ یہاں آکر ذلیل و خوار ہو رہا ہے۔ نواب آصف الدولہ نے ازراہِ قدردانی اُسی وقت چھ ہزار روپے سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا اور انعام و اکرام اس کے ماسوا عطا کئے اور یہاں تک عزت بخشی کہ جلوت و خلوت میں اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ مرزا سودا کی تصانیف کی ایک مجمل تفصیل یہ ہے :۔

دیوان فارسی۔ ۴۴ مثنویاں۔ دیوان ریختہ۔ عبرۃ الغافلین۔ مجموعہ مراثی۔ تذکرہ شعرائے اردو۔ کلیاتِ سودا۔ نولکشور پریس میں طبع ہوئی تھیں۔ البتہ تذکرہ اس وقت نایاب ہے۔ مرزا سودا پہلے فارسی میں شعر کہتے تھے۔ لیکن خانِ آرزو کے اصرار سے ریختہ کہنے لگے تھے۔ مرزا سودا نے جو مثنویاں کہی تھیں اُن میں سے دو قدیم طرز پر عاشقانہ رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اور باقی مختلف عنوان پر کہی تھیں، مثلاً چھڑی کی تعریف۔ سردی کی ہجو۔ ہاتھی کی ہجو۔ بخیل کی ہجو وغیرہ وغیرہ صنعت قصیدہ گوئی میں مرزا سودا نے وہ مرتبہ پایا جو اُن سے پیشتر کسی کو حاصل نہ ہوا تھا۔ ہجو میں سودا کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ غزلیات میں واہ اور آہ کا فرق ہے یعنی سوز و گداز کے مضامین نہیں پائے جاتے۔

آخر ش مرزا سودا ۱۱۹۵ھ میں بمقام لکھنؤ ستر سال ادبی خدمت کر کے ہمیشہ

کے لئے رخصت ہو گئے۔ اُن کی رحلت کو آج تسو اسو برس سے زیادہ گزر گئے، لیکن اپنے کمال کے باعث اب تک زندہ ہیں اور اُن کا نام بڑے احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے اپنی یادگار تصانیف بے بہا کا کافی ذخیرہ چھوڑا -



میر محمد تقی صاحب میرؔ

(۱۳)

پیدائش ۱۱۲۵ھ   وفات ۱۲۲۵ھ

میر محمد تقی میرؔ اکبرآباد کے ایک شریف اور ممتاز خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ۱۱۲۵ھ میں عالم وجود میں آئے۔ اپنے والد بزرگوار میر عبداللہ صاحب کے انتقال کے بعد دلی آئے اور اپنے ماموں سراج الدین علیخاں آرزوؔ کے دربارِ کمال میں رہ کر پرورش پائی۔ اور عزت و ناموری کے مدارج و منازل طے کئے۔ فکرِ معاش نے اکبرآباد سے دلی کھینچ بلایا، اس وقت دلی مشرقی علوم و فنون کا ایک عظیم الشان مرکز بنی ہوئی تھی۔ حضرت مولٰنا شاہ ولی اللہ صاحب، حضرت مظہر جانِ جاناں صاحب، حضرتِ خواجہ ناصر صاحب عندلیب وغیرہ جیسے بزرگوں کے دم سے دلی کو باب العلوم سمجھا رہا تھا۔ خواجہ دردؔ کے والد بزرگوار خواجہ ناصر سے میر صاحب کے گھرے تعلقات تھے۔ آپ خواجہ ناصر صاحب کے مشاعروں میں شریک ہو کر خراجِ تحسین حاصل کیا کرتے تھے۔ دلی کی بربادی کے بعد لکھنؤ اہلِ کمال کا مرکز بن گیا تھا نواب آصف الدولہ کی فیاضانہ قدردانیوں نے ماہرین فن کو وہاں کھینچ بلایا۔ سوداؔ پہلے ہی پہونچ چکے تھے اب میر صاحب کے لئے بھی لکھنؤ کے سوا دوسری جگہ نہ تھی۔ مجبوراً اپنی چھاتی پر پتھر رکھ کر ۱۱۹۰ہجری میں لکھنؤ پہونچے نواب آصف الدولہ نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور دو سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ میر صاحب فطرتاً نہایت ہی مستغنی المزاج اور توکل پسند اور خوددار انسان تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ

نواب سعادت علی خان نے ایک چوبدار کے ہاتھ خلعت بحالی اور ایک ہزار روپیہ دعوت کا بھیج دیا۔ لیکن میر صاحب نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ یہ گنہگار اتنا محتاج نہیں ہے۔ یہ خفگی اسباب پر ہوئی کہ ایک معمولی آدمی کے ہاتھ انھیں خلعت کیوں بھیجا گیا۔ درحقیقت خودداری اسی کا نام ہے۔ میر صاحب نے خواجہ میر درد کو آدھا اور میر سوز کو پون شاعر مانا ہے۔ البتہ سودا جیسے جامع اور باکمال شخص نے میر صاحب سے پورے شاعر ہونے کی سند حاصل کر لی تھی۔ میر صاحب کی کلیات میں قصائد۔ غزلیات۔ رباعیات۔ قطعات مخمسے۔ ترجیع بند۔ واسوخت اور مثنویوں کا پورا ذخیرہ موجود ہے اور جملہ اصناف سخن پر جاری ہے۔ ان کے علاوہ نکات الشعراء خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ جس میں میر صاحب نے اردو شاعروں کے حالات قلم بند کئے ہیں۔ اگرچہ قصائد بہت کم شائع ہوئے۔ لیکن جو کچھ بھی ہیں وہ متبرک سمجھے جاتے ہیں۔ قصائد کے بعد غزلیات کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔ جس طرح فن منطق کا بانی مبانی ارسطو کو مانا جاتا ہے۔ اسی طرح فن غزل گوئی کا پہلا استاد میر صاحب کو تسلیم کیا گیا ہے۔ غزلیات میں اخلاق و نصائح دنیا کی بے ثباتی، نیرنگی زمانہ اور انقلابات زندگی وغیرہ کی تصویر نہایت سوز و گداز کے ساتھ کھینچی ہے۔ غزلوں کے بعد رباعیات و قطعات اور پھر منقبت میں مخمس و ترجیع بند ہیں جو میر صاحب کے لئے باعث فخر ہیں رباعیات وغیرہ کے بعد واسوخت اور مثنویاں ہیں۔ واسوخت کے موجد خود میر صاحب ہیں اور جو کچھ کہا ہے خوب کہا ہے۔ مثنویاں بہت ہیں۔ شعلہ عشق۔ دریائے عشق۔ نگار خانہ خواب و خیال۔ معاملات عشق۔ علی قدر مراتب سب نے شہرت پائی ہے۔ ہجویں میر صاحب نے بہت کم کہی ہیں۔ تاریخ سے تمام کلیات معرا ہے۔ شاید میر صاحب کو اس سے مناسبت نہ تھی۔ مدحیہ قصائد بھی میر صاحب کی تصانیف میں موجود نہیں جس سے ان کی خودداری

کا کافی ثبوت ملتا ہے ۔ باوجود لکھنؤ کی دلچسپیوں کے دلّی کی یاد اُن کے دل سے محو نہیں ہوئی، اور اکثر اشعار میں دلّی اور دلّی کے احباب کا تذکرہ کیا ہے ۔ آخر نوّے سال کی گردش کے بعد ۱۲۲۵ھ میں میرؔ صاحب کا انتقال ہوا ۔

شیخ ناسخ مرحوم نے مادۂ تاریخِ وفات "واویلا مُرد شہِ شاعراں" سے نکالا ہے ۔



خواجہ میر صاحب درد

(۱۴)

پیدائش ۱۱۳۱ھ ؁ وفات ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ ؁

خواجہ میر نام درد تخلص زبان اردو کے چار رکنوں میں سے ایک رکن تھے ۱۱۳۱ھ ؁ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ مادری خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی سے ملتا ہے خواجہ محمد ناصر صاحب عندلیب آپ کے والد بزرگوار شاہ گلشن سے نسبت ارادت رکھتے تھے۔ یہ خاندان پیری و مریدی کے سبب سے دلی میں نہایت با وقعت خیال کیا جاتا تھا آپ کا دیوان غزلیات، ترجیع بند اور رباعیوں کا ایک مختصر مجموعہ ہے جو اخلاق اور عرفان میں ڈوبا ہوا ہے ہجو سے بالکل پاک ہے۔ اکثر غزلیں سودا و میر تقی کی ردیف و قوافی میں لکھی ہیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اپنے معاصرین میں مساوات کا حق حاصل تھا۔ فارسی میں بھی ایک دیوان کہا ہے مگر وہ بھی مختصر ہے۔ اکثر غزلیں ۷ یا ۹ اشعار سے زیادہ نہیں کہیں۔ کلام میں سادگی و سنجیدگی اور متانت کے علاوہ عرفان و درد بھی ہے۔ آپ نے اپنی تصانیف کا بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے اگر میر کے زمانے کی زبان سننا چاہو تو خواجہ میر صاحب درد کا دیوان اٹھا کر دیکھ لو جو میر و مرزا کی زبان ہے وہی آپ کی زبان ہے۔ میر تقی نے آپ کو آدھا شاعر مانا ہے۔

خواجہ صاحب نے ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ ؁ یوم جمعہ ۶۸ برس کی عمر میں بمقام دہلی انتقال کیا۔ کسی مرید نے آپ کی کیا خوب تاریخ کہی ہے ؎

"حیف دنیا سے سدھارا وہ خدا کا محبوب"

سیّد انشاء اللہ خاں صاحب انشا

(۱۵)

آپ کے والد ماجد میر ماشاء اللہ خاں صاحب مقدر ہندوستان میں نجف اشرف سے آئے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ خطۂ کشمیر کے سادات صحیح النسب سے تھے۔ وہاں کسی زمانہ میں سمرقند سے آئے تھے۔ جنہوں نے امیر الامرا نواب ذوالفقار خاں کے عہد میں دلّی آکر سکونت اختیار کی اور رفتہ رفتہ اُمرائے شاہی میں داخل ہوکر دربار شاہی کے طبیب مقرر ہوگئے۔ سلطنت کی حالت دگرگوں ہونے سے آپ مرشد آباد چلے گئے۔ اور سید انشاء اللہ خاں انشاء وہیں پیدا ہوئے۔ جس طرح اگلے وقتوں میں خاندانی امیرزادے تعلیم پاتے تھے اسی طرح سید انشاء کو بھی فارسی و عربی کی پوری تعلیم دی گئی۔ قدرت نے آپ کے دل و دماغ میں وہ جوہر عطا کئے تھے کہ باید و شاید۔

جب ہندوستان میں انقلاب برپا ہوا تو سید انشاء مرشد آباد سے دلّی آئے اور شاہ عالم بادشاہ نے آپ کو اپنے درباریوں کے حلقے میں داخل کرلیا۔ آپ لطائف و ظرائف سے گل فشانی کرکے محفل کو لٹا دیتے تھے۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ شاہ عالم کو ایک دم کی جدائی بھی ناگوار تھی۔ علامہ تفضل حسین خاں کی سعی سے آپ لکھنؤ آئے اور نواب سعادت علی خاں صاحب کی مصاحبت اختیار کرکے اُن سے ایسے شیر و شکر ہوئے کہ پھر نواب کو آپ کے سوا کسی کی بات میں مزا ہی نہ آتا تھا۔ بسنت سنگھ نشاط کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۳۳ھ میں فوت ہوئے۔ اور اپنی تصانیف کا بہت بڑا ذخیرہ

اپنی یادگار چھوڑا۔ ان میں سے ایک کلیات ہے۔ اسمیں (۱) اُردو غزلوں کا دیوان (۲) دیوان ریختی (۳) قصائد اُردو (۴) قصائد فارسی (۵) دیوان فارسی (۶) مثنوی شیر برنج فارسی (۷) مثنوی فارسی بے نقط (۸) شکارنامہ فارسی (۹) ہجویں (۱۰) مثنوی عاشقانہ (۱۱) ہاتھی دہتھنی کی شادی (۱۲) متفرق اشعار، معمے، رباعیات، قطعے فارسی اُردو وغیرہ۔ تاریخیں، پہیلیاں، چیستانیں (۱۳) دیوان بے نقط (۱۴) مائتہ عامل زبان عربی کی فارسی میں (۱۵) مرغ نامہ اُردو میں۔

(۲) دریائے لطافت قواعدِ اُردو، منطق، معانی بیان وغیرہ میں۔

(۳) ایک داستان نثر اُردو میں ایسی لکھی ہے کہ ایک لفظ بھی عربی، فارسی کا نہیں آنے دیا۔

سید انشا رفن انشا کی قلمرو میں بادشاہِ علی الاطلاق تھے اور اس اعتبار سے انھیں اُردو کا امیر خسرو کہیں تو بے جا نہیں۔



غلام ہمدانی صاحب مصحفی

(۱۶)

غلام ہمدانی نام مصحفی تخلص ولد ولی محمد امروہے کے باشندے تھے۔ عالم شباب میں وطن کو خیر باد کہہ کے دہلی آئے اور تحصیل علم میں مشغول ہوئے بچپن ہی سے غربت اور مسکینی اور ادب کی پابندی فطرتی طور پر طبیعت میں موجود تھی۔ اسی وجہ سے بزرگان دہلی سے ہم جلیس ہونے کا فخر حاصل ہوگیا۔ آصف الدولہ کے زمانہ میں لکھنو پہونچے اور مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں بارباب ہو کر ملازم ہوگئے۔ زبان فارسی اور ضروریات فن سے باخبر تھے اور نظم ونثر کی کتابوں کا مطالعہ کافی وقت تک کیا تھا جس سے معلومات وسیع اور نظر بہت بلند ہوگئی تھی۔ محاورات قدیم میں میر سوز۔ سودا۔ اور میر کا متبع کرتے تھے۔ سید انشا اور جرأت کی نسبت دیرینہ سال تھے۔ سراپا سخن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آمانی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا تھا۔ آپ کے صدہا شاگرد تھے۔ سید انشا، جرأت، میر حسن وغیرہ کے ہمعصر تھے۔ غرض جب تک زندہ رہے لکھنؤ میں رہے اور وہیں ۱۲۴۰ھ میں تقریباً اسی برس کی عمر میں فوت ہوئے آپکی تصنیفات میں اُردو کے سات دیوان مایۂ ناز ہیں جن میں ہزارہا غزلیں اور بہت سے قصیدے اور ابیات اور رباعیات اور معمولی تضمینیں ہیں۔ دو تذکرے شعرائے اُردو کے۔ ایک تذکرہ فارسی کا ایک دیوان فارسی کا لکھا۔ آٹھویں دیوان میں سید انشا کے جھگڑے زیادہ تعداد میں ہیں۔ اکثر غزلیں نہایت سنگلاخ

زمینوں میں کہی ہیں آپ کے کلام میں میر سوز کا انداز اور میر صاحب کی جھلک بھی پائی جاتی ہے قصائد میں شوکتِ الفاظ۔ بلند پردازی۔ فارسی کی عمدہ ترکیبیں اور اُن کی درست نشستیں موجود ہیں، البتہ بندشوں کی چستی اور جوش وخروش کی تاثیر خال خال ہے۔

واقعاتی تاریخیں جس قدر لکھی ہیں خوب لکھی ہیں۔ تمام کلام شوخی سے مبرا ہی جو کچھ کہا ہے اُصول سے ناپ کر اور قواعد سے تول کر کہا ہے۔ ظریفانہ انداز بہت زیادہ قابل ستائش ہی۔ فنِ سخن کو ذریعۂ معاش بنا رکھا تھا۔ اسی وجہ سے آپ کا بہترین کلام نکل جاتا تھا اور پست کلام بچ جاتا تھا۔ طبیعت میں بہت روانی تھی ایک ہی زمین وقافیہ میں صدہا شعر کہتے تھے اور اُن سے مالی فائدہ اُٹھاتے تھے۔ ہجویں جس قدر کہی ہیں زیادہ تر سینہ بہ سینہ چلی آتی ہیں۔ سید انشاؔء سے بہت کچھ معرکہ آرائی رہی ہے اور یا ہمی ہجو کا بازار خوب گرم رہا ہے۔

———※———

شیخ امام بخش صاحب ناسخ

(۱۷)

آپ کے والد شیخ خدا بخش لاہور کے باشندے تھے بنفشہ اور زعفران وغیرہ اشیائے قیمتی کابل و کشمیر کی تجارت کرتے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس دولتمند شیخ نے آپ کو متبنیٰ کیا تھا۔ فیض آباد میں اُن کی قسمت سے یہ ستارا چمکا کہ فلک نظم کا آفتاب ہوا اور اس دولتمند سوداگر شیخ خدا بخش نے اپنی فرزندی میں لیکر ایسا تعلیم و تربیت کیا کہ بڑے ہوکر شیخ امام بخش ناسخ کہلائے اور اس مجازی باپ کی بدولت دنیوی ضروریات سے بے نیاز رہے۔ لکھنؤ کے دار الخلافت ہوجانے کی خوشی میں فیض آباد سے لکھنؤ آئے اور ٹکسال محلہ میں سکونت اختیار کرکے شعر و سخن کے کھوٹے کھرے مضامین کو پرکھنا شروع کیا۔

حافظ وارث علی لکھنوی سے فارسی پڑھی اور علمائے فرنگی محل سے بقدر ضرورت عربی کی تعلیم پائی اگرچہ عربی استعداد فاضلانہ نہ تھی۔ مگر رموزِ فن کی ضروریات سے باخبر تھے اور نظم سخن میں اُن کی نہایت پابندی کرتے تھے۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے مگر ابتدا سے شعر کا شوق تھا۔ ماہرین فن کی یکجائی اور اہل کمال کی صحبتوں سے اُن کی طبیعت خود بخود اصلاح پاتی رہی۔ رفتہ رفتہ خود اصلاحیں دینے لگے بعض سن رسیدہ اشخاص سے سُنا گیا ہے کہ ابتدا میں شیخ مصحفی سے اصلاح لیتے تھے مگر کسی شعر پر ایسی تکرار ہوئی کہ اُن سے مشورہ لینا پسند کر دیا اور تنہا صاحب سے عالم تنہائی میں مشورت کرتے رہے۔ خداداد سرمایہ کی بدولت کسی کی ملازمت اختیار نہ کی اور نہایت خوش حالی سے زندگی بسر کرتے رہے۔ جب آپ پہلی مرتبہ الہ آباد محلہ دائرہ شاہ اجمل میں آئے تو راجہ چندو لال نے بارہ ہزار روپے

بھیج کر بلانا چاہا تو آپ نے لکھ بھیجا کہ اب میں نے سید کا دامن پکڑا ہے اسے نہیں چھوڑ سکتا یہاں سے جاؤں گا تو لکھنؤ ہی جاؤں گا۔ راجہ موصوف نے پھر پندرہ ہزار روپے بھیج کر آپ کو بلایا اور وعدہ کیا کہ میں ملک الشعراء کا خطاب بھی دلواؤں گا اور دربار کی حاضری سے مستثنیٰ کر دوں گا۔ مگر آپ کی آزاد طبیعت نے منظور نہ کیا۔ آپ کو ریاضت کا بہت شوق تھا۔ ویسا ہی ڈیل ڈول بھی رکھتے تھے۔ بلند و بالا فراخ سینہ۔ منڈا ہوا سر۔ کھاروے کا لنگ باندھے بیٹھے رہتے تھے۔ جاڑے میں تن زیب کا کرتہ بہت ہوا تو لکھنؤ کی چھینٹ کا دوہرا کرتہ پہن لیا۔ دن رات میں ایک دفعہ کھانا کھاتے تھے اور اس میں کئی کئی وقت کی کسر نکال لیتے تھے۔ آپ کے تین دیوان ہیں مگر دو مشہور ہیں۔ مدح بہت کم کہی ہے اور ہجو سے ہمیشہ اپنے دامن کو پاک رکھا۔ ایک مثنوی حدیث مفصل کا ترجمہ ہے۔ میر علی اوسط رشک نے اُسے ترتیب دیا ہے۔ ایک مولود شریف بھی آپ کی تصنیف سے ہے۔ آپ کا کلام ظاہری عیبوں اور لفظی سقموں سے بہت پاک ہے۔ غزلوں میں شوکت الفاظ۔ بلند پردازی اور نازک خیالی بہت ہے۔ صائب کی تشبیہ و تمثیل کو اپنی روش میں ترتیب دے کر ایسا کمال کیا ہے کہ بعض موقع پر بیدل اور ناصر علی کی حد تک پہنچ گئے۔ دیوان کے آخر میں بہت سی عمدہ تاریخیں ہیں۔ سنہ ۱۲۵۴ھ میں فوت ہوئے۔ بعض کہتے ہیں کہ ۶۴-۶۵ برس کی عمر تھی مگر کئی نکلتے ہیں کہ تقریباً سو برس کی عمر ہوگی۔

خاقانیِ ہند شیخ محمد ابراہیم صاحب ذوق دہلوی

(۱۸)

پیدائش ۱۱ر ذی الحجہ ۱۲۰۴ھ　　　　وفات ۲۴ر صفر ۱۲۷۱ھ

حضرتِ ذوق کے والد شیخ محمد رمضان دلّی کے ایک غریب سپاہی تھے۔ کابلی دروازہ میں رہتے تھے۔ ۱۱ر ذی الحجہ ۱۲۰۴ھ کو ذوق نے اس دنیا میں قدم رکھا حافظ غلام رسول صاحب شوق کے آگے زانوئے ادب تہ کیا۔ فارسی و عربی وغیرہ میں اُنھیں سے دستگاہ حاصل کی۔ جب شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا تو ابتدا ءً خود ہی کچھ موزوں کر لیتے تھے۔ مگر کسی کو دکھاتے نہ تھے جب کچھ جھجک کم ہوئی تو حضرتِ شوق ممدوح سے اصلاح لینے لگے۔ مگر اُن سے کچھ تسکین خاطر نہ ہوئی تو یہ شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے فی الحقیقت شاہ نصیر کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کے بعد اُنھیں وہ عزت و وقعت حاصل ہوئی جو آج تک اُن کے نام سے وابستہ چلی آتی ہے۔ شاہ نصیر شاعری میں بہادر شاہ ولی عہد کے اُستاد تھے لیکن جب وہ دکن چلے گئے تو یہ خدمت میر کاظم حسین بیقرار دہلوی کے سپرد ہوئی۔ میر بیقرار، ذوق کے ہم مکتب اور خواجہ تاش کے بھائی تھے میر کاظم حسین کو مسٹر جان الفنسٹن کے میر منشی ہونے کے بعد قلعہ کے تعلقات سے مجبوراً کنارہ کشی اختیار کرنا پڑی۔ شاہ نصیر پہلے ہی دکن چلے گئے تھے اب بہادر شاہ کی غزلیں کون دیکھ سکتا تھا آخر ذوق پر ہی نظر انتخاب پڑی۔ بہادر شاہ کے اُستاد ہو جانے سے ذوق کی شہرت کو چار چاند لگ گئے اور بڑا فروغ پایا لیکن مالی نفع زیادہ نہ تھا صرف چار روپے ماہوار ملتے تھے جو اُن کی خور و نوش کے لئے ناکافی تھے۔ مگر مؤلف

کو اس پر اعتراض ہے۔ اگرچہ اُس زمانے کے چار روپے آج کل کے پچیس روپے کے مساوی ہیں تاہم اُستادِ شاہ کے لئے اتنی قلیل تنخواہ مُغلیہ خاندان کی فیاضیوں کے دامن پر ایک دھبّہ ہے۔ بہر حال عیدین اور دوسری تقاریب پر تہنیتیں، قصیدے پیش کرنے پر خطابات، خلعت، جاگیر اور دیگر قسم کے انعامات سے ذوق کی اُس کمی تنخواہ کی پوری پوری تلافی اور بہت افزائی ہو جاتی تھی۔ ذوق کے فرزند خلیفہ شیخ اسمٰعیل باغات شاہی کے محافظ تھے اور بہادر شاہ کے دربار میں اُن کی خاصی وقعت تھی۔ ذوق کی عمر ۱۹ سال کی تھی کہ مرزا ابوظفر بہادر شاہ کے ہاتھ میں عنانِ حکومت آئی۔ ذوق نے ایک قصیدہ مدحیہ پیش کیا جس پر تنخواہ میں اضافہ ہوا۔ کچھ دنوں بعد بہادر شاہ کے غسلِ صحت پانے پر آپ نے ایک قصیدہ پیش کیا جس پر بہادر شاہ نے خطاب خاقانی بہادر کے علاوہ ایک خلعت اور ایک ہاتھی مع حوضۂ نقرئی عطا کیا اس کے بعد ایک قصیدہ اور پیش کیا جس کے صلہ میں بہادر شاہ نے ایک گاؤں جاگیر میں عطا فرمایا۔

صفر ۱۲۷۱ھ کی ۲۴ تاریخ اور جمعرات کا دن تھا کہ اس فرماں روائے ملکِ سخن نے ۱۷ دن بیمار رہ کر اس عالمِ فانی سے ملکِ جاودانی کی طرف رحلت کی۔ ذوق کے علمی و ادبی کارنامے ایسے ہیں کہ اُن کا نام قیامت تک زندہ رکھیں گے۔ خصوصاً قصائد کے میدان میں تو جھنڈا ہی گاڑ دیا ہے۔ مرنے سے کچھ روز پیشتر یہ شعر کہا تھا؎

"کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے"

ابتدائی تعلیم تو جیسی کچھ ہوئی تھی وہ چنداں قابلِ تذکرہ نہیں لیکن انھیں تحصیلِ علوم و فنون کا بے حد شوق تھا چنانچہ اپنی ہی کوشش سے انھوں نے مروجہ السنۂ مشرقی کی تحصیل و تکمیل کی تاریخ۔ تفسیر۔ تصوف۔ موسیقی۔ نجوم۔ رمل۔ ان سب میں ذوق نے

مہارت تامہ اور واقفیت کاملہ حاصل کی تھی، لیکن ۳۶ سال کی عمر میں تمام "منہیات" سے توجہ منقطع کی اور اس توبہ کی تاریخ کہی ع

"اے ذوق بگوسہ بار توبہ"

مشاعرے میں شاہ نصیر کے ایما سے ذوق کے کلام کی گرفت ہوتی تھی مگر ذوق دندان شکن جواب سے معترضین کا منھ بند کر دیتے تھے۔ شاہ نصیر و ذوق کے جھگڑوں کی تفصیل "آبِ حیات" میں موجود ہے۔

حق یہ ہے کہ ذوق کا کلام بہ اعتبار مشاقی و طباعی آپ ہی اپنی نظیر ہے۔ پختگیٔ خیال سنرلت کلام۔ صفائیٔ زبان۔ غرض ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے۔ شاہ نصیر ذوق کے اُستاد تھے اور شاگرد کا اُستاد کا ہمعصر ہو جانا بھی کچھ کم فخر کی بات نہیں۔

———— ✻ ————

نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں صاحب غالبؔ دہلوی

(۱۹)

تاریخ پیدائش ۸ رجب المرجب ۱۲۱۲ھ　　　تاریخ وفات ۲ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ

آپ ۸ ماہ رجب المرجب ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوئے۔ یہ ایبک قوم کے ایک ترک تھے اور ان کا سلسلۂ نسب تورابن فریدوں تک پہونچتا ہے سلجوقیوں کے انتزاع کے بعد ان کے جد امجد ہندوستان آئے شاہ عالم کا زمانہ تھا اور سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا آپ کو ایک فوجی عہدہ پر مامور کیا گیا۔ جب سلطنت کا آفتاب ڈھلنے لگا تو غالبؔ کے والد بزرگوار مرزا عبد اللہ بیگ تلاش معاش میں لکھنؤ آئے اور آصف الدولہ کے خوان نعم پہ کچھ عرصہ تک ریزہ چینی کرتے رہے وہاں سے بزمانہ نواب نظام علیخاں حیدرآباد دکن مراجعت کی یہاں بھی فوجی خدمت فوری مل گئی۔ کچھ عرصہ بعد دکن سے آگرہ چلے آئے اور راجہ بختاور سنگھ والی الور نے اپنے یہاں فوجی خدمت پر مامور کیا اور وہیں ایک معرکہ میں کام آگئے۔ راج گڑھ میں مدفون ہوئے۔ اسوقت غالبؔ کی عمر پانچ سال کی تھی۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے پر غالبؔ کی خورد پرداخت اُن کے چچا نصر اللہ بیگ نے کی لارڈ لیک کے زمانہ میں اُن کے چچا سرکاری فوج کے رسالدار تھے۔ فوجی خدمات کے صلہ میں اُن کو ضلع آگرہ میں دو پرگنے ملے جن کے محاصل سے خوشحالی کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرتے رہے۔ تا عالم بلوغ تک غالبؔ آگرہ میں مقیم رہے۔ ۱۲۲۵ھ میں جب ۱۳ سال کے ہوئے تو اُن کی شادی نواب مرزا الٰہی بخش معروفؔ کی صاحبزادی کے ساتھ ہوگئی اور اس طرح اِن دو دو حول

کے باہم منسلک ہونے سے غالب کی آمد و رفت کا سلسلہ دہلی ہوگیا اور آخر کار مستقل طور پر دہلی میں سکونت پذیر ہوئے۔ دہلی گو اسوقت مٹ چکی تھی مگر سسرال کی محبت اور نئے اعزا کی کشش کے علاوہ ایک بات غالب کو دہلی کھینچ لائی کہ ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ کو فن شعر سے خاص دلچسپی تھی اور اُنہوں نے باکمال شعراء کو اپنی طرف جذب کر لیا تھا جب تک ذوق زندہ رہے۔ ظفر کو اصلاح دیتے رہے انکے انتقال کے بعد یہ عزت غالب کو نصیب ہوئی۔ چنانچہ ۱۲۶۶ھ میں بادشاہ نے انھیں نجم الدولہ دبیر الملک، نظام جنگ کے خطاب اور چھ پارچہ خلعت سے سرفراز فرمایا۔ خاندان تیموریہ کی تاریخ مرتب کرنے کا اہم کام ان کے سپرد کیا گیا اور پچاس روپے ماہوار تنخواہ بطور وظیفہ مقرر ہوگئے اور خاص خاص موقعوں پر بادشاہ کی جانب سے ہدایا اور تحائف آیا کرتے تھے مگر گردش زمانہ سے بسا اوقات غالب کو وقت پر کبھی وظیفہ نہیں ملتا تھا دو سال تک بہت تکلیف سے بسر کی پھر رام پور کے علم دوست اور سخن پرور نواب یوسف علی خاں مرحوم نے حق اُستادی کے معاوضہ میں اُن کا سو روپے مشاہرہ کا استمراری وظیفہ مقرر کر دیا جو اُن کے دم واپسین تک بدستور جاری رہا۔ نواب یوسف علیخاں مغفور والی رام پور کے انتقال کے بعد جب مرزا غالب رام پور تشریف لے گئے تو نواب کلب علی خاں نے بھی ان پر خاص عنایت فرمائی اور سابقہ وظیفہ بدستور بحال رکھا۔ سرکاری پنشن سات سو روپیہ سالانہ جو بزمانۂ غدر تین سال تک بند ہو گئی تھی پھر جاری ہوگئی اور یہ دونوں رقمیں غالب کی متوسط زندگی بسر کرنے کے لئے کافی تھیں۔
غدر کے بعد جب اُنھیں فاقہ کشی کی نوبت پہونچی تو اُن کی خبر گیری اُنکے ہندو احباب و تلامذہ کرتے تھے۔ منشی ہرگوپال تفتہ خصوصیت سے مرزا غالب کے ساتھ سلوک ہوتے تھے

غالب کے سات بچے ہوئے مگر سب نے داغِ مفارقت دیا۔ زین العابدین عارفؔ جو ان کی بیوی کے رشتہ سے بھانجے ہوتے تھے، اِن کو غالبؔ اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے عین عنفوانِ شباب میں گزر گئے اِس صدمۂ جاں کاہ سے غالبؔ بہت نحیف و لاغر ہو گئے یہاں تک کہ چلنا پھرنا دشوار ہو گیا۔ ہر وقت پلنگ پر لیٹے رہتے تھے مرنے سے قبل یہ شعر ورد زباں تھا

دم واپسیں بر سرِ راہ ہے عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

آخر میں مصائب سے نجات پانے کا وقت بھی آ گیا اور ۲ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ ہجری مطابق ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو اِس دارِ ناپائدار سے ۷۳ برس ۴ ماہ کی عمر میں راہیِ ملکِ جاودانی ہوئے۔ اور حضرت سلطان نظام الدین قدس سرہٗ کی درگاہ میں ہمیشہ کے لئے آرام فرمایا "آہ غالب بمرد" مادۂ تاریخِ وفات ہے۔

پچھلے دنوں غالبؔ کا مزار بیوندِ خاک ہونے کو تھا نواب احمد سعید خان صاحب طالبؔ نے اس کی از سرِ نو مرمت کرائی اور غالبؔ کی یادگار کو تعمیر کی صورت میں قائم رکھا ہندوستان میں امیرؔ خسروؔ و فیضیؔ کے بعد فارسی کلام میں غالبؔ ہی کا مرتبہ تھا ۱۸۴۹ء میں آپ کا اردو دیوان مرتب ہو کر شائع ہوا۔ نثر میں آپ کے رقعات کے دو مجموعے یادگارِ زمانہ ہیں۔ ایک عودِ ہندی۔ دوسرا اردوئے معلی۔ غالب کو جو عبور و قدرت فارسی زبان پر تھی اسی کی جھلک اُن کے ابتدائی کلام میں پائی جاتی تھی۔ الغرض غالبؔ نے تاریخِ اردو میں اپنی عظمت و شہرت کے وہ پائدار نقوش چھوڑے ہیں۔ جو آنے والی نسلوں کو غالبؔ کی ضَو فشانی سے باخبر کرتے رہیں گے۔

مرزا سلامت علی صاحب دبیرؔ

(۲۰)

پیدائش سنہ ۱۲۲۰ھ   وفات ۲۹ محرم سنہ ۱۲۹۲ھ

مرزا سلامت علی دبیر کو سنہ ۱۲۲۰ھ نے آغوشِ ہستی میں لیا۔ آپ خاندانی شاعر نہ تھے تحصیل علومِ عربی و فارسی سے انفراغ کامل حاصل کرکے آپ کو ابتدا میں مرثیہ خوانی کا شوق پیدا ہوا اور اس فن کو عرشِ معلیٰ پر پہونچا دیا۔ آپ میر مظفر حسین ضمیرؔ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور اس فن کی پوری تکمیل کرنے کے بعد یہاں تک شہرت حاصل کی کہ میر ضمیر کو آپ کی خداداد ذہانت پر رشک پیدا ہوا۔ مزید براں آپ کی سلامت روی۔ پرہیز گاری مسافر نوازی۔ سخاوت، منکسر المزاجی نے اس قدر مقبولیت عامہ حاصل کی تھی کہ جس کے اظہار کے لئے الفاظ میسر نہیں ہوسکتے۔ مضامین کی بلاغت۔ غم انگیز اشارات۔ دلگداز انداز اور مناظرِ قدرت کے ساتھ مضمون آفرینی و استعارات کا جوہر دکھانا اور اس رنگ میں اپنے اُستاد کا تتبع کرنا۔ صبح کا عالم۔ گرمی کی شدت۔ فوجوں کی آمد۔ جنگ کی تیاری گرمی سے بچنے کی تدابیر۔ فوجوں کا داخلہ میدان جنگ ہنگامۂ رزم۔ فوج کی صف آرائی۔ دو حریفوں کی نبرد آزمائی۔ فنون جنگ، گھوڑے کی تعریف۔ تلوار کی تعریف۔ نفرتِ دنیا۔ محبت عقبیٰ اور کسی مرثیہ کی ابتدا میں تمام ہمراہیوں کا شہید ہونا۔ اور اُس کے بعد عزیزوں کا یکے بعد دیگرے فدا ہونا۔ بچوں کا جامِ شہادت پینا۔ پھر امام عالی مقام کا رن کی اجازت کے واسطے خیمہ میں آنا۔ ان واقعات کو آپ نے بلاغت و شوکتِ الفاظ کے ساتھ نہایت دردناک طرز میں نظم کیا ہے

مرزا دبیر نے اکثر جگہ شب عاشورہ کا جگر خراش واقعہ یار و انصار کا دوپہر تک قتل ہوتے رہنے۔ پھر حضرت علی اصغرؑ کا شہید ہونا۔ اور خصوصاً حضرت بانوؑ کا بین تو نہایت ہی دردناک طور پر نظم کیا ہے۔ آپ نے ۷۲ سال کی عمر میں کم از کم تین ہزار مرثیے لکھے ہونگے۔ سلاموں۔ اور نوحوں، اور رباعیوں کا کچھ شمار نہیں۔

۲۶ محرم ۱۲۹۲ھ کو آپ کی روح لطیف نے جسم خاکی سے مفارقت اختیار کی علمائے کرام اور عمائد شہر آپکی تجہیز و تکفین میں شریک تھے۔ اس وقت مرزا دبیر ہماری آنکھوں سے پنہاں ہیں مگر وہ ایسی یادگار چھوڑ گئے ہیں جو قیامت تک اُن کے نام کو زندہ رکھے گی۔



میر ببر علی صاحب انیس

(۲۱)

پیدائش ۱۲۱۶ھ وفات ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ

میر ببر علی انیس کے والد بزرگوار میر مستحسن خلیق ابن جد اعلیٰ میر حسن دہلوی تھے میر حسن دہلوی کے والد میر ضاحک اور جد امجد میر امامی ہروی رحمۃ اللہ علیہ تھے جو ہرات سے آکر پرانی دلی میں آباد ہوئے تھے ۱۲۱۶ھ میں آپ بمقام فیض آباد پردہ عدم سے عالم وجود میں تشریف لائے۔ لکھنؤ میں تربیت پائی اور عربی و فارسی میں دستگاہ کامل حاصل کرنے کے بعد ضروریات فن میں اپنے شفیق باپ سے مشورہ کیا اور انھیں سے خاندانی کمال حاصل کیا۔ ابتدا میں آپ کو غزل گوئی کا شوق تھا مگر اپنے والد بزرگوار کی نصیحت سے اثر پذیر ہو کر غزل گوئی کو سلام کیا اور اس صنف سخن پر توجہ فرمائی جو دین و دنیا میں کام آنے والا سرمایہ ہے۔ میر انیس کے دو بھائی اور تھے میر نواب مونس میر مہر علی انس میر مونس لاولد تھے اور میر مہر علی انس کے فرزند میر وحید اپنے وقت کے استادان فخر سلف تھے۔

میر انیس کے تین صاحبزادے تھے۔ میر خورشید علی نفیس میر محمد سلیس میر عسکری رئیس سن و سال کے علاوہ فن کے اعتبار سے بھی میر انیس اپنے تمام بھائیوں میں ممتاز تھے آپ کے مراثی کو بالاستیعاب دیکھتے ہوئے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ آپ نے اپنے قابل فخر بزرگوں کا نام اچھی طرح روشن کیا ہے۔ گویا ابھی تک مرثیہ گوئی آپ کے خاندان کا حصہ ولی

ترکہ ہی۔ آپ کا انداز بیان نہایت ستھرا سلجھا ہوا۔ تعقید سے مُبرا۔ سلاست فصاحت حُسن محاورات سے لبریز اور اس درجہ مقبولیت عامہ حاصل کر چکا ہی جو مرزا دبیر کو میسّر نہیں ہوا مناظرِ قدرت کی تصویر کھینچنا آپ کا حصہ تھا صبح کا عالم سیاہی کا پھٹنا، نور کا ظہور، آفتاب کا طلوع۔ مرغزار کی بہار۔ شام کی اداسی۔ شب کی رخصت کا سماں۔ رات کا سناٹا۔ تاروں کی چھاؤں کو چاندنی اور اندھیرے کے ساتھ رنگ برنگ سے دکھانا۔ گرمی کی تیزی۔ اس میں لوؤں کا چلنا۔ خاک اُڑنا۔ ظہر کا وقت۔ فوجوں کا اُمنڈنا۔ رزمیہ منظر اور اس میں معرکہ کا زور و شور۔ تلاطم۔ ہنگامہ کے ساتھ ہل چل شور و غل۔ نقاروں کی صدا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز۔ ہتیاروں کی جھنکار۔ تلواروں کی چمک دمک۔ تیروں کی سن سناہٹ۔ کمانوں کا تڑکنا۔ نفیریوں کا گرجنا پھر بہادروں کا استقلال کے ساتھ جنگ میں جانا۔ باہم معرکہ آرائی کرنا۔ فنون جنگ دکھانا اور اسکے ساتھ اسلحہ جنگ اور دیگر سامانِ جنگ کی الگ الگ تصویر کھینچنا۔ اور پھر فتح و شکست کی دو متضاد صورتیں بیان کرنا اور پھر اس صورت سے بیان کرنا کہ سننے والوں کا دل ہلجائے اور اُن کو معلوم ہو کہ گویا ہم معرکۂ جنگ میں خود شریک ہو کر یہ واقعات بچشم خود دیکھ رہے ہیں۔

غرض کہ میر انیس مداحِ آلِ رسول ہونے کی حیثیت سے شاعری میں وہ ناموری و عظمت حاصل کر چکے ہیں جس کی نظیر نہیں ملتی۔ گویا قدرت نے مرثیہ گوئی کا اُن پر خاتمہ کر دیا اور خاتم الکلام کا لقب عطا کیا۔ غرض جس حالت کو دکھایا ہے اُس کا سماں باندھ دیا ہے۔ میر صاحب نہایت نیک مزاج۔ مہذب و متین تھے۔ کتابی چہرہ۔ سڈول منھ گندمی رنگ۔ کرنجی آنکھیں اور گول بدن تھے ضعیفی کے باعث کمر کسی قدر خم

ہو چلی تھی۔ ہاتھ میں چاندی کی شام کی جریب۔ انگلیوں میں فیروزے انگوٹھیاں لباس میں دہلی کا تتبع کرتے۔ ڈھیلی مُہری کا پائجامہ۔ گھٹنوں تک مہین شربتی کا کرتا نیچی کمر تولی کا جامدانی انگرکھا۔ چوگوشیہ ٹوپی ڈاڑھی منڈی ہوئی۔ مونچھیں بڑی بڑی اور یہی وضع ان کے جدِ امجد میر حسن کی تھی۔ چہرے سے رعب و متانت کے آثار ظاہر ہوتے تھے۔ سبزی منڈی سے ہو کر چوک میں اشیاء ضروری خریدنے کو تشریف لے جاتے تھے۔ ایک ملازم ضرور ساتھ ہوتا تھا اور زمانہ کے انقلاب سے متاثر ہو کر ۷۴ سال بعمر ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ بروز چہارشنبہ بمقام لکھنؤ اس جہانِ فانی سے عالم باقی کی طرف رحلت فرمائی اور اپنی یادگار تصانیفِ بے بہا کا کافی ذخیرہ چھوڑا۔

---※---

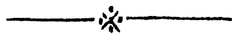
میر مہدی حسین صاحب مجروح

(۲۲)

میر مہدی حسین، مجروح ایک خوشگوار شاعر میر حسین نگار کے بیٹے تھے۔ دلّی میں دلی کے بعد سودا اور میر نے جو محفل قائم کی تھی اور جس کی صدارت کی عزت انشا۔ شاہ نصیر ذوق۔ غالب کے حصہ میں یکے بعد دیگرے آئی تھی اسی محفل کی مجروح آخری شمع تھے۔ مجروح کے عالم طفلی میں دلّی گلزار تھی اور غالب۔ ذوق۔ مومن۔ آرزو۔ شیفتہ۔ صہبائی نیر وغیرہ جیسے باکمال اپنی نغمہ سنجی کے ترانے گا رہے تھے۔ ان اہل کمال کی صحبت نے مجروح کے طبعی شوق کو چار چاند لگا دیئے۔ اُستاد بھی نصیب سے غالب ملے جن کا نظیر دنیائے شاعری میں اُردو آج تک نہ پیدا کر سکی اور جو افادے حضرت غالب سے حاصل کئے اُن سے تمام طالبانِ کمال کو مستفید کیا۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد مجروح دلّی سے پانی پت گئے اور کچھ زمانے تک انصاریہ محلہ میں مقیم رہے۔ مہاراجہ الور کی طلبی پر الور گئے۔ مجروح کے بھائی سید سرفراز حسین مہاراجہ شیودان سنگھ والی الور کے مصاحب تھے۔ میر مجروح کو نائب تحصیلداری اور پھر تحصیلداری کے عہدے پر ممتاز کیا۔ مہاراجہ کے انتقال کے بعد جے پور رہے اور وطن کی کشش سے مجبور ہو کر دہلی آئے۔ حضرت حالی میر مجروح کے اُستاد بھائی تھے ایک استاد کے دو شاگرد ایک ہی زمانہ دیکھے ہوئے ایک ہی قسم کی تعلیم پائے ہوئے تھے جذبات و خیالات میں ایک دوسرے سے بے تعلق ہونے کے باوجود کبھی کبھی ہم آہنگ بھی ہو جاتے" تھے

مجروح کی قوتِ متخیلہ کی بلند پروازی گویا آسمان سے تارے توڑ کر لاتی تھی۔ حق یہ ہے کہ مجروح کے کلام میں ذوقیات کی حلاوت اِس درجہ موجود ہے کہ دل اُس کے مزے میں پڑ کر کسی اور طرف مائل نہیں ہوتا۔ زبان کے لحاظ سے مجروح کا دیوان اُردو لٹریچر کا بہترین کارنامہ ہے۔ خیالات کی نیرنگی اور تخیل کی گوناگونی مجروح کی غزلیات کو گلزار بنائے ہوئے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا تاریخ مشاعرہ جو مولانا حسرت کی کوشش کا نتیجہ تھا مجروح کی شرکت کا آخری جلسہ تھا۔ ۱۵ ر اکتوبر ۱۹۰۲ء کو دنیا کی مکروہات سے کنارہ کر کے درگاہِ قدم شریف کے عین زیرِ فصیل عیش و آرام کی میٹھی نیند سو رہے ہیں۔



منشی امیر احمد صاحب امیرؔ مینائی

پیدائش ۱۶ شعبان المعظم ۱۲۴۳ھ (۲۴۳) وفات ۱۹ جمادی الآخر ۱۳۱۸ھ

منشی مفتی امیر احمد صاحب امیرؔ مینائی مولوی کرم محمد صاحب مینائی کے چھوٹے صاحبزادے تھے ۱۶ شعبان المعظم ۱۲۴۳ھ میں بروز دوشنبہ بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے آپ کا سلسلۂ نسب حضرت مخدوم شاہ مینا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے متناہی ہے اسی اعتبار سے آپ مینائی مشہور ہوئے اس وقت شاہ نصیر الدین حیدر کا زمانہ تھا۔ آپ کے والد ماجد مولوی کرم محمد صاحب علوم عربی و فارسی کے ایک متبحر عالم تھے کتب درسیہ متداولہ عربیہ کی ابتدائی تحصیل اپنے والد ماجد سے کی اور پھر علمائے فرنگی محل کے علاوہ حاجی مفتی محمد سعد اللہ صاحب مرحوم خلف الرشید مولوی محمد نظام الدین صاحب مغفور مرادآبادی اور مفتی صدر الدین خاں آرزوؔ دہلوی کے خرمنِ علم سے پوری پوری خوشہ چینی کی اور فنونِ جفر و نجوم کو بھی باقاعدہ حاصل کیا تھا۔ خاندانِ چشتیہ صابریہ میں قطب الارشاد حضرت امیر شاہ صاحب قدس سرہٗ صاحبِ سجادہ سے شرف بیعت حاصل کیا اور خرقۂ خلافت بھی اُنھیں سے مرحمت ہوا۔ فن سخن میں منشی مظفر علی خاں اسیرؔ لکھنوی سے تلمذ تھا۔ حضرت اسیرؔ شیخ مصحفیؔ کے مایۂ ناز شاگرد تھے تدبیر الدولہ، دبیر الملک کے دو خطاب سلطنت اودھ سے عطا ہوئے تھے اور حضرت اسیرؔ کی بدولت اودھ کے آخری حکمراں واجد علی شاہ کے دربار سے تعلق ہو گیا تھا اور مصاحبینِ شاہی کے زمرہ میں داخل ہو گئے تھے ۱۲۷۵ھ میں جب کہ غدر ۱۸۵۷ء کی قیامت آفرین شورش مٹ چکی تھی اودھ کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا تو آپ رامپور تشریف لائے آتے ہی نواب یوسف علی خاں ناظمؔ کی قدر شناسی اور بروقت فیاضی نے فکر

معاش سے فارغ البال کر دیا اور مفتیِ عدالت کا معزز عہدہ عطا کیا اسکے بعد مشورۂ سخن کی عزت بھی بخشی۔ اس وقت امیر صاحب کی وضع نہایت سادہ اور درویشانہ تھی سر پر لکھنؤ کی چوگوشیہ ٹوپی گھنٹوں سے نیچا کرتہ کبھی کبھی اس پر صدری بھی پہن لیتے تھے لکھنؤ کی قدیم وضع کا پائجامہ اور کبھی گلبدن کا بھی پہنتے تھے اکثر ہاتھ میں تسبیح ہوتی تھی دربار جاتے تھے تو عبا یا چغہ زیب تن فرماتے تھے نواب ناظم کے بعد ۱۲۸۱ھ ہجری میں نواب کلب علی خاں مرحوم کی قدر دانی نے آپ کے مرتبۂ عزت کو اور بھی فروغ دے دیا۔ داغ جلال۔ امیر۔ تسلیم۔ حیا۔ بحر۔ قلق۔ منیر۔ عروج وغیرہ بھی نواب کلب علی خاں کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے ایسے باکمال حضرات کی موجودگی میں نواب کلب علی خاں کو اپنی استادی کے لئے امیر مینائی کا منتخب کرنا آپ کی امتیازی شان کا ایک نمایاں ثبوت ہے۔ نواب کی آنکھ بند ہوتے ہی یہ شیرازہ بکھر گیا جس کا منھ جدھر اٹھا چلا گیا ۱۹۰۰ء میں نواب میر محبوب علیخاں مرحوم و مغفور والیِ دکن نے بھی دورانِ سفر کلکتہ میں امیر صاحب کو بمقام بنارس شرف باریابی بخشا اور الطافِ خسروانہ سے سرفراز فرمایا۔ ۴۳ سال رام پور کے قیام کے بعد ۱۰ جمادی الاول ۱۳۱۸ھ کو امیر مینائی مع خلف اوسط منشی لطیف احمد اختر و شاگرد رشید حافظ جلیل حسن جلیل مانک پوری حیدر آباد تشریف لے گئے اور فصیح الملک نواب مرزا خاں صاحب داغ دہلوی نے آپ کو افضل گنج میں اپنے مکان پر ٹھہرایا۔ ابھی صعوبات سفر اور کسل راہ سے ہوش بجا نہ ہوئے تھے کہ امیر مینائی ایک مہینہ نو روز مبتلائے آلام رہ کر ۷۳ برس ۱۰ ماہ کے سن میں بتاریخ ۱۹ جمادی الآخر ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء بمقام حیدر آباد دکن جاگزیں خلد بریں ہوئے۔

امیر مینائی کے بہت سے رسائل و مسودات غیر مرتب ہنگامۂ غدر میں تلف ہو گئے تھے

اس لئے جو تحریریں ترتیب پاگئیں اور جو کتابیں شائع ہوگئیں اُن کا ذکر بیاں کیا جاتا ہے۔
ارشاد السلطان و ہدایت السلطان یہ دونوں کتابیں غدر سے قبل تصنیف فرما کر واجد علی شاہ کے حضور میں پیش کیں جن پر خلعت و انعام مرحمت ہوا تھا۔ غیرت بہارستان یہ ابتدائی کلام غدر میں تلف ہوگیا جس میں لکھنؤ کے شاعروں کی غزلیں اور مدحیہ قصائد تھے۔ سرمۂ بصیرت میں الفاظ عربی و فارسی جو غلط زبان زد اور مستعمل ہیں انکی تصحیح فرمائی۔ بہار ہند اس میں اردو مصطلحات و محاورات کو ایک جگہ جمع کیا ہے۔ نور تجلی۔ ابر کرم یہ دونوں مثنویاں حکایات و روایات۔ اخلاق و معرفت میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ ذکر شاہ انبیاء یہ نعتیہ مسدس ہے جس میں حال ولادت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ داسوخت اردو۔ شکایت رنجش۔ غبار طبع۔ تجدید غبار۔ صفیر آتشبار۔ بانگ اضطرار۔ یہ ۶ داسوخت ۱۲۸۴ھ میں تصنیف کئے تھے۔
محامد خاتم النبیین میں شعراء رام پور کا تذکرہ ہے ۱۲۹۰ھ میں تالیف ہوا۔ نماز کے اسرار ہیں احکام و ادعیۂ نماز کا ذکر ہے۔ زاد الامیر فی دعوت البشیر النذیر میں جناب رسالت مآب کی ولادت باسعادت کا حال ہے اور اس کے تاریخی نام خیابان آفرینش سے ۱۳۰۵ھ نکلتے ہیں۔
مرآۃ الغیب پہلا عاشقانہ دیوان ہے جو اُن کی مضمون آفریں طبیعت کا اصلی نمونہ ہے صنمخانہ عشق ۱۳۱۳ھ میں دوسرا عاشقانہ دیوان مرتب ہوا۔ اس میں حضرت داغ کی بہت سی ہم طرح غزلوں کا جواب ہے جوہر انتخاب گوہر انتخاب میں مفردات اردو کا مجموعہ ہے۔ دیوان قصائد اردو صنم خانہ کے بعد طبع کی نوبت نہیں آئی۔ امیر اللغات کی تین جلدوں میں اردو زبان کے مبسوط اور مکمل لغت و محاورات ہیں جس کی دو جلدیں چھپ گئی ہیں یکتوبات امیر میں خاص خاص موقعوں پر اپنے ارشد تلامذہ سے روحانی معانقہ کیا ہے اور اکتساب علم و ادب میں اُن کی غائبانہ رہنمائی فرمائی ہے۔

فصیح الملک نواب مرزا خاں صاحب داغ

(۲۴)

پیدائش ۱۲۴۹ھ — وفات ۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ

فصیح الملک نواب مرزا خاں صاحب داغ دہلوی مرحوم نواب فخر الدولہ رستم جنگ نواب احمد بخش خاں صاحب مرحوم کے بڑے صاحبزادے نواب شمس الدین احمد خان صاحب برادر کلاں نواب ضیاء الدین احمد خاں صاحب نیر مرحوم جاگیر دار لوہارو کے بیٹے تھے۔ نواب احمد بخش خاں مرحوم کے والد بزرگوار عارف جان صاحب مرحوم مع اپنے بڑے بھائی قاسم جان صاحب مرحوم و عالم جان صاحب مرحوم کے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے نواب قاسم جان صاحب مرحوم نے شاہ عالم روشن اختر شاہ دہلی کی ملازمت اختیار کی اور حسن خدمات کے صلہ میں جاگیر اور نواب شرف الدولہ سہراب جنگ بہادر کا خطاب حاصل کیا۔ داغ مرحوم ۱۲۴۶ھ میں دہلی پیدا ہوئے اور تعلیم و تربیت سے فارغ ہو کر حضرت ذوق مرحوم کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا غدر ۱۸۵۷ء کے زمانہ تک دہلی میں قلعہ شاہی سے تعلق رہا غدر ۱۸۵۷ء کی قیامت آمیز شورش فرو ہونے کے بعد نواب یوسف علیخاں صاحب ناظم والی رامپور کی بروقت فیاضی اور قدر شناسی نے اہل کمال کو اپنے یہاں بلا کر فکر معاش سے آزاد کر دیا۔ چنانچہ حضرت داغ کو بھی نواب صاحب نے رامپور بلا لیا نواب ناظم کے بعد نواب کلب علی خاں نے توشہ خانہ کا مہتمم بنایا۔ فراش خانے اور اصطبل کی خدمت کے سوا اپنی مصاحبت کی عزت سے بھی سرفراز کیا اور یہاں تک عزت بخشی کہ اپنے ہمراہ حرمین شریف کی زیارت سے بھی مشرف کیا نواب کلب علی خاں کی آنکھ بند ہوتے ہی ریاست کے اندرونی او بیرونی انتظامات میں بہت کچھ ردو بدل ہوا اور سب سے پہلے

شعراء کے نام متوسلین ریاست کی فہرست سے خارج کیے گئے۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ جس کا منہ جدھر اٹھا چلا گیا۔ یہیں سے حضرتِ داغ بھی ۱۳۰۵ھ میں حیدرآباد دکن پہونچے اور کچھ عرصہ بعد حضور نظام دکن کے دربار میں حاضری کا موقع ملا۔ چار برس تک امیدواری کی اور اس عرصہ میں دو ایک مرتبہ دہلی بھی آئے۔ ۱۳۰۹ھ میں فرمانِ آصفی نافذ ہوا اور حضور نظام دکن نے مشورہ سخن کی عزت بھی بخشی۔ کہتے ہیں کہ حضور نظام دکن کے کلام کی درستی و اصلاح کا کام عجیب طور پر انجام پاتا تھا جو بار غزل لیکر آتا تھا اور حضرتِ داغ اُسے دیکھ کر اور ضروری اصلاح کے بعد واپس کرتے تھے لیکن حضور نظام دکن اس کو متواتر واپس کرتے تھے کہ یہ لفظ یا مصرعہ اچھا نہیں بدل دیا جائے یا اس شعر کو اس ڈھنگ سے لکھا جائے اس سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوتا تھا کہ غزل ہموار ہو جاتی تھی اور حضرتِ داغ اپنے وسیع النظر اور ممتاز شاگرد کی اصلاح میں غیر معمولی فکر سے کام لیتے تھے اسی طرح دریا دل و قدرشناس شاگرد بھی اپنے اُستاد کو توجہاتِ شاہانہ اور قابل رشک عزت و وقعت اور نازبرداری سے سرفراز کرتا تھا اسکے بعد یہاں تک قدردانی کی کہ جہاں اُستاد، ناظم یار جنگ۔ دبیر الدولہ نواب فصیح الملک کے معزز خطابوں سے ممتاز فرمایا۔ حضرتِ داغ بارہ سال کی عمر سے قلعۂ دہلی میں ولی عہد کی خدمت میں رہے اس کے بعد کم و بیش چالیس برس دربار رامپور میں باریاب رہے اور پھر حیدرآباد دکن محلہ محبوب گنج میں دربار دکن کے فرمان سے مقیم رہے۔ دربار دکن سے عطیاتِ شاہانہ کے علاوہ ایک ہزار روپیہ ماہانہ بطور تنخواہ ملتا تھا اور اسی قدر آپ کے اعزا اور متوسلین بھی پاتے تھے اسکے علاوہ ایک گاؤں بھی عطا ہوا تھا جو آخر وقت تک آپ کے قبضہ اور تصرف میں رہا اٹھارہ برس تک حضور نظام دکن نے جو کچھ بھی قدردانی کی

وہ اہلِ کمال کے لئے باعثِ رشک ہوئی۔

حضرتِ داغ کی زندگی میں اِن کے تین دیوان شائع ہو چکے تھے گلزارِ داغ آفتاب داغ۔ مہتاب داغ۔ پہلا دیوان اس وقت شائع ہوا تھا جب وہ رامپور میں مقیم تھے، آفتاب داغ میں کچھ غزلیں رامپور کے زمانہ کی ہیں کچھ اس کے بعد کی۔ مہتاب داغ حیدر آباد دکن میں شائع ہوا۔ آپ کی وفات کے بعد غیر مطبوعہ کلام کا مجموعہ یادگارِ داغ کے نام سے چھپا ہے۔ ان دیوانوں کے علاوہ ایک مختصر مثنوی فریادِ داغ بھی ہے جو ۸۵ صفحوں پر ختم ہوئی ہے جس کی زبان نہایت سلیس اور فصیح ہے بیان کا تسلسل قابلِ تعریف ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی سے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ فریادِ داغ میں سلاستِ زبان اور روانیٔ کلام کی وہی حدیں کھنچی ہوئی ہیں جو داغ مرحوم کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے۔ حضرتِ داغ نے اکثر تاریخی مادّے جو خاص مواقع پر فی البدیہہ کہے ہیں بہت مشہور ہیں۔ حضرتِ داغ کی زبان کی بابت زیادہ لکھنا تحصیلِ حاصل ہے جو سادگی اور صفائی اردو میں اُنہوں نے پیدا کی ہے وہ اُنھیں کا حصہ ہے فصیح الفاظ۔ عام فہم ترکیبیں۔ برجستہ محاورے۔ سلجھی ہوئی بندشیں۔ روزمرہ کی صفائی اور اسکے ساتھ سوز و گداز اِن تمام اعتبار سے ان کا طرزِ بیان بے نظیر ہے اور ان کا تمام کلام زبان کے محاسن سے لبریز ہے۔ زبان کی طرح حضرتِ داغ نے حسبِ ضرورت تشبیہات و استعارات سے جہاں کام لیا ہے وہاں میانہ روی کو بھی مدِنظر رکھا ہے اکثر غزلیں ناسخ۔ آتش۔ ذوق۔ غالب کی زمینوں میں بھی کہی ہیں اِن زمینوں میں حضرتِ داغ نے اپنا جداگانہ رنگ قائم کر کے کامیابی حاصل کی ہے۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ حضرتِ داغ اپنے رنگ کے موجد تھے ان کی دیکھا دیکھی اکثر شعراء نے ان کی تقلید کی لیکن نقل میں اصل کا رنگ کہاں،

متقدمین میں جرأت کا رنگ حضرتِ داغ سے ملتا ہوا ہے لیکن حضرتِ داغ جس منزل پر پہونچے ہیں جرأت کو وہاں کی ہوا بھی نہیں لگی اور محاسن کے ماسوا سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُن کے جذبات بالکل نیچرل ہیں اور اسی وجہ سے ان کا کلام تاثیر سے دست و گریبان ہے۔ کلام کی شوخی۔ طرزِ بیان کی جدّت۔ خیالات کی برجستگی یہ تمام باتیں حضرتِ داغ کے کلام میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ باہمی رمز و کنائے۔ محاورے روزمرہ اور شعراء کے کلام میں بھی موجود ہیں۔ لیکن حضرتِ داغ نے ان پر جدّت کا ایسا رنگ چڑھایا ہے کہ گویا یہ اُنھیں کا خاص ایجاد ہے۔ حضرتِ داغ کے شاگردوں کا بہت وسیع دائرہ ہے اور کوئی شہر ایسا نہیں جہاں آپ کا نام لیوا نہ موجود ہو۔

آخر ۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۷ فروری ۱۹۰۵ء کو اس دارِ فانی سے عالم البقا کی طرف رحلت کی اور اپنے اقربا کو داغِ مفارقت دیا۔

———— ※ ————

خان بہادر سید اکبر حسین صاحب اکبرؔ رضوی

پیدائش نومبر ۱۸۴۶ء (۲۵) وفات اکتوبر ۱۹۲۱ء

آپ نومبر ۱۸۴۶ء میں بارہ ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے اور علوم مشرقی فارسی و عربی کی تعلیم پاکر علوم مغربی کی طرف توجہ کی ۱۸۶۷ء میں وکالت کا امتحان دیا اور اول درجہ کی ڈگری حاصل کی ۱۸۶۹ء میں نائب تحصیلداری پر تقرر ہوا ۱۸۷۰ء میں الہ آباد ہائی کورٹ کے مثل خواں ہوئے اور کچھ دنوں بعد وکالت شروع کی ۱۸۸۰ء تک وکالت کا مشغلہ جاری رہا ۱۸۸۰ء میں دوبارہ سرکاری ملازمت حاصل کی اور منصف ہوگئے اور منصفی سے درجہ بدرجہ ترقی پاکر ۱۸۸۸ء میں سب ججی حاصل کی ۱۸۹۴ء میں جج عدالت خفیفہ درجہ اول ہوئے اور پھر سشن جج ہوگئے۔ کئی سال تک بارہ سو روپے ماہوار پاتے رہے ۱۸۹۸ء میں گورنمنٹ نے جوڈیشل سروس کے صلہ میں خان بہادر کا خطاب عطا کیا ۱۹۰۳ء میں اپنے متنقل عہدۂ ججی الہ آباد سے نہایت نیک نامی کے ساتھ سبکدوش ہوکر پنشن لے لی اور الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو ہوگئے۔

منشی غلام حسین صاحب وحید شاگرد رشید حضرت خواجہ آتش سے شرف تلمذ حاصل کیا اور مغربی خیالات کو مشرقی لباس پہنا کر ایشیائی رنگ میں رنگنا آپ کی فطرت میں داخل تھا۔ نئی روشنی والوں کو انگریزی معاشرت اور تمدن سے متنفر اختیار کرنے کا جو پہلو آپ نے اپنی تصانیف میں اختیار کیا وہ اظہرمن الشمس ہے۔

سامعین کے قلوب آپ کے ظریفانہ نصائح سے بہت جلد اثر پذیر ہوتے ہیں آپ نے اپنی پیرایۂ تمثیلات سے قلوب پر ایسا فوری اثر ڈالا جس کی نظیر محال کیا معنی قطعی ناممکن ہے۔

مغربی مشاہیر کے کلام کا اُردو ترجمہ اس خوش اسلوبی سے نظم کیا ہے کہ سبحان اللہ حسن و عشق کے مضامین آپ کے کلام میں بہت کم پائے جاتے ہیں البتہ تصوف اور صحیح جذبات کے جواہرات سے پُر ہے۔ آپ کی شاعری نے ثابت کر دیا کہ ایک خوش گو شاعر کے لئے ہجر و وصل، گُل و بلبل وغیرہ کی کہانی مایۂ ناز نہیں۔ بلکہ وہ اپنی سچی اور درد انگیز نوا سنجی سے جذبات عالیہ کو جس پیرایہ میں نظم کر سکتا ہے اور اس سے سننے والوں پر جو وجد کی حالت طاری ہوگی اُس کا قلمبند کرنا ناممکن ہے۔ اساتذۂ متقدمین و متاخرین سے علیحدہ ہو کر جو ایک جدید مسلک آپ نے اختیار کیا ہے اُس کی مثال صرف اُنھیں کے کلام میں ملتی ہے آپکی وسیع النظری بلند پروازی اور قادر الکلامی نے سامعین کے دلوں پر مقبولیت کا ایسا سکہ جمایا ہے جو کسی طرح زائل نہیں ہوتا۔ پولٹیکل اور سوشل معاملات میں جو کچھ کہا ہے وہ قوم و ملک کے لئے ایک دستور العمل ہے ظرافت آمیز پیرایہ میں فلسفیانہ نکات حل کر دینا یا کوئی سبق آموز نتیجہ نکالنا تو آپ کی فطرتی طبیعت کا خاصہ ہے مگر سنجیدہ و متین طرز تغزل جو ہمہ تن حکمت و اخلاق پر مبنی ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے دیوان اُٹھا کر تغزل کی شان دیکھی جائے تو ہر لفظ دفتر ہدایت نظر آتا ہے ظریفانہ کلام کی بابت یہ کہہ دینا کافی ہے کہ اس خاص رنگ سے تو سارا ہندوستان آپ کا زیر اثر ہے۔ ہندوستان ہی نہیں بلکہ اُردو دنیا میں اکبر الہ آبادی حضرت کی طرف سے غیر معمولی دل و دماغ اور نہایت حیرت انگیز اندازِ بیان لے کر آئے تھے، جس نے شیخ سعدیؒ و حکیم سنائی کو نہ دیکھا ہو وہ اکبرؔ کو دیکھے۔ آپ کے تین دیوان شائع ہو چکے ہیں چوتھا مرتب ہو رہا تھا کہ آپ نے قوم کو داغ مفارقت دیا اور اکتوبر ۱۹۲۱ء کو اس دارِ ناپائیدار سے رحلت کر کے ملکِ بقا میں سکونت اختیار کی اور تربت پاک الہ آباد میں ہے۔

پنڈت برج نراین صاحب چکبست

پیدائش ۱۸۸۲ء (۲۶) وفات ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء

پنڈت برج نراین صاحب چکبست ۱۸۸۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے اور عالم طفلی میں لکھنؤ آکر ابتدائی تعلیم شروع کی تحصیل علم سے فارغ ہو کر علم مغربی کو باقاعدہ سیکھا ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور پھر قانون کا امتحان پاس کر کے وکالت شروع کی۔ آپ نے نیچرل شاعری کی طرف پوری پوری توجہ کی آپ کی تصنیفات نے نیچرل شاعری کو جو تقویت پہونچائی ہے اس کا اعتراف اُن لوگوں کو بھی ہے جو آپ کو اس عزت کا مستحق نہیں سمجھتے جو انھیں ملک و قوم نے بخشی ہے۔ مختلف موضوع پر آپ کی متعدد تصانیف سے علمی عظمت کی کفالت ہوتی ہے جس سے وسیع المعلومات اور بلند فکر ہونے کا بہت کچھ ثبوت ملتا ہے۔ سولہ سترہ برس کی عمر سے شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا آپ نے عامیانہ تغزل کے میدان کو چھوڑ کر نیچرل شاعری کے میدان میں تازگی خیالات شاعرانہ لطافت اور قومی جذبات کے ایسے جوہر دکھائے ہیں جو آج تک دل پر نقش ہیں قدرتی مناظر کو اکثر جگہ اس صفائی سے دکھایا ہے کہ سبحان اللہ آپ کے کلام میں حضرت آتش مرحوم کی جھلک نظر آتی ہے اور مسدس میں حضرت انیس کا تتبع ہے۔

۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو آپ ایک مقدمہ کی پیروی کے لئے رائے بریلی گئے تھے کہ یکایک فالج میں مبتلا ہوئے اور زبان بند ہو گئی ۸ بجے شام کو رائے بریلی کے اسٹیشن ہی پہ انتقال ہوا۔ آپ کی لاش لکھنؤ لائی گئی اور آپ کے اقربا نے سب آخری مراسم

ادا کئے۔ گو آپ ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکے ہیں مگر آپ کی تصانیف آپ کی یاد کو ہر وقت تازہ رکھتی ہیں، ایک مجموعہ صبحِ وطن کے نام سے اس وقت ہمارے پیش نظر ہے جو ادبی دُنیا میں آپ کی زندہ یادگار سمجھا جاتا ہے۔ فنِ ڈرامانویسی میں بھی آپ کافی مہارت رکھتے تھے چنانچہ ایک مکمل ڈراما تحریر فرمایا ہے جس نے اہلِ کمال سے کافی خراجِ تحسین حاصل کیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی کئی اور تصنیفیں بھی پبلک سے مقبولیت کا سرٹیفکیٹ حاصل کر چکی ہیں۔



ڈاکٹر سر محمد اقبال۔ ایم اے۔ پی ایچ ڈی

(۲۷)

آپ ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے۔ قدیمی وطن سیالکوٹ ہے شمس العلماء مولوی سید میر حسن صاحب سے علوم مشرقی فارسی و عربی کی کامل تعلیم پائی علم ادب سے طبیعت میں مناسبت قدرتی طور پر موجود تھی۔ اس لئے مولوی صاحب موصوف کی تعلیم سونے پر سہاگہ ہوگئی چونکہ طبیعت میں شعر و سخن کا فطرتی مذاق موجود تھا اسلئے آپ نے طالب علمی کے زمانہ ہی میں سیالکوٹ کے مشاعروں میں مشارکت شروع کی اور حضرت داغ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ سیالکوٹ کالج میں ایف اے کلاس تک تعلیم پائی اور لاہور کالج سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ سر ٹامس آرنلڈ صاحب سے علم فلسفہ سیکھا اتفاق سے سر ٹامس آرنلڈ انگلستان چلے گئے۔ ۱۹۰۵ء میں شفیق استاد نے آپ کو انگلستان بلایا اور جس مذاق کی بنیاد مولوی سید میر حسن نے ڈالی تھی اور جسے درمیان میں حضرت داغ کے غائبانہ تعارف نے بڑھایا تھا اس کے آخری مرحلے سر ٹامس ارنلڈ کی شفیقانہ رہبری سے طے ہوئے۔ کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر میگ ٹیگرف براؤن نکلس اور سارلی کے مفید لیکچروں سے آپ نے حیرت انگیز ترقی حاصل کی۔ پروفیسر نکلس نے آپ کی مشہور فارسی نظم اسرار بیخودی کا انگریزی ترجمہ کرکے اور اس پر دیباچہ و حواشی لکھ کر یورپ اور امریکہ کو آپ سے روشناس کیا کیمبرج یونیورسٹی سے فارغ ہو کر آپ جرمنی گئے اور علمی دنیا کے اعلیٰ مدارج طے کرکے واپس آئے۔ آپ نے زمانہ قیام یورپ میں بہت سی فارسی کتابوں کا مطالعہ کیا اور اس مطالعہ کا خلاصہ ایک محققانہ کتاب کی

صورت میں شائع کیا۔ اس کتاب کو دیکھ کر اہلِ جرمن نے آپ کو "ڈاکٹر" کا علمی درجہ دیا اور گورنمنٹ برطانیہ نے ازراہِ قدردانی "سر" کا ممتاز خطاب عطا کیا۔ اپریل ۱۹۰۱ء میں آپ کی نظم ہمالیہ مخزن میں شائع ہوئی جس سے آپ کی اردو شاعری کا آغاز ہوا۔ ۱۹۰۵ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک آپ کی شاعری کا ایک دوسرا دور شروع ہوا (یہ وہ زمانہ ہے جو آپ نے یورپ میں بسر کیا) یعنی آپ کی شاعری نے فارسی زبان کو اردو زبان کی جگہ اپنا ذریعہ اظہارِ خیال بنا لیا۔

فارسی میں آپ کے قلم سے تین کتابیں اس وقت تک نکلی ہیں "اسرارِ بیخودی"، "رموزِ بیخودی" اور "پیامِ مشرق"، جو لوگ آپ کے اردو کلام کے دلدادہ ہیں وہ ان کتابوں کو فارسی زبان میں دیکھ کر بہت مایوس ہوئے ہونگے۔ مگر اطفیس یاد رکھنا چاہیئے کہ فارسی نے وہ کام کیا ہے جو اردو سے ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ کا مجموعہ بانگ درا کے نام سے ستمبر ۱۹۲۴ء میں تین ہزار کی تعداد میں شائع ہوا۔ بانگِ درا تین حصوں میں منقسم ہے حصہ اول میں ۱۹۰۵ء تک کی نظمیں موجود ہیں حصہ دوم میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کی اور حصہ سویم میں ۱۹۰۸ء سے لیکر آج تک کا اردو کلام ہے۔ یہ دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں آج تک کوئی ایسا مجموعہ نہیں شائع ہوا جس میں خیالات کی فراوانی مطالب و معانی کی سچی تصویر۔ تجربے و مشاہدے کا نچوڑ اور سیر و سیاحت کا نتیجہ ہو۔

اس وقت تک آپ کی عمر ۶۲ سال کے لگ بھگ ہے اور آپ کو لیجسلیٹو کونسل صوبہ پنجاب کی ممبری کا بھی فخر حاصل ہے۔ گو آپ حضرتِ داغ مرحوم کے شاگردِ رشید ہیں

مگر آپ کا مذاقِ سخن حضرت غالب مرحوم کا رنگ قبول کرتا ہے۔ فارسی میں حافظ شیرازیؒ کے رنگ میں اکثر غزلیں کہی ہیں جن کے دیکھنے اور سمجھنے سے آپ کی خداداد ذہانت اور عروج فکر کا پتہ چلتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے صحیح جذبات اور دلکش نظموں کی داد کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔

"اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ"



حافظ جلیل حسن صاحب جلیل مانکپوری

(۲۸)

حافظ سید جلیل حسن صاحب جلیل مانک پوری وہ خوش نصیب اور صاحب کمال شاعر ہیں جن کو حضرت امیر مینائی کے فیضان صحبت اور تلمذ نے نہ صرف ادبی دنیا میں مشہور کیا بلکہ دنیوی فکر سے بھی فارغ البال کر دیا آپ امیر مرحوم کے ارشد تلامذہ سے ہیں۔ امیر اللغات کی ترتیب میں آپنے وقت صرف کیا اور حضرت امیر مرحوم کا بہت کچھ ہاتھ بٹایا۔ جمادی الآخر ۱۳۱۸ھ کو آپ حضرت امیر مینائی کے ہمراہ حیدرآباد دکن پہونچے اور ۱۳۲۴ھ میں وزارت پناہ کے شریک سفر رہے اار ربیع الثانی ۱۳۲۹ھ کو چند احباب کے اصرار سے آپ نے ایک رسالہ تذکیر تانیث شائع کیا جس میں سات ہزار الفاظ کی تذکیر و تانیث بہت واضح طور پر بتائی ہے یہ رسالہ آپکی محققانہ معلومات کا بیش بہا ذخیرہ ہے ۱۳۳۶ھ میں میر محبوب علیخاں صاحب مرحوم سابق تاجدار دکن نے پانچسو روپیے ماہوار وظیفہ عطا فرمایا اور اپنی استادی کا بھی شرف بخشا اور حضرت داغ مرحوم کی جگہ پر مامور کیا اور جلیل القدر کے معزز خطاب سے سرفراز کیا یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب شاد نے بھی ایکسو روپے ماہوار کا استمراری وظیفہ عطا کیا ۱۳۲۸ھ میں آپکا دیوان "تاج سخن" شائع ہوا۔ اسکے بعد دوسرا دیوان بھی شائع ہوا جو خاص خاص احباب میں تقسیم کیا گیا۔ آپ کا کلام زیادہ تر حضرت امیر مینائی کے رنگ میں رنگا ہوتا ہی۔ اسی وجہ سے آپ کو جانشینی کا مرتبہ حاصل ہوا۔ زبان کے لحاظ سے آپکے دونوں دیوان اردو لٹریچر کا بہترین کارنامہ ہیں۔ آپ کی زبان فصیح جملوں کی ترکیب سلجھی ہوئی۔ استعارے قریب الفہم تلمیحات مانوس۔ غرض جو صفات کسی شعر کو ذوق سلیم کے لئے پرلطف بنادیتے ہیں وہ آپکے کلام میں موجود ہیں اور یہ سب خوبیاں حضرت امیر مینائی کی بافیض صحبت کا نتیجہ ہیں۔

مولنا سید فضل الحسن صاحب حسرت موہانی بی اے

(۲۹)

فدائے قوم مولنا سید فضل الحسن صاحب حسرت موہانی سے اہل زمانہ بخوبی واقف ہیں آپ کا مولد وطن قصبہ موہان ایک مردم خیز اور مشہور قصبہ ہے۔ آپنے بی اے محمڈن کالج علی گڑھ سے پاس کیا طالب علمی کے ہی زمانہ سے آپکو قوم و ملک کے ساتھ قلبی محبت ہے جس کا اظہار اسوقت تک [illegible] کئی بار آپنے قومی فلاح و بہبودی کیوجہ سے شدید مصائب برداشت کئے لیکن ضمیر اور کانشنس کے خلاف کبھی کوئی کمزوری ظاہر نہیں کی بہت کم ایسی ہستیاں ہیں جنہوں نے پختگی کے ساتھ اپنے قول و فعل کو ایک کر دکھایا ہو۔ آپ منشی امیر اللہ صاحب تسلیم کے شاگرد رشید ہیں، آپ کے کلام میں حضرت مومن کی جھلک نظر آتی ہے جو شعر سوز و گداز میں ڈوب کر کہا ہے اُس کا [illegible] دل [illegible] ہوتا ہے ۱۸۹۲ء سے ۱۹۰۲ء تک یعنی زمانہ طالب علمی موہان فتحپور و علی گڑھ کا کلام جس میں غزلوں کے علاوہ قصائد مثنویاں اور بہت سی انگریزی نظموں کے ترجمے ہیں آپکے پاس محفوظ ہیں آپنے اردوئے معلی کے اجرا سے جو مسلسل ادبی خدمت انجام دی ہے وہ قابل صد ستائش ہے۔ فروری ۱۹۱۴ء میں آپکی کل مختصر غزلیات کا پہلا مجموعہ شائع ہوا ہے جو ادبی رسائل میں شائع ہو کر بہت کچھ خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔ اسکے بعد کئی حصے اور بھی شائع ہوئے ہیں جو پاکیزہ خیالات، صحیح جذبات، واردات قلبی، تخیل کی بلند پروازی اور علم ادب کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ دیوان غالب کی شرح خوب لکھی ہے اور اس کا مقدمہ دیکھنے کے قابل ہے۔ اخبار "مستقل" کانپور جو اسوقت آپکی ادارت میں نکل رہا ہے اسکے قومی و ملکی کارنامے اظہر من الشمس ہیں۔ مولنا حسرت نے فلسفہ محبت کے رموز پر جہاں قلم اٹھایا ہے وہاں زیادہ تر بہت بلند جذبات کا اظہار کیا ہے اور قدرت نے آپکو ایسا درد مند دل عطا کیا ہے جو فی زمانہ قابل رشک ہے۔

یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب شادؔ

(۳۰)

یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب شادؔ جی سی آئی ای، ریاست حیدر آباد دکن کے سابق وزیر اعظم ہیں۔ عہدۂ وزارت کے بعد کچھ عرصہ تک پیشکار رہے۔ سنہ ۱۸۶۴ء میں آپ جلوہ افروز دکن ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر ۶۸ سال کے لگ بھگ ہے۔ آپ نے عہد وزارت میں وہ کام انجام دیئے ہیں جن کی مثال محال کیا معنی ناممکن ہے۔ آپ کا لٹریری مذاق نہایت ستھرا اور متین ہے۔ اردو فارسی کے علاوہ انگریزی و عربی پر پوری پوری دستگاہ ہے۔ آپ کی کئی نادر و اعلیٰ تصانیف شائع ہو چکی ہیں، آپ کا کلام حسن تخیل، سلاستِ زبان، خوبیٔ محاورات، بندشِ الفاظ، لوازمِ ترکیب، غرض تمام محاسنِ لفظی و معنوی کا اعلیٰ نمونہ ہوتا ہے۔ آپکا بیشتر کلام رنگِ تصوف میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ جس سے پورا پورا اخلاقی سبق حاصل ہوتا ہے۔ آپ نثر بھی خوب لکھتے ہیں، فنِ ناول نویسی میں بھی آپ کو کافی مہارت ہے۔ چنانچہ فسانۂ خورشید اکے نام سے ایک ناول شائع ہو چکا ہے۔ پنجاب میں آپ نے رفاہ عام کے لئے بہت کچھ مالی امداد فرمائی اور جا بجا ہندو و مسلمانوں کو برابر تقسیم زر و دولت سے سرفراز فرمایا۔ سچ یہ ہے کہ دنیا میں اس وضع اور خیال کے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔

—— ※ ——

تعارف

مندرجۂ ذیل حضرات کے حالاتِ زندگی باوجود سعی حاصل نہ ہو سکے اس لئے مؤلف نے بطورِ تعارف مختصراً اُن کے اوصافِ حمیدہ لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔

مولانا ابوالکلام صاحب آزاد دہلوی کا نام ادبی دنیا میں تعارف کا محتاج نہیں، جس نے اخبار الہلال کی زیارت کی ہوگی وہ آپ کے زورِ قلم، ادبی خدمات اور قومی جذبات کا اندازہ کر سکتا ہے۔
منشی رشید احمد صاحب رشد تھانوی آج کل بھوپال میں مقیم ہیں طبیعت میں شوخی اور مزاج میں رنگینی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے نظم میں بلند پردازی در نزاکت سے کام لیتے ہیں، نثر میں ایک خاص رعنائی ہوتی ہے۔
ظفر الملک مولوی ابو الحق علی صاحب کاکوروی لکھنؤ کے مشہور ادبی رسالہ "الناظر" کے قابل اڈیٹر ہیں آپکی انگریزی قابلیت نہایت اعلیٰ ہے، تصوف کی جانب میلان زیادہ ہے، نہایت منکسر المزاج اور فرشتہ خصلت انسان ہیں آپنے اردو زبان کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کردی ہے اور ہروقت انھیں خیالات میں مستغرق رہتے ہیں، اخبار "مشیر بہار پٹنہ" بھی آپ کی اڈیٹری کا فخر حاصل کر چکا ہے۔
شاہ نظام الدین صاحب دلگیر آگرہ، کٹرہ میوہ میں رہتے ہیں آپ ایک معزز خاندان کے چشم چراغ ہیں ادبی خدمات میں ہروقت منہمک رہتے ہیں رسالہ "نقاد" کو آپ کی ادارت کا فخر حاصل ہے اور جنوری ۱۹۱۳ء سے جنوری ۱۹۲۰ء تک "نقاد" کے اجراء سے جو ادبی خدمت آپ نے کی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔
لسان الملک سید ریاض احمد صاحب ریاض خیرآبادی حضرت امیر مینائی مرحوم کے بہترین شاگرد ہیں آپ حضرت داغ مرحوم کا تتبع کرتے ہیں آپ کا اندازِ بیان بہت دلفریب ہے، نثر میں خاص رعنائی ہے۔

منشی سلطان احمد صاحب خان بہادر قاضی عزیز الدین احمد صاحب ڈپٹی کلکٹر کے عزیز ہیں نثر خوب لکھتے ہیں اور ہر وقت زبان اردو کی خدمت کے لئے کمر بستہ رہتے ہیں آپکا انداز تحریر خلاقی مذاق لئے ہوئے ہوتا ہے

مولنا سید علی حیدر صاحب نظم طباطبائی لکھنوی پروفیسر عربی نظامیہ کالج حیدر آباد دکن بہت عالی خیال اور بلند پرواز اور مسلم الثبوت استاد ہیں آپ کی معنی آفرینی اور سخن سنجی اور زبان مستند ہے آپ اسوقت مغتنمات زمانہ سے ہیں تبحر علمی کے اعتبار سے آپ کا پایہ نہایت بلند اور ارفع ہے۔

سحر البیان مولوی شیخ احمد علی صاحب شوق مرحوم ملحقات لکھنؤ کے باشندے تھے، عربی و فارسی کی تکمیل کے بعد آپ نے فن سخن کی پوری پوری تعلیم پائی تھی، علم مغربی سے بھی واقفیت رکھتے تھے فن عروض کے ماہر تھے، مظفر علی صاحب اسیر لکھنوی کے بہترین شاگردوں میں سے تھے، ایک عرصہ تک اخبار آزاد لکھنؤ کے ایڈیٹر رہے۔ لکھنؤ سے بھوپال آئے اور نائب ناظم مقرر ہوگئے، ۳۵ سال بعد اس خدمت سے سبکدوش ہوئے اور پنشن لیکر رامپور چلے گئے، یہاں تالیف امیر اللغات کی خدمت آپ کے سپرد ہوگئی اور کئی سال اس خدمت کو انجام دیا، رامپور سے اناؤ چلے گئے اور تا زیست اپنی بیٹی کے پاس رہے۔ کئی دلگداز مثنویاں آپ کی یادگار ہیں، جو قدرت آپکو نظم میں حاصل تھی وہی نثر میں تھی۔ آپ نے اپنے کمال کی بدولت لافانی عظمت اور دیرپا شہرت کے وہ مدارج طے کئے ہیں جو فی زمانہ اردو شعراء میں بہت کم ان کے مقابلہ میں آسکتے ہیں۔



Printed at
The Agra Akhbar Press,
Agra,

